6637

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

کتاب مستطاب

سِیرۃ النبیؐ

یعنی

سوانحِ اقدس حضرت سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حصۂ اوّل

مجلّدِ دوم۔ از ۹ھ تا ۱۱ھ حنین، اقامتِ امن، تاسیسِ خلافت، اشاعتِ اسلام، انتظاماتِ مذہبی، تکمیلِ شریعت، حجۃ الوداع، وفات، شمائل، اخلاق و عادات کی تفصیل اور ازواج و اولاد کا مختصر تذکرہ،

تالیف

حجۃ الملۃ والدین علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

المتوفی ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ

مع اضافہ و تکملہ

از

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۴ ربیع الاوّل

سنہ ۱۳۷۳ھ

ذخیرہ

باہتمام: مولوی مسعود علی صاحب ندوی

در مطبع معارف شہر اعظم گڈھ مطبوع گردید

طبع پنجم

۱۳۷۵ھ

اقبال

139124

فہرست مضامین

سیرۃ النبی حصہ دوم

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
اسلام کی امن کی زندگی		نجران	۳۱	حمیر وغیرہ کی سفارت	۵۵
		بحرین	۳۲	**تاسیس حکومت الٰہی**	۵۶
۱ - ۱۴۹		عمان	۳۴	اسلامی حکومت کی غرض وغایت	۵۷
قیام امن	۱	حدود شام	"	انتظام ملکی	۵۹
عرب کی عام بدامنی	"	**وفود عرب**	۳۶	امیر العسکری	۶۰
بیرونی خطرات	۵	مزینہ	۳۷	افتاء	۶۱
یہودیوں کی قوت	"	بنو تمیم	"	فصل قضایا	۶۲
ان کے انسداد کی تدابیر	۹	بنو سعد	۴۰	توقیعات و فرامین	"
اشاعت اسلام	۱۲	اشعر	۴۱	مہمانداری	"
مکہ میں اشاعت اسلام	"	دوس (سنہ [illegible])	۴۲	عیادت مرضی	۶۳
اوس وخزرج کا اسلام	۱۷	بنو حارث بن کعب	"	احتساب	۶۴
مدینہ میں اشاعت اسلام	"	طے	۴۳	اصلاح بین الناس	۶۵
بدر کے بعض قریشیوں کا اسلام	"	عدی بن حاتم	"	کتّاب	۶۶
مزینہ کا اسلام	۱۹	ثقیف	۴۴	حکام اور ولاۃ	۶۸
اشجع کا اسلام	"	نجران	۴۹	حکام کا امتحان	۷۱
جہینہ کا اسلام	"	بنو اسد	۵۱	محصلین زکوۃ وجزیہ	۷۳
دعاۃ کا تقرر	۲۳	بنو فزارہ	۵۲	قضاۃ	۷۷
دعاۃ کے نام	۲۵	کندہ (سنہ [illegible])	"	پولیس	۷۸
مقامات دعوت	"	عبد القیس	"	جلاد	"
یمن	۲۸	بنو عامر بن صعصعہ	۵۴	غیر قوموں سے معاہدے	"

Marfat.com

مضمون	صفحہ
اصنافِ محاصل و مخارج	۸۰
جاگیریں اور افتادہ زمینوں کی آبادی	۸۳
مذہبی انتظامات	۸۶
وعاۃ اور معلمین اسلام	"
ان کی تعلیم و تربیت	۸۷
مساجد کی تعمیر	۹۱
ائمۂ نماز کا تقرر	۹۶
موذنین	۹۹
تاسیس و تکمیل شریعت	۱۰۰
اسلام کے اکثر فرائض بتدریج تکمیل کو پہنچے ہیں	۱۰۱
عقائد اور اسلام کے اصول اولین	۱۰۳
عقائد	"
عبادات	۱۰۷
طہارت	"
تیمم	۱۰۹
نماز	۱۱۰
نماز جمعہ اور عیدین	۱۱۵
صلوٰۃ خوف	۱۱۷
روزہ	۱۱۸
زکوٰۃ	۱۲۱
حج	۱۲۳
حج کے اصلاحات	۱۲۴

مضمون	صفحہ
معاملات	۱۲۸
وراثت	"
وصیت	۱۳۱
وقف	۔
نکاح و طلاق	۱۳۲
حدود و تعزیرات	۱۳۳
حلال و حرام	۱۳۹
ماکولات میں حلال و حرام	"
شراب کی حرمت	۱۴۲
سود کی حرمت	۱۴۷
سنہ ۱۰ھ	
سال تحریر، حجۃ الوداع	
اختتام فرض نبوت	
۱۵۰ - ۱۶۹	
حجۃ الوداع	۱۵۱
خطبۂ نبوی اور اصول شریعت کا اعلان عام	۱۵۵
سنہ ۱۱ھ	
وفات	
۱۷۰ - ۱۸۶	
علالت کی ابتداء	۱۷۳
قرطاس کا واقعہ	۱۷۴
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ	۱۷۷
وفات	۱۸۳

مضمون	صفحہ
تجہیز و تکفین	۱۸۳
متروکات	
۱۸۷ - ۱۹۷	
زمین	۱۸۸
جانور	۱۸۹
اسلحہ	۱۹۱
آثار متبرکہ	۱۹۲
مسکنِ مبارک	۱۹۳
دایہ	۱۹۵
خدام خاص	۱۹۶
شمائل	
۱۹۸ - ۲۱۱	
حلیۂ اقدس	۱۹۸
مہر نبوت	۱۹۹
موئے مبارک	۲۰۰
رفتار	"
گفتگو	"
خندہ و تبسم	۲۰۱
لباس	"
انگوٹھی	۲۰۳
خود و زرہ	
غذا اور طریقۂ طعام	۔
معمولات طعام	۲۰۴
خوش لباسی	۲۰۵

Marfat.com

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
مرغوب رنگ	۲۰۶	عورتوں کیلیے مخصوص مجلس	۲۳۰	اخلاق نبوی کا جامع بیان	۲۸۹
نامرغوب رنگ	〃	طریقۂ ارشاد	۲۳۱	مداومت عمل	۲۹۱
خوشبو کا استعمال	〃	مجالس میں شگفتہ مزاجی	۲۳۲	حسن خلق	۲۹۳
نظافت پسندی	۲۰۷	فیض صحبت	۲۳۴	حسن معاملہ	۳۰۱
سواری کا شوق	۲۱۰	**خطابت نبوی**		عدل و انصاف	۳۰۴
اسپ دوانی	〃	**۲۳۵ - ۲۵۰**		جود و سخا	۳۰۸
معمولات		طرز بیان	۲۳۵	ایثار	۳۱۲
۲۱۲ - ۲۲۴		خطبات کی نوعیت	۲۳۷	مہمان نوازی	۳۱۴
صبح سے شام تک کے معمولات	۲۱۲	اثر انگیزی	۲۴۷	گداگری اور سوال سے نفرت	۳۱۶
خواب	۲۱۳	**عبادات نبوی**		صدقہ سے پرہیز	۳۱۸
عبادت شبانہ	۲۱۴	**۲۵۱ - ۲۸۶**		تحفے قبول کرنا	۳۱۹
معمولات نماز	۲۱۵	دعا اور نماز	۲۵۱	تحفے دینا	۳۲۰
معمولات خطبہ	۲۱۷	روزہ	۲۵۷	عدم قبول احسان	۳۲۱
معمولات سفر	۲۱۸	زکوٰۃ	۲۵۹	عدم تشدد	〃
معمولات جہاد	۲۲۰	حج	۲۶۰	تقشف ناپسند تھا	۳۲۲
معمولات عیادت وعزا	۲۲۱	دوام ذکر الٰہی	۲۶۱	عیب جوئی اور مداحی کی ناپسندیدگی	۳۲۴
معمولات ملاقات	۲۲۲	ذوق و شوق	۲۶۲	سادگی اور بے تکلفی	۳۲۶
معمولات عامہ	۲۲۴	میدان جنگ میں یاد الٰہی	۲۶۴	امارت پسندی سے اجتناب	〃
مجالس نبوی		خشیت الٰہی	۲۶۷	مساوات	۳۳۰
۲۲۵ - ۲۳۴		گریہ و بکا	۲۶۹	تواضع	[illegible]
دربار نبوت	۲۲۵	محبت الٰہی	۲۷۱	تعظیم اور بیجا مدح کی ناپسندیدگی	۳۳۸
مجالس ارشاد	۲۲۷	توکل علی اللہ	۲۷۴	شرم و حیا	۳۴۰
آداب مجلس	〃	صبر و شکر	۲۷۹	اپنے ہاتھ سے کام کرنا	۳۴۱
اوقات مجلس	۲۲۹	**اخلاق نبوی**		دوسروں کے کام کر دینا	۳۴۳
		۲۸۷ - ۴۰۱			

Marfat.com

مضمون	صفحہ
عزم و استقلال	۳۴۴
شجاعت	۳۴۶
راست گفتاری	۳۴۸
ایفائے عہد	۳۴۹
زہد و قناعت	۳۵۱
عفو و حلم	۳۵۵
دشمنوں سے عفو و درگذر اور حسن سلوک	۳۶۱
کفار اور مشرکین کیساتھ برتاؤ	۳۶۶
یہود و نصاریٰ کیساتھ برتاؤ	۳۷۰
غریبوں کیساتھ محبت و شفقت	۳۷۱
دشمنان جان سے عفو و درگذر	۳۷۷
دشمنوں کے حق میں دعائے خیر	۳۷۸
بچوں پر شفقت	۳۸۱
غلاموں پر شفقت	۳۸۳
مستورات کے ساتھ برتاؤ	۳۸۸
حیوانات پر رحم	۳۹۰
رحمت و محبت عام	۳۹۱
رقیق القلبی	۳۹۳

مضمون	صفحہ
عیادت و تعزیت	۳۹۴
لطف طبع	۳۹۷
اولاد سے محبت	۳۹۸
ازواج مطہرات ۴۰۲ - ۴۲۱	
حضرت خدیجہؓ	۴۰۲
حضرت سودہؓ	۴۰۴
حضرت عائشہؓ	۴۰۶
حضرت حفصہؓ	۴۰۹
زینبؓ ام المساکین	۴۱۰
حضرت ام سلمہؓ	”
حضرت زینبؓ	۴۱۵
حضرت جویریہؓ	۴۱۶
حضرت ام حبیبہؓ	۴۱۷
حضرت میمونہؓ	۴۱۹
حضرت صفیہؓ	۴۲۰
اولاد ۴۲۲ - ۴۳۱	

مضمون	صفحہ
اولاد کی تعداد	۴۲۲
حضرت قاسمؓ	”
حضرت زینبؓ	۴۲۳
حضرت رقیہؓ	۴۲۵
حضرت ام کلثومؓ	۴۲۶
حضرت فاطمۃ الزہراءؓ	۴۲۷
حضرت ابراہیمؓ	۴۲۹
ازواج مطہرات کے ساتھ معاشرت ۴۳۲ — ۴۴۰	
معاشرت کے چند مؤثر واقعات	۴۳۲
ازواج مطہرات اور اہل عیال کی سادہ زندگی	۴۳۷
انتظام خانگی	۴۴۰
اہل و عیال کے مصارف کا انتظام	۴۴۰
خاتمہ	”

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مجلد دوم

سیرۃ نبویؐ مجلد اول ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸ء) میں شائع ہوئی، اب مجلد دوم ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۰ء) کے اواسط میں شائع ہوتی ہے، شائقین کا تقاضا ہو کہ جلد سے جلد اس کی جلدیں شائع ہوتی ہیں لیکن شاید اُن مشکلات کا ان کو علم نہیں جو عالمگیر جنگ نے زندگی کے ہر شعبہ میں پیدا کر دی ہیں۔ گو ایک سال سے زیادہ ہوا کہ جنگ کا عملاً خاتمہ ہو گیا لیکن با ایں ہمہ حقیقت یہ ہے کہ صلح کا آغاز نہیں ہوا، اور اس خاتمۂ جنگ سے زندگی کے مشکلات میں ایک ذرہ کمی نہیں ہوئی، جلد اول کے تکلیف دہ تجربہ کے بعد یہ طے کر لیا گیا تھا کہ دوسری جلد خود مطبع معارف میں چھپے گی لیکن مشکل یہ تھی کہ ہمارے پاس مشین نہ تھی، بڑی تلاش و جستجو سے مشین ہاتھ آئی، تو کاغذ کا قحط نظر آیا، جلد اول میں جن اصناف کے کاغذ لگ چکے تھے، اُن کا ملنا دشوار ہو گیا، دیسی کاغذ کے ۲۰۰ ریم بھی بیک وقت نہ مل سکے، یہ وقت کسی طرح ختم ہوئی تو لوح (ٹائیٹل پیج) کے کاغذ کی مشکل پڑی، لکھنؤ سے لیکر کلکتہ اور بمبئی تک کے کارخانے چھان مارے گئے، مگر خاطر خواہ کاغذ دستیاب نہ ہوا، آخر جو بھی مل سکا اور جس طرح بھی بنا یہ جلد اختتام کو پہنچی۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

پہلی جلد نبوت کے پُر آشوب عہد غزوات پر مشتمل تھی، اور دوسری جلد نبوت کی سہ سالہ امن کی زندگی کی تاریخ ہے، نبوت کی بست و سہ سالہ زندگی میں پہلی جلد بیس سال کے کارناموں کا مجموعہ تھی، اور یہ جلد بقیہ آخری تین سال کے واقعات کا ذخیرہ ہے، اور اس کے بعد اخلاق و شمائل شریفہ اور ازواج مطہرات

Marfat.com

و اولاد کرام کا تذکرہ ہے۔

مصنف مرحوم کی وفات کے بعد جب اس جلد کا تمام قلمی سرمایہ میرے ہاتھ میں آیا تو مجھے اس میں بہت سے ابواب کی کمی محسوس ہوئی، جن کے اضافہ کے بغیر یہ جلد ناتمام نظر آتی تھی، لیکن مصنف کے مسودہ میں اضافہ کی ہمت نہیں ہوتی تھی، آخرکار مدت کے حیص بیص کے بعد میں نے طے کر لیا کہ انکو لکھنا ہی چاہیے، چند روز کے بعد مجھے اتفاقاً مولانا کے ہاتھ کی ایک یادداشت ملی جو وفات سے پانچ ماہ پیشتر ایک سفینہ میں لکھی تھی، اس کا عنوان "یادداشتِ اخیر" تھا۔ اس یادداشت کو پڑھکر میری مسرت کی انتہا نہیں رہی جب میں نے یہ دیکھا کہ جن ابواب کو میں ضروری سمجھتا تھا مصنف مرحوم نے بھی اپنی آخری یادداشت میں انکا اضافہ ضروری قرار دیا تھا، اور گویا وہ ایک وصیت نامہ تھا جس کو فرشتۂ غیب نے ان کے دست و قلم سے میری تسلی کے لیے پہلے ہی لکھوا دیا تھا۔

حلِّ ایں عقدہ ہم از روے نگار آخر شد

اخلاق کے باب کو مصنف مرحوم نے تکمیل کو نہیں پہنچایا تھا۔ بہت سے عنوانات سادہ تھے، بہت سے عنوانات کو شروع کر کے آیندہ اضافہ کے لیے ناتمام بصورتِ بیاض چھوڑ دیا تھا، جامع نے انکو لکھکر بطور تکملہ کتاب میں شامل کر دیا، بہت سے ضروری حواشی بھی جابجا بڑھائے گئے ہیں، چنانچہ جیسا کہ جلد اول کے دیباچہ میں ذکر کیا گیا ہے، اضافہ اور تکملہ اور حواشی کی تمام عبارتیں ہلالین کے اندر کر دی گئی ہیں، تاکہ مصنف اور جامع کی عبارتیں باہم مختلط نہ ہونے پائیں۔

جامع

سید سلیمان ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کی امن کی زندگی

۹ھ ، ۱۰ھ و ۱۱ھ

قیامِ امن، اشاعتِ اسلام، تاسیسِ خلافت، تکمیلِ شریعت

قیامِ امن

(گذشتہ ابواب[1] کے پڑھ لینے کے بعد یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں رہتی کہ اس وقت تک گو فطری صلاحیت و استعداد کے رو سے عرب کا ذرہ ذرہ ستارہ تھا، لیکن وہ کسی ایک نظامِ شمسی کے تابع نہ تھا، تمام جزیرۂ عرب ایک واحد ملک اور ایک متحد قوم تھا، تاہم نہ تو کبھی تاریخ نے اس کے ملکی و قومی اتحاد کا نشان دیا اور نہ سیاسی حیثیت سے کسی زمانہ میں تمام عرب ایک پرچم کے نیچے جمع ہوا، جس طرح گھر گھر کا الگ الگ خدا تھا، اسی طرح قبیلہ قبیلہ کے جدا رئیس تھے، جنوبی عرب میں حمیری اذواء اور اقیال کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں، شمالی عرب میں بکر، تغلب، شیبان، ازد، قضاعہ، کندہ، لخم، جذام، بنو حنیفہ، طے، اسد، ہوازن، غطفان، اوس، خزرج، ثقیف اور قریش وغیرہ کی الگ الگ ٹولیاں تھیں، جو دن رات نمانہ جنگیوں میں مبتلا رہتی تھیں، بکر و تغلب کی چہل سالہ جنگ

[1] یہ پورہ باب اضافہ از صفحہ ا تا ۱۰

کا ابھی ابھی خاتمہ ہوا تھا، کندہ اور حضر موت کے قبائل کٹ کٹ کر فنا ہو چکے تھے، اوس و خزرج لڑ لڑ کر اپنے ایک ایک سردار کو کھو چکے تھے، خاص حرم اور اشہر حرم میں بنو قیس اور قریش کے درمیان حرب فجار کا سلسلہ جاری تھا، اور اس طرح تمام ملک مرکز کارزار بنا ہوا تھا۔

پہاڑوں اور صحراؤں میں خود مختار جرائم پیشہ قبائل آباد تھے، تمام ملک قتل و غارت گری، سفاکی، خونریزی کے خطرات میں گھرا تھا، تمام قبائل غیر مختتم سلسلۂ جنگ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، انتقام ثار اور خوں بہا کی پیاس سینکڑوں اور ہزاروں اشخاص کے قتل کے بعد بھی نہیں بجھتی تھی، ملک کا ذریعۂ معاش غارت گری کے بعد فقط تجارت تھی لیکن تجارت کے قافلوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تک گذرنا محال تھا، حیرہ کے عرب بادشاہ اگرچہ شمالی عربستان میں کافی اثر اور اقتدار رکھتے تھے، تاہم ان کا تجارتی سامان بھی عکاظ کے بازاروں میں بآسانی نہیں پہنچ سکتا تھا، شہور حج عملاً عرب کے مقدس مہینے تھے، باایں ہمہ لڑائیوں کے جواز کے لیے وہ کبھی بڑھا اور کبھی گھٹا دیے جاتے تھے، ابو علی قالی نے کتاب الامالی میں لکھا ہے:

وذالك لانهم كانوا يكرهون	یہ اس لیے کہ وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ تین
ان تتوالى عليهم ثلاثة اشهر	مہینے متصل ان پر غارتگری کے بغیر گذر جائیں
لا تمكنهم الاغارة فيها لان	کیونکہ غارت گری ہی ان کا ذریعۂ معاش
معاشهم كان من الاغارة (ص۴ جلد۱)	تھا۔

بہت سے جرائم پیشہ قبائل کے ذریعۂ معاش کیلئے یہی موسم موسم بہار تھا، مکہ کے آس پاس اسلم و غفار وغیرہ قبائل آباد تھے، جو حاجیوں کا اسباب چرانے میں بدنام تھے[1]، طے نہایت ممتاز اور نامور

[1] صحیح بخاری ذکر اسلم و غفار۔

Marfat.com

قبیلہ تھا، لیکن وزدانِ طے بھی اپنی شہرت میں ان سے کم نہ تھے[1]، سلیک ابن السلکہ اور تابط شرا، عرب کے مشہور شعراء تھے لیکن انکی شاعری کا تمامتر سرمایہ صرف اپنی چوری اور حیلہ گری کے پرفخر کارنامے تھے۔

ملک میں اضطراب اور بدامنی کا یہ حال تھا کہ عبد القیس جو بحرین کا ایک طاقتور قبیلہ تھا، ۵ھ تک مضری قبائل کے ڈر سے اشہر حرم کے سوا اور مہینوں میں حجاز کا رخ نہیں کرسکتا تھا[2] فتح مکہ کے بعد بھی جب ملک میں سکون شروع ہوچکا تھا، مدینہ سے مکہ تک سفر خطرناک تھا، اور اب بھی لوگ ڈاکے ڈالتے رہتے تھے، ہجرت[3] کے پانچ چھ برس کے بعد تک بھی شام کے تجارتی قافلے دن دھاڑے لوٹ لیے جاتے تھے[4]، یہانتک کہ کبھی کبھی خود دار الاسلام کے چراگاہوں میں بھی چھاپے مارے جاتے تھے[5]، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کو ملک کے امن وامان کی بشارت دیتے تھے کہ ایک زمانہ آئیگا جب صنعاء سے ایک خاتون محمل نشین تنہا سفر کرے گی، اور خدا کے سوا کسی کا اس کو خوف نہ ہوگا[6]، تو لوگوں کو تعجب آتا تھا، ۹ھ میں ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ میرا مال ڈاکوؤں نے لوٹ لیا، آپ نے فرمایا کہ "عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب مکہ کو قافلہ بے نگہبان جایا کرے گا[7]" اتنے بڑے ملک میں صرف حرم کی سرزمین ایسی تھی، جہاں لوگوں کو اطمینان میسر آسکتا تھا، خدا نے قرآن مجید میں اہل مکہ پر اپنا سب سے بڑا احسان یہی جتایا ہے،

فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ — ان کو چاہیے کہ اس گھر کے اس مالک کو پوجیں،

---

[1] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ [2] صحیح بخاری کتاب الایمان [3] ابوداؤد کتاب الادب باب الی ... [4] طبقات ابن سعد جزء مغازی ص ۶۳ و ۶۴ و ۶۵ [5] دیکھو غزوہ سویق وغزوہ غابہ [6] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ [7] بخاری ص ۱۹۰

Marfat.com

الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (ایلاف)	جس نے ان کو بھوک میں کھانا دیا، اور بدامنی کو دور کر کے ان کو امن بخشا،
اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (عنکبوت)	کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے ایک امن والا حرم ان کیلیے بنایا، اس کے باہر بدامنی کا یہ عالم کہ اسکے چاروں طرف سے آدمی اچک لیے جاتے ہیں،

خود اسلام کا کیا حال تھا؟ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عام الحزن کے بعد تین برس تک متصل تمام قبائل کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرتے رہے کہ مجھے امان میں لے کر صرف اتنا موقع ولا دو کہ خدا کی آواز لوگوں تک پہنچا سکوں لیکن کوئی ہامی نہیں بھرتا تھا، عام مسلمان عرب کی فضا میں سانس تک نہیں لے سکتے تھے، تلاش امن کے لیے افریقہ وحبش کے ریگستانوں میں مارے مارے پھرتے تھے، جو عرب میں رہ گئے تھے وہ ہدف مظالم گوناگوں تھے، قرآن مجید مسلمانوں کی اسی حالت کا ذکر ان آیتوں میں کرتا ہے:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ یَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ (انفال)	یاد کرو جب تم ملک میں تھوڑے اور کمزور تھے ڈرتے تھے کہ لوگ تم کو اچک نہ لیں،

اسی ملکی شورش اور بے امنی کا یہ نتیجہ تھا کہ ملک میں کوئی تحریک بھی بغیر خود حفاظتی فوجی تدابیر کے کامیاب نہیں ہو سکتی تھی، سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اصلی فرض اسلام کی دعوت تھی، اور اس کے لیے تیغ وخنجر اور فوج ولشکر کی حاجت نہ تھی لیکن ایک طرف تو دشمن حملہ پر حملہ کرتے چلے آتے تھے، اور دوسری طرف ہر جگہ دعاۃ اسلام کی جانیں معرض خطر میں رہتی تھیں، تجارت کے قافلے جن پر

Marfat.com

اصل میں ملک کی معاش کا دارومدار تھا، غیر مامون تھے، چنانچہ اس قسم کے تفصیلی واقعات غزوات نبویؐ کے اسباب وانواع میں گذر چکے ہیں،

بیرونی خطرات

بہرحال یہ تو ملک کی اندرونی حالت تھی، بیرونی خطرات بھی کچھ کم نہ تھے، ملک کے تمام سرسبز و زرخیز صوبے روم وفارس دو عظیم الشان طاقتوں کے پنجہ میں تھے، تقریباً ساٹھ برس سے ایرانی، یمن، عمان اور بحرین کے مالک بن بیٹھے تھے، اور ان کے زیر اقتدار برائے نام عرب روسا حکمران تھے، حدود عراق میں آل منذر کی حکومت کو مٹا کر ایرانیوں نے اندرون ملک میں بھی پیش قدمی شروع کردی تھی، حجاز میں اسلام کی جو تحریک پھیل رہی تھی، اس کو بھی وہ اپنے ہی حدود میں سمجھتے تھے، چنانچہ ۶ھ میں شاہ ایران نے یمن کے ایرانی گورنر کو فرمان بھیجا کہ "میرے غلام کو جو حجاز میں مدعی نبوت بنا ہے گرفتار کرکے میرے پاس بھیجدو"

رومیوں نے حدود شام پر قبضہ کرلیا تھا، آل غسان اور چھوٹے چھوٹے عرب رؤسا نے جنھوں نے مدت سے عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا ان کی ماتحتی قبول کرلی تھی، ۸ھ کے بعد رومی ان عیسائی رؤساء نے عرب کی مدد سے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کررہے تھے جس کا ظہور واقعۂ تبوک اور موتہ وغیرہ کی صورت میں ہوا،

یہودیوں کی قوت

رومیوں نے دوسری صدی عیسوی میں یہودیوں سے شام وفلسطین کی برائے نام حکومت بھی چھین لی تھی، اور وہ مجبوراً حدود شام سے قلب حجاز تک پیچھے ہٹ آئے تھے، اور اپنے لیے مدینہ سے شام تک متصل قلعے تعمیر کرلیے تھے، یہ مقامات ان کے جنگی استحکامات بھی تھے اور تجارتی گودام بھی تیماء، قریظہ، قینقاع، خیبر، فدک[1]

---

[1] معجم البلدان یاقوت میں ان مقامات کے حالات پڑھو،

Marfat.com

تیما، وادی القریٰ وغیرہ ان کی بڑی بڑی چھاؤنیاں تھیں[1]، قرآن مجید میں حسب ذیل آیات میں یہودیوں کے ان ہی قلعوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُحَصَّنَةٍ أَوْ مِنْ وَرَاءِ جُدُرٍ (حشر) — وہ قلعہ بند آبادیوں یا دھس کے نیچے چھپے بغیر یوں مل کر مقابلہ نہیں کر سکتے،

وَأَنْزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ صَيَاصِيهِمْ (احزاب) — خدا نے ان یہودیوں کو جنھوں نے ان کی مدد کی تھی ان کے قلعوں سے اتارا،

زمانہ قدیم میں مالی کاروبار کی وسعت نے اسپین اور دیگر ممالک یورپ میں ان کو جس طرح ملک کی پالیٹکس کا خطرناک عنصر بنا دیا تھا بعینہٖ یہی حال ان کا عرب میں بھی تھا، ان چند قلعوں کے برتے پر وہ اسلام کی قوت کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو متعدد لڑائیاں صرف ان کی شرارت سے لڑنی پڑیں، بدر میں جب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو یہ فخریہ کہتے تھے "بیچارہ مکہ کے قریش لڑنا کیا جانیں مسلمانوں کو ہمارے قلعوں سے مقابلہ پڑے تو معلوم ہو"

غرض عرب کا ملک اس قدر متعدد اور مختلف اندرونی اور بیرونی خطرات میں مبتلا تھا کہ اس کی اصلاح و تدبیر کے لیے عام انسانی دست و بازو بیکار تھے، خدا کا غیر مرئی ہاتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آستین میں پوشیدہ تھا، وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ. ہجرت کے بعد آٹھ برس کی متواتر کوششوں اور پیہم اصلاحات کا یہ نتیجہ ہوا کہ محال نے امکان بلکہ واقعہ کی صورت اختیار کر لی، عرب کے سیاسی ضعف کا تمامتر راز نا اتفاقی اور باہمی جنگ و جدال میں مضمر تھا، اور اس نا اتفاقی

---

[1] کتب مغازی و سیر میں ان کے حالات دیکھو، بخاری میں ابواب قتل کعب بن اشرف و رافع بن خدیج۔

Marfat.com

اور خانہ جنگی کا سبب صرف یہ تھا کہ تمام عرب مختلف خاندانوں اور نسلوں میں منقسم تھا، تمام ملک کے اجتماع اور اتحاد کے لیے ان میں کوئی مستحکم رشتہ موجود نہ تھا، محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تمام عرب کی شیرازہ بندی کے لیے اسلام کا رشتہ قائم کیا۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (حجرات) اور دفعتاً اس روحانی رشتہ نے خون، قرابت اور نسل کے تار و پود ادھیڑ دیے اور صرف ایک کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی برقی رو، اب تمام عرب کی اتحادی روح کو حرکت دے رہی ہے۔

خدائے پاک نے قرآن مجید میں اس اجتماع اور اتحاد کے وجود کو اپنی مخصوص نعمت فرمایا:

وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ	خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ تم باہم ایک دوسرے
اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ	کے دشمن تھے، خدا نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا پھر اس کے
بِنِعْمَتِہٖ اِخْوَانًا (آل عمران)	لطف و محبت سے تم بھائی بھائی بن گئے۔

خدا نے خود آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "محمد! یہ تیرا کام نہ تھا، اس میں خود خداوند مقلب القلوب کا ہاتھ کام کر رہا تھا":

ھُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَکَ بِنَصْرِہٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ	وہ خدا ہی ہے جس نے محمد! اپنی نصرت اور مسلمانوں کے
وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا	ذریعہ سے تجھ کو قوت بخشی، اور اسی نے مسلمانوں کے
فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ	دل باہم جوڑ دیے، اگر تو تمام دنیا کے خزانے بھی
وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیْنَھُمْ اِنَّہٗ عَزِیْزٌ	لٹا دیتا تو بھی ان کے دلوں کو نہ جوڑ سکتا لیکن خدا نے
حَکِیْمٌ (انفال-۸)	ان کے دل باہم جوڑ دیے، وہ زبردست حکمت والا ہے۔

Marfat.com

ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین وانصار کے درمیان جو مواخاۃ اور برادری قائم کرائی تھی وہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھی، اور اس کی آخری کڑی وہ خطبہ تھا جو فتح مکہ کے موقع پر دیا گیا۔

قرآن مجید نے اپنے متواتر ارشادات میں فتنہ وفساد فی الارض کو مکروہ ترین فعل انسانی قرار دیا، اور اس فعل کے مرتکب کے لیے سخت سزائیں مقرر کیں۔ چوری کے لیے قطع ید کی سزا متعین کی، رہزنی کے لیے قتل، پھانسی قطع ید اور جلاوطنی کی تعزیریں جاری کیں، سورہ مائدہ میں خونریزی اور قتل و سفاکی کے انسداد کے لیے قصاص کا قانون نازل ہوا۔ عملاً ملک میں قیام امن کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار فوجیں بھیجیں، رہزن قبائل پر چھاپے مارے[1]، حجاز میں جن قبائل کا پیشہ چوری تھا، وہ تائب ہو کر مسلمان ہو گئے۔ فوجداری اور دیوانی کے مقدمات کے فیصلے کے لیے قوانین وضع ہوئے، اور جا بجا عمال کا تقرر ہوا۔

لیکن یہ سب جو کچھ ہوا، وہ انسانوں کی ظاہری فطرت کی پابندی تھی۔ ورنہ ایک پیغمبر کا فرض، ایک مقنن، اور ایک عام مدبر کے فرائض سے بدرجہا بلند ہے۔ اسلام کے قانون تعزیرات نے جو کچھ کام کیا، قرآن کا روحانی اثر اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض تلقین اس سے پہلے فرد قرار داد جرم کی دفعات کو بالکل مٹا دیتا تھا۔ قانون و خوف تعزیر صرف بازاروں میں اور انسانوں کے عام مجمعوں میں جرائم سے باز رکھ سکتا ہے لیکن دعوت اسلام کے فیض اثر نے دلوں کو بالکل خدا کے سامنے کر دیا، جو رات کی تاریکیوں میں بھی دیکھتا تھا، اور مقفل دروازوں

[1] دیکھو غزوات نبوی پر دوبارہ نظر [2] صحیح بخاری ذکر غفاری و اسلم

کی کھڑکیوں سے بھی جھانکتا تھا اور اب تمام ملک میں امن و امان تھا، اور عدی بن حاتم نے شہادت دی کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق لوگ صنعا سے حجاز تک تن تنہا سفر کرتے تھے، اور خشیتہ الٰہی کے سوا کوئی اور خوف راستہ میں نہ تھا۔[1] ایک یورپین مورخ جس کے قلم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کے لیے بہت کم جنبش کی ہے (مارگولیوس) وہ بھی ان الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے،

"محمد کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہ گیا، آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دار السلطنت مقرر کیا گیا تھا، بنیاد ڈال چکے تھے، آپ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپ نے عرب کو ایک ایک مشترک مذہب عطا کیا، اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔"[2]

بیرونی خطرات کے انسداد کے لیے خدا نے عجیب و غریب سامان پیدا کر دیے، قریش اور منافقینِ مدینہ کے اشتعال سے یہودیوں نے اسلام کو پامال کرنا چاہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود چور چور ہو گئے ۳ھ سے لیکر ۷ھ تک متواتر لڑائیاں پیش آئیں اور آخر فتح خیبر پر ان کی سیاسی قوت کا خاتمہ ہو گیا، رومیوں نے اور حدود شام کے عیسائی عربوں نے اسلام کے استیصال کا بیڑا اٹھایا، عیسائی رؤسائے عرب میں سب سے زیادہ طاقتور اور پرزور غسانی تھے جو رومیوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی کی طرح کام کرتے تھے، بہرا، وائل، بکر، لخم، جذام اور عاملہ وغیرہ عرب قبائل ان کے ماتحت تھے، ان کے علاوہ دومۃ الجندل، ایلہ، جرباء، اذرح، تبالہ اور

---

[1] صحیح بخاری [2] لائف آف محمدؐ۔ مارگولیوس ص ۱۱۸۴

جرش وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے عیسائی اور یہودی رئیس تھے، غسانیوں کے حملہ کی ابتدا جس طرح ہوئی وہ اوپر گذر چکا ہے، حارث بن عمیر جو شاہ بصریٰ کے دربار میں دعوتِ اسلام کا خط لے کر گئے تھے، ان کو غسانیوں نے راستہ میں قتل کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار مسلمانوں کا ایک دستہ تادیبِ انتقام کے لیے روانہ فرمایا، غسانی ایک لاکھ کا ٹڈی دل لے کر میدان میں آئے، اور خبر تھی کہ رومی بھی اسی قدر فوج لیے ہوئے موقع سے قریب مواب میں پڑے ہیں، تاہم مٹھی بھر مسلمان، آدمیوں کے اس جنگل سے نہ ڈرے، اور کچھ عزیز جانیں کھو کر فوج کو میدانِ جنگ سے ہٹا لائے، اس جنگ کا نام غزوۂ موتہ ہے،

اس کے بعد ۹ھ میں غزوۂ تبوک پیش آیا، دم بدم خبریں آتی رہتی تھیں کہ رومی حملہ آوری کے لیے عیسائی عربوں کی ایک فوج گراں ترتیب دے رہے ہیں، اور ایک سال کی پیشگی تنخواہ بھی فوج کو تقسیم کر چکے ہیں، یہ بھی خبر تھی کہ غسانی فوج کی آراستگی میں مصروف ہیں، اور گھوڑوں کی نعلبندی کرا رہے ہیں، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس ہزار صحابہ کے ساتھ پیش قدمی فرمائی، اور بیس دن تک دشمنوں کی آمد کا انتظار کرتے رہے لیکن کوئی مقابل نہ آیا، تاہم اس پیش قدمی کا یہ فائدہ ہوا کہ غسانیوں کے علاوہ تمام رؤسا نے رومیوں کو چھوڑ کر اسلام کی حمایت قبول کر لی[۱]، ۱۱ھ میں زمانۂ مرض الموت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ بن زید کے زیر افسری رومیوں کے مقابلہ کے لیے پھر فوجیں روانہ فرمائیں، لیکن اس مہم کا اختتام عہد صدیقی میں ہوا،

---

[۱] اوپر کے تمام واقعات کی تفصیل اور حوالے غزوۂ موتہ اور تبوک کے ذکر میں گذر چکے ہیں۔

Marfat.com

ایرانیوں کی حکومت زندگی کے آخری دور کو پہنچ چکی تھی، سنہ میں دعاۃ اسلام کے پہنچنے کے ساتھ ہی بے مقابلہ و جنگ یمن، عمان اور بحرین میں ان کی قبائے حکومت کا تار تار الگ ہوگیا،

غرض نو دس برس کی متواتر اور پیہم کوششوں اور مافوق طاقت بشری تائیدات کے سبب سے اب تمام ملک میں امن و امان قائم ہوگیا۔ قریش اور یہود کی سازشوں کا طلسم ٹوٹ گیا، قبائل کی خانہ جنگیاں مٹ گئیں، تمام رہزن اور ڈاکو جتھے رام ہوگئے، بیرونی خطرات کا انسداد ہوگیا۔ اب موقع ملا کہ صلح و آشتی کے ساتھ حسب فرمانِ الٰہی اصل مقصود کی طرف توجہ کیجائے۔

Marfat.com

تبلیغ واشاعتِ اسلام

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی کام تمام عالم میں دعوتِ اسلام کا اعلان کرنا تھا، اور نہ صرف اعلان، بلکہ ہر قسم کے جائز اور صحیح وسائل سے تمام عالم کو حلقۂ اسلام میں لانا تھا، اس کے لیے تیغ وخنجر اور فوج وعسکر کی ضرورت نہ تھی، بلکہ صرف اس قدر کافی تھا کہ دعوتِ حق کی صدا اطرافِ عالم میں پہنچ جانے پائے لیکن مکہ میں تیرہ برس تک اعدائے اسلام اسی کے سدراہ رہے، حج کے موقع پر عرب کے تمام قبائل دور دراز مقامات سے آتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک کے پاس جاتے اور صرف یہ درخواست کرتے کہ قریش مجھکو پیغامِ حق پہنچانے سے روکتے ہیں، تم اس کا حق دلا دو اور خود دو لیکن قریش کے اثر سے ہزاروں لاکھوں میں سے ایک بھی اس کی ہامی نہیں بھرتا تھا، تاہم آفتابِ حق کی کرنیں ان کثیف بادلوں میں سے بھی چھن چھن کر سطحِ قلوب پر پڑتی تھیں، اور اکناف وحوالی کو روشن کرتی جاتی تھیں، اسلام کو صرف اشتہار اور اعلان کی ضرورت تھی، اور یہ کام خود اعدائے اسلام نے انجام دیا، جب حج کا زمانہ آتا تو رؤسائے قریش عام گذرگاہوں پر خیمے لگاتے، باہر کے لوگ ان سے ملنے آتے، اور چونکہ بعثتِ نبوی کا چرچا پھیل چکا تھا، لوگ اسکی حقیقت دریافت کرتے، اور نہ کرتے تو قریش خود حفظ ماتقدم کے لیے ان سے کہتے کہ "ہمارے شہر میں ایک بدعقیدہ پیدا ہوا ہے جو ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے، یہاں تک کہ لات وعزیٰ تک کو برا کہتا ہے"۔

بدعقیدہ کو عربی میں "صابی" کہتے ہیں، اسی مناسبت سے یا اس وجہ سے کہ اسلام کے بعض فرائض مثلاً نماز کی صورت، صابئین کے اعمال سے ملتے جلتے ہیں، قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صابی کا لقب دیا تھا۔ اور بالآخر اس لقب سے تمام عرب میں آپ کا نام مشہور ہوگیا[1]۔ صحیح بخاری کتاب المغازی میں ایک صحابی سے روایت ہے کہ "میں جب چھوٹا تھا تو مکہ کے آنے جانے والوں سے سنا کرتا تھا کہ مکہ میں ایک مدعی نبوت پیدا ہوا ہے[2]۔"

ملک میں جب آپ کا نام مشہور ہوا تو اگرچہ جمہور عام پر مخالف اثر پڑا، اور ان میں سے کسی شخص نے آپ کی طرف رخ نہیں کیا، لیکن اتنا بڑا وسیع ملک ان لوگوں سے خالی نہیں ہوسکتا تھا جن کو یہ شوق پیدا ہو کہ اصل واقعہ کیا ہے، عرب میں ایسے لوگوں کی خاصی جماعت پیدا ہوگئی تھی، جو بت پرستی سے متنفر ہو چکے تھے، اور حق کے متجسس تھے، بعض لوگ اس حد سے ترقی کرکے حنفی بن گئے تھے، جن کا تذکرہ آغاز کتاب میں گذر چکا ہے، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں متعدد ایسے صحابہ کا تذکرہ کیا ہے جو یمن وغیرہ دور دراز مقامات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق حال کے لیے مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور مخفی طور سے اسلام لاکر واپس گئے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ یمنی اور طفیل بن عمرو دوسی یمنی، کے خاندان میں جو اسلام پھیلا اس کی ابتدا قیام مکہ ہی کے زمانہ میں ہوئی تھی۔

طفیل بن عمرو دوسی عرب کا مشہور شاعر تھا، اور چونکہ عرب میں شعرا کا اثر بہت تھا یعنی وہ قبیلہ کے قبیلہ کو جدھر چاہتے تھے جھونک دیتے تھے۔ اس لیے قریش نے کوشش کی کہ وہ کسی طرح

[1] صحیح بخاری کتاب التیمم [2] ایضاً کتاب المغازی ص ۵۱۶ اضافہ تا قصہ ابوذر

طفیل کا ا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہ پہنچ پائے، لیکن ایک دفعہ جب اس نے اتفاقیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید پڑھتے سنا تو وہ فوراً مسلمان ہو گیا[1] اور اس کے اثر سے اسی زمانہ میں قبیلہ دوس میں بھی اسلام پھیلنے لگا[2]۔ تاہم عام قبیلہ نے طفیل کی دعوت قبول نہ کی، وہ رنجیدہ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی یا رسول اللہ! دوس نے نافرمانی کی، ان پر بددعا کیجئے، آپؐ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ "خدایا دوس کو ہدایت دے اور ان کو بھیج"۔ اس کے بعد سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا[3]۔

عمرو بن عبسہ سلمی بھی ان ہی بزرگوں میں ہیں جنھوں نے لوگوں کی زبانی یہ سن کر کہ مکہ میں ایک شخص پیدا ہوا ہے جو بہت سی باتیں بناتا ہے، مشتاقانہ مکہ آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت قریش کے مظالم کی بنا پر چھپے رہتے تھے، عمرو بن عبسہ کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے اور عرض کی کہ آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا "میں پیغمبر ہوں" انھوں نے کہا "پیغمبر کس کو کہتے ہیں؟" آپ نے فرمایا "خدا نے مجھے بھیجا ہے"۔ انھوں نے پھر پوچھا "کیا پیغام دے کر بھیجا ہے؟" ارشاد فرمایا "مجھے خدا نے یہ پیغام دیکر بھیجا ہے کہ قرابت کا حق ادا کیا جائے، بت توڑے جائیں، خدا کو ایک مانا جائے اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے"۔ عمرو نے پوچھا "اس مذہب کے کتنے پیرو ہیں؟" آپ نے فرمایا "ایک آزاد (ابوبکرؓ) اور ایک غلام (بلالؓ)"۔ عمرو نے کہا "میں بھی آپ کی پیروی کرتا ہوں"۔ ارشاد ہوا کہ ابھی تو یہ ممکن نہیں، تم دیکھتے ہو کہ میں کس حال میں ہوں اور لوگوں کا کیا حال ہے، میری کامیابی کا جب حال سنو تو میرے پاس آنا، چنانچہ عمرو واپس گئے

---

[1] زرقانی [2] صحیح مسلم کتاب الایمان سے یہ مفہوم ہوتا ہے [3] صحیح بخاری باب قصہ دوس۔

اور ہجرت کے بعد جب لوگوں کی زبانی آپ کی کامیابی کا حال معلوم ہوا تو حاضر خدمت ہوئے[۱]،

ضماد بن ثعلبہ کا اسلام

ضماد بن ثعلبہ، قبیلۂ ازد شنوءہ کے رئیس اور آپ کے زمانۂ جاہلیت کے دوست تھے۔ وہ مکہ آئے تو سنا کہ محمد کو جنون ہو گیا ہے، وہ جھاڑ پھونک بھی کرتے تھے، وہ آپ کے پاس آئے، کہ لاؤ میں تمھارا علاج کر دوں، آپ نے فرمایا الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ۔ ان فقروں نے ضماد پر غیر معمولی اثر کیا، عرض کی دوبارہ ارشاد فرمائیے، آپ نے پھر اعادہ فرمایا، ضماد نے پھر تیسری بار پڑھوایا، اب وہ بالکل مسحور تھے، بولے کہ میں نے کاہنوں کی باتیں، جادوگروں کے منتر اور شاعروں کے قصائد سنے ہیں لیکن ایسا کلام میں نے نہیں سنا، یہ تو دریا کی تہ تک میں بھی اثر کر جائے گا، لائیے ہاتھ لائیے میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں، آپ نے ان سے بیعت لی، پھر فرمایا، اپنے پورے قبیلہ کی طرف سے بھی بیعت کر لو، چنانچہ انھوں نے پورے قبیلہ کی طرف سے بیعت کر لی، اور وہ

قبیلہ ازد کا اسلام

ان کی دعوت سے مسلمان ہو گئے، ایک دفعہ ایک لڑائی میں مسلمان سپاہیوں کا ادھر سے گذر ہوا، تو افسر نے پوچھا کسی نے اس قبیلہ کی کوئی چیز لی ہے، ایک سپاہی نے کہا ایک لوٹا میرے پاس ہے، اس نے حکم دیا کہ واپس کر دو[۲]۔

حضرت ابوذرؓ کا اسلام

حضرت ابوذرؓ کا واقعہ اس موقع پر خاص طرح پر ذکر کے قابل ہے،

غفار کا قبیلہ جو قریش کی شامی تجارت کے راستہ میں آباد تھا، جب وہاں یہ چرچا پھیلا تو

---

[۱] صحیح مسلم باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا [۲] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبۃ۔

Marfat.com

حضرت ابوذرؓ جو بت پرستی سے متنفر ہو چکے تھے، اور حق کی تلاش میں تھے، انھوں نے اپنے بھائی (انیس) سے کہا کہ تم مکہ جاؤ اور دیکھو کہ یہ شخص جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، اس کی تعلیم اور تلقین کیا ہے، انیس مکہ میں آئے اور واپس جاکر بیان کیا کہ "وہ مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور جو کلام پیش کرتا ہے وہ شاعری سے الگ ہے" حضرت ابوذرؓ کو اس مختصر جواب سے تسکین نہیں ہوئی، خود گئے، زادِ سفر کیلئے مشک میں پانی اور کچھ کھانے کو لے لیا، مکہ میں آئے تو ڈر کے مارے کسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پوچھ نہیں سکتے تھے، حرم میں حضرت علیؓ سے ملاقات ہوگئی، انھوں نے گھر پر لاکر مہمان رکھا، لیکن تین دن تک ان سے بھی کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی، بالآخر خود حضرت علیؓ نے پوچھا کہ "یہاں آنے کی کیا غرض ہے" انھوں نے ڈرتے ڈرتے بتایا لیکن پھر قول و قرار لے لیا کہ کسی پر یہ راز ظاہر نہ ہونے پائے، حضرت علیؓ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور آپ نے اسلام کی تلقین کی، اور فرمایا کہ اس وقت گھر واپس جاؤ، پھر میں جو کچھ کہلا بھیجوں گا اس کی تعمیل کرنا، لیکن ان کو اسلام کا جوش تھا، عرض کی کہ "میں تو اسلام کا اعلان کرکے رہوں گا" غرض حرم میں آئے اور زور سے پکارے کہ "اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا رسول الله"

اس آواز کا سننا تھا کہ لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑے اور ان کو مارنا شروع کیا، حضرت عباسؓ نے آکر بچایا اور لوگوں سے کہا "تم یہ نہیں سمجھتے کہ تمھاری تجارت کا راستہ غفار کی آبادی سے ہوکر گزرتا ہے اور یہ اسی قبیلہ کے آدمی ہیں" اس وقت لوگوں نے چھوڑ دیا لیکن دوسرے دن حضرت ابوذرؓ نے حرم میں جاکر پھر اسی طریقہ سے اسلام کا اعلان کیا، اور نتیجہ بھی وہی ہوا جو کل ہو چکا تھا، آج بھی اتفاق سے حضرت عباسؓ آگئے اور انھوں نے جان بچائی[1]۔

[1] یہ روایت تمامہ صحیح بخاری سے ماخوذ ہے، صحیح مسلم میں یہ واقعہ جس طرح منقول ہے اس میں بہت سی باتیں اس سے زائد اور مختلف ہیں حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ ان دونوں روایتوں میں تطبیق ممکن ہے۔

Marfat.com

قبیلہ غفار کا اسلام

حضرت ابوذرؓ مکہ سے جب واپس گئے اور اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دی تو آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہوگیا، بقیہ آدمیوں نے کہا کہ ہم اس وقت اسلام کا اظہار کریں گے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آجائیں، چنانچہ جب آپ مدینہ میں تشریف لائے تو باقی آبادی بھی مسلمان ہوگئی[1]۔

قبیلۂ اسلم کا اسلام

غفار سے قریب اسلم کا قبیلہ آباد تھا، اور دونوں قبیلوں میں قدیم تعلقات تھے، غفار کے اثر سے انھوں نے بھی اسلام قبول کرلیا[2]، (حالانکہ یہ دونوں قبیلے اسلام سے پہلے چوری میں بدنام تھے[3]، اور ان کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعلِ شنیع کا دشمن ہے)

اوس و خزرج کا اسلام

(موسم حج میں عرب کے اکثر قبائل کا اجتماع ہو جاتا تھا، آپ اس موقع پر ایک ایک قبیلہ کے قیام گاہ پر جاتے اور اسلام کی دعوت دیتے تھے، چنانچہ مدینہ کے قبائل اوس و خزرج کی ایک معتد بہ جماعت نے اسی موقع پر اسلام قبول کیا، اس کے بعد جب حضرت مصعب بن عمیرؓ داعی اسلام بناکر مدینہ منورہ بھیجے گئے، تو ان کے فیضِ تلقین سے چند ہی مہینوں میں دو گھرانوں

قیام مدینہ میں اشاعت اسلام

کے سوا بقیہ تمام گھرانے مسلمان ہوگئے، ہجرت کے بعد جب آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تو تو آس پاس کے قبائل میں جیسا کہ اوپر گذرا غفار و اسلم نے اسلام قبول کرلیا، کچھ ہی دنوں کے بعد بدر کا معرکہ پیش آیا، جس میں قریش کو شکست ہوئی، اور ستر اشخاص مسلمانوں کے ہاتھ

بدر کے بعد بعض قریش کا اسلام

میں قید ہوئے، ان قیدیوں کی رہائی کے لیے قریش نے مدینہ میں آمد و رفت شروع کی، اس تقریب سے لوگوں کو مسلمانوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا، اور اس اثر سے متعدد اشخاص مسلمان ہوگئے۔

[1] (صحیح مسلم اسلام ابی ذر) [2] صحیح بخاری ذکر اسلم و غفار، [3] بحوالہ سابق

(ان میں) بہت سے لوگ ایسے تھے کہ اتفاقیہ ان کے کانوں میں قرآن مجید کی آواز پڑ گئی اور باوجود سخت عداوت کے ان کا دل پتھر سے موم بن گیا، جبیر بن مطعم بدر کے قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانے کے لیے آئے تھے، اور قیدیوں کے ساتھ اسیر تھے، ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیتیں پڑھ رہے تھے۔

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ	کیا یہ یوں ہی آپ سے آپ پیدا ہو گئے، یا ان لوگوں نے
الْخَالِقُونَ. أَمْ خَلَقُوا السَّمَاوَاتِ	خود اپنے آپ کو پیدا کیا، یا ان لوگوں نے آسمان و
وَالْأَرْضَ بَل لَّا يُوقِنُونَ (طور-۲)	زمین کو پیدا کیا، بلکہ بات یہ ہے کہ انکو یقین نہیں ہے"

جبیر بن مطعم کا اسلام

جبیر بن مطعم نے یہ آیتیں سن لیں تو ان کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل پرواز کر گیا، صحیح بخاری سورۂ طور میں یہ واقعہ مذکور ہے،

پیشین گوئی روم کا اثر

(مکہ میں روم و فارس کی جنگ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشین گوئی فرمائی تھی، وہ ٹھیک فتح بدر کے موقع پر پوری اتری اور قرآن مجید کی پیشین گوئی کے مطابق سات برس کے بعد رومیوں نے فارس پر فتح کلی پائی، اس عظیم الشان معجزہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک خلق کثیر نے اسلام کی صداقت کا اقرار کیا)

غرض اس طرح آپ ہی آپ لیکن نہایت آہستگی اور تدریج کے ساتھ اسلام پھیلتا جاتا تھا، ۵ھ میں قریش کنانہ، غطفان، اسد اور دیگر قبائل نے متحد ہو کر مدینہ پر حملہ کیا، اور شکست کھائی، اس معرکہ کا نام احزاب ہے جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، اس شکست نے قریش کا عالمگیر اثر کسی قدر کم کیا، اور وہ قبائل جو قبول اسلام کے لیے آمادہ تھے لیکن قریش کے ڈر سے ان کو

اظہار اسلام کی ہمت نہیں ہوتی تھی، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں وفود بھیجنے شروع کئے، سب سے پہلی جو سفارت آئی وہ قبیلہ مزینہ کی تھی جس میں چار سو آدمی شریک تھے، انھوں نے یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ اگر ارشاد ہو تو ہجرت کرکے مدینہ میں آجائیں لیکن آپ نے فرمایا "تم جہاں رہو مہاجر ہو"۔[1]

قبیلہ مزینہ کا اسلام

اسی زمانہ میں قبیلہ اشجع کے سفراء جن کی تعداد سو تھی، مدینہ میں آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "ہم آپ سے لڑنا نہیں چاہتے، بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ صلح کا معاہدہ ہو جائے"، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا، اس وقت تک یہ لوگ کافر تھے، لیکن جب صلح ہو چکی تو انھوں نے خود بخود اسلام قبول کر لیا۔[2]

قبیلہ اشجع کا اسلام

(جہینہ بھی ان ہی قبائل کے آس پاس آباد تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور وہ فوراً ایک ہزار کی جمعیت لے کر مدینہ آئے، اور مسلمان ہو گئے، اور اس کے بعد وہ اکثر غزوات میں مسلمانوں کے شریک حال رہے۔[3]

قبیلہ جہینہ کا اسلام

غفار، اسلم، مزینہ، اشجع اور جہینہ کی یہی اطاعت اور مسابقت اسلام تھی جس کی بنا پر آپ نے ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔[4]

صلح حدیبیہ کے زمانہ میں، جیسا کہ ہم حدیبیہ کے ذکر میں لکھ آئے ہیں، کفار اور مسلمان نہایت آزادی کے ساتھ آپس میں ملتے جلتے اور اس لیے منکروں کو خلوت وجلوت میں مسلمانوں کی

صلح حدیبیہ کا اثر

[1] جزء طبقات ابن سعد متعلق وفود جزء اول قسم ثانی ص ۳۸ [2] جزء طبقات ابن سعد مذکور ص ۴۸

[3] اصابہ تذکرہ بشیر بن عرفطہ [4] صحیح بخاری ج اول ذکر غفار و اسلم وجہینہ

Marfat.com

تلقینات کے سننے کا موقع ملا، اس کا نتیجہ[1] یہ ہوا کہ اس سے پہلے باوجود غزوات اور محاربات کے جسقدر لوگ اسلام لائے تھے، صرف دو برس میں یہ تعداد اس سے اضعافاً مضاعفہ بڑھ گئی، چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کے سال ادائے عمرہ کے ارادہ سے مدینہ طیبہ سے نکلے تو صرف ڈیڑھ ہزار شخص ساتھ تھے، اب دو برس کے بعد فتح مکہ کو چلے تو دس ہزار مسلمانوں کا لشکر جرار ساتھ تھا،

صلح حدیبیہ کا اثر اگرچہ تمام عرب پر محیط نہ تھا کیونکہ اس معاہدہ میں صرف قریش اور کنانہ شریک تھے، اس لیے جو لوگ براہ راست قریش کے زیر اثر یا ان کے حلیف اور ہم عہد نہ تھے، وہ اب بھی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کرتے رہتے تھے، اور ان کے دفاع کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ کچھ فوجیں بھیجنی پڑتی تھیں، تاہم جن موقعوں پر امن کا گمان ہوتا تھا وہاں داعیانِ اسلام بھیجے جانے لگے کہ لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں لیکن چونکہ حفاظت خود اختیاری کی غرض سے ان داعیوں کے ساتھ تھوڑی بہت جمعیت بھی ہوتی تھی اس لیے ارباب سیر ان تبلیغی جماعتوں کو بھی سرایا سے تعبیر کرتے ہیں،

[1] طبری میں امام زہری کا قول ہے:

فلما کانت الهدنة ووضعت الحرب اوزارها	جب صلح ہو گئی اور جنگ موقوف ہوئی، ایک دوسرے سے
وامن الناس کلهم بعضهم بعضا فالتقوا وتفاوضوا	لوگ بےخوف ہوئے، باہم ملے جلے باتیں چیتیں ہوئیں تو کوئی عقلمند
فی الحدیث والمنازعة فلم یکلم احد بالاسلام	ایسا نہ تھا جس سے اسلام کے متعلق گفتگو آئی اور اس نے قبول نہ کر لیا
یعقل شیئاً الا دخل فیه فلقد دخل فی تینک	چنانچہ جتنے لوگ ابتدا سے اس وقت تک مسلمان ہوئے تھے،
السنین فی الاسلام مثل ما کان فی الاسلام	صرف ان دو برسوں میں ان کے برابر بلکہ ان سے زیادہ
واکثر (ص ۱۵۵۱)	تعداد میں لوگ مسلمان ہو گئے)

Marfat.com

تمام عرب تولیتِ کعبہ کی وجہ سے قریش کو مذہبی رہبر سمجھتا تھا، اس لیے وہ انتظار کر رہے تھے کہ قریش کا کیا انجام ہوتا ہے، عمرو بن سلمہ ایک صحابی تھے جو مدینہ سے دور ایک گذرگاہ عام پر رہتے تھے، ان کے یہ الفاظ صحیح بخاری میں منقول ہیں

فتح مکہ کا اثر

كانت العرب تلوم باسلامهم الفتح فيقولون اتركوه وقومه فانه ان ظهر عليهم فهو نبي صادق، فلما كانت وقعة اهل الفتح بادر كل قوم باسلامهم[1]

عرب قریش کے اسلام کا انتظار کرتے تھے، وہ کہتے تھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی قوم (قریش) پر چھوڑ دو، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان پر غالب آگئے تو بے شبہ وہ سچے پیغمبر ہیں، سو جب مکہ فتح ہوا تو ہر قبیلہ نے اسلام کی طرف پیش دستی کی۔

ابن ہشام نے زیادہ صاف لکھا ہے

وانما كانت العرب تربص بالاسلام امر هذا الحي من قريش وامر رسول الله صلى الله عليه وسلم وذلك ان قريشا كانوا امام الناس وهاديهم واهل البيت والحرم وصريح ولد اسمعيل بن ابراهيم عليهما السلام وقادة العرب لا ينكرون ذلك وكانت قريش هي التي نصبت لحرب رسول الله صلى الله عليه وسلم وخلافه فلما افتتحت مكة ودانت له قريش ودوخها الاسلام عرفت[2]

اور عرب اسلام کے باب میں صرف قریش کا انتظار کرتے تھے، اور وجہ یہ تھی کہ قریش تمام ملک کے سردار اور پیشوا اور کعبۂ حرم کے متولی اور حضرت اسمعیل کی خاص اولاد اور عرب کے قائد تھے اور صرف قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لیے جنگ برپا کی تھی تو جب کہ فتح ہوگیا اور قریش نے سپر ڈال دی اور اسلام نے مکہ کو چھا لیا تو عرب کو یقین ہوگیا کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگ اور عداوت کی طاقت نہیں ہے تو وہ خدا کے دین میں داخل ہوگئے جیسا

---

[1] صحیح بخاری فتح مکہ [2] سیرت ابن ہشام ذکر واقعات ۹ھ و وفود، ۱۲۰

Marfat.com

العرب اناس لاطاقة لهم بحرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — اللہ عزوجل نے قرآن میں کہا ہے

ولاعنا ولا فدخلوا فی دین اللہ کما قال اللہ عزوجل — (یعنی اذا جاء نصر اللہ والفتح)

غرض اسلام کی سچائی اور سادگی اور عرب کی تیز فہمی اور ذہانت کے لحاظ سے اسلام کے پھیلنے میں جو دیر لگی وہ زیادہ تر قومی اور خاندانی مخالفت کی وجہ سے تھی، اب جبکہ باطل کا سنگ راہ ہٹ گیا تو حق کے آگے بڑھنے میں دیر نہ تھی،

فتح مکہ کے بعد اب دعوت اسلام کے لیے یہ خطرہ نہیں رہا کہ اس کے دعاۃ جہاں جائیں بے دریغ قتل کر دیے جائیں، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام اطراف عرب میں دعاۃ بھیج دیے کہ لوگوں کو اسلام کے فضائل و محاسن بتا کر ان کو اسلام کی ترغیب دلائیں۔

دعاۃ حسب ذیل طریقہ سے مقرر کیے گئے،

(۱) حفاظت خود اختیاری کی غرض سے کسی قدر فوج ساتھ کر دی جاتی تھی کہ ان کو کوئی شخص ضرر نہ پہنچانے پائے اور وہ آزادی سے تبلیغ اسلام کر سکیں حضرت خالدؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تو فوج بھی ساتھ کر دی لیکن تاکید تھی کہ بہ جبر پیش نہ آئیں، چنانچہ پورے چھ مہینے تک ان کی دعوت اسلام پر کسی نے توجہ نہیں کی، اور وہ کچھ نہ کر سکے، حضرت خالدؓ سپہ سالار اور فاتح تھے، واعظ اور صاحب ارشاد نہ تھے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اب حضرت علیؓ کو بھیجا انھوں نے قبائل کے سامنے جب اسلام کی تبلیغ کی تو دفعۃً ملک کا ملک مسلمان تھا،

یہی وہ دعاۃ ہیں جن کو علامہ طبری نے ان لفظوں سے تعبیر کیا ہے،

فلما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما بعث — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے اطراف میں کچھ لشکر یا

13912Y

Marfat.com

حول مكة السرايا تدعوا الى الله عزوجل — بھیجی تھیں کہ لوگوں کو خدا کی طرف بلائیں لیکن

ولم يامرهم بقتال — ان کو لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا،

حضرت خالدؓ کو قبیلہ بنی جذیمہ کے پاس بھی اسی طرح دعوتِ اسلام کے لیے بھیجا تھا لیکن جب انھوں نے کشت وخون کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ کھڑے ہو گئے اور قبلہ رخ دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا، خدایا! میں خالد کے فعل سے بری ہوں، پھر حضرت علیؓ کو بھیجا انھوں نے ایک ایک مقتول کا خوں بہا ادا کیا، یہاں تک کہ کتوں کا بھی،

(اشاعتِ اسلام کی غرض سے جو مسلح جماعت اطرافِ ملک میں بھیجی جاتی تھی اس میں کبھی کبھی آپ ایک ایک فرد کا امتحان لیتے تھے، ان میں جو صاحب سب سے زیادہ حافظِ قرآن ہوتے تھے، ان کو اس کا امیر مقرر فرماتے تھے، چنانچہ آپؐ نے ایک بار اسی قسم کی فوج روانہ کرنا چاہی[1] تو ایک ایک شخص سے قرآن پڑھوا کر سنا، ان لوگوں میں ایک کمسن نوجوان تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے، پوچھا تمھیں کیا یاد ہے؟ انھوں نے کہا کہ مجھ کو سورۂ بقرہ اور فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں، آپؐ نے فرمایا تو تم ہی ان سب کے امیر ہو، (ترغیب و ترہیب جلد اصفحہ ۲۵۹، بروایت ترمذی)

(۲) جو ممالک زیرِ اثر آتے تھے اور وہاں زکوٰۃ اور جزیہ کے وصول کرنے کے لیے عمال بھیجے جاتے تھے وہ اکثر اس درجہ کے لوگ ہوتے تھے جن کا تقدس، زہد اور پاکیزگی مسلم ہوتی تھی۔

[1] اس روایت میں اگرچہ یہ تصریح نہیں ہے کہ یہ فوج اشاعتِ اسلام کے لیے بھیجی گئی تھی، صرف یہ الفاظ ہیں:
بعث بعثا وهم ذو عدادٍ — یعنی آپ نے ایک بہت بڑی جماعت بھیجی۔
تاہم قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد صرف اشاعتِ اسلام تھا کیونکہ اگر لڑائی مقصود ہوتی تو حفظِ قرآن کی ضرورت نہیں۔

ہوتی، اور یہ ہر ایک سے قرآن پڑھوا کر سنتے

Marfat.com

اس کے ساتھ عالم اور واعظ بھی ہوتے تھے، اور اس لیے وہ تحصیلِ مال کے ساتھ تبلیغ اسلام کی خدمت بھی انجام دے سکتے تھے، ان میں سے بعضوں کے نام حسب ذیل ہیں،

نام	مقام	کیفیت
مہاجر بنؓ ابی امیہ	صنعاء یمن	حضرت ام سلمہؓ (زوجۂ نبویؐ) کے بھائی تھے،
زیاد بنؓ لبید	حضرموت	یہ ان صحابہ میں ہیں جو غزوۂ بدر میں شریک تھے،
خالد بنؓ سعید	صنعاء یمن	سابقین اولین اور مہاجرین حبش میں ہیں، سب سے پہلے ان ہی نے کاغذات پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا،
عدی بن حاتم	قبیلۂ طے (یمن)	مشہور صحابی ہیں، حاتم طائی ان ہی کا باپ تھا،
علاء بن حضرمی	بحرین	
حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ	زبید وعدن	ان کی دعوتِ اسلام سے قریباً تمام لوگ مسلمان ہوگئے، مشہور صاحبِ علم صحابی ہیں،
حضرت معاذ بنؓ جبل	جند	
جریر بنؓ عبداللہ بجلی	ذوالکلاع حمیری	جریرؓ مشہور صحابی ہیں، ذوالکلاع حمیری یمن کے سلاطین کے خاندان سے تھے، ایک موقع پر لاکھ آدمیوں نے ان کو سجدہ کیا تھا، جریرؓ کی دعوت پر یہ اسلام لائے تو اس کی خوشی میں چار ہزار غلام آزاد کیے،

(۳) بعض[1] لوگ خاص اشاعتِ اسلام کی غرض سے بھیجے جاتے تھے، تفحص سے اس قسم

[1] اخبار فرنا وذکرہ اسلام ابناے یمن

Marfat.com

کے دعاۃ کے نام حسب ذیل ملے ہیں،

نام	مقامِ دعوت	نام	مقامِ دعوت
علیؓ بن ابی طالب	قبیلۂ ہمدان و جذیمہ و مذحج	خالدؓ بن ولید	اطرافِ مکہ
مغیرہؓ بن شعبہ	نجران	عمروؓ بن العاص	عمّان
وبرؓ بن یحنس	ابنائے فارس	مہاجرؓ بن ابی امیہ	بطرفِ حارث بن عبد کلال
محیصہؓ بن مسعود	فدک		شہزادۂ یمن
احنف	قبیلۂ سلیم (مسند ج ۵ ص ۳۷۲)		

(۴) رؤسائے قبائل بارگاہ نبوت میں آکر مسلمان ہو جاتے تھے، اور کچھ روز یہاں قیام کرکے اپنے اپنے قبائل میں دعوتِ اسلام کی غرض سے واپس جاتے تھے، ان اشخاص کے نام یہ ہیں

نام	مقام	کیفیت
طفیل بن عمرو دوسی	قبیلۂ دوس	
عروہ بن مسعود	ثقیف	
عامر بن شہر	ہمدان	
ضمام بن ثعلبہ	بنو سعد	
منقذ بن حبان	بحرین	
ثمامہ بن اثال	اطرافِ نجد	

ان مبلغین اور دعاۃ کے اثر سے اسلام ہر جگہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا، فتح مکہ کے بعد جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے دعاۃ اطرافِ مکہ میں بھیج دیئے گئے تھے، اور لوگ خوشی خوشی مسلمان ہوتے جاتے تھے، قرآن پاک کی یہ آیتیں اسی موقع کی طرف اشارہ کرتی ہیں،

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ	جب خدا کی فتح و نصرت آئی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ
یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا	فوج در فوج خدا کے مذہب میں داخل ہو رہے ہیں،

فتحِ مکہ کے تین مہینے کے بعد ذوالحجہ ۹ھ کے موسمِ حج میں اعلانِ براءۃ ہوا، اس واقعہ کے بعد بلا استثنا، حجاز نے عام طور سے اسلام قبول کر لیا، [۱]

حجاز سے باہر نبوت کے اکیس برس میں صرف قریش اور یہود کی مزاحمت سے اسلام آگے نہ بڑھ سکا، اور خال خال مسلمان ادھر اُدھر نظر آتے تھے، لیکن ان دیواروں کا ہٹنا تھا کہ صرف تین برس میں ۸ھ تا ۱۰ھ میں اسلام کا اثر ایک طرف یمن، بحرین، یمامہ، عمان، اور دوسری طرف عراق و شام کی حدود تک وسیع ہو گیا، یہ عرب کے وہ صوبے ہیں جہاں اسلام سے پہلے عربوں کی بڑی بڑی حکومتیں قائم تھیں، اور اس وقت بھی وہ روم و فارس دنیا کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیر سایہ تھیں، تاہم اسلام بغیر تلوار کی رفاقت کے صلح و امن کے سایہ میں اپنی آواز بلند کرتا چلا گیا، اور ہر گوشہ سے لبیک کی صدائیں خود بخود آنے لگیں،

یمن ملک عرب کے تمام صوبوں میں یمن سب سے زیادہ زرخیز اور سیر حاصل ہے، اور نہایت قدیم زمانہ سے تمدن و تجارت کا مرکز ہے، سبا اور حمیر کی عظیم الشان حکومتیں یہیں قائم ہوئی تھیں، ولادت نبوی سے تقریباً پچاس برس پہلے ۵۲۵ء میں حبشی عیسائیوں نے یمن پر قبضہ کر لیا تھا،

[۱] طبری واقعات ۹ھ

Marfat.com

ولادتِ نبویؐ کے چند سال بعد اہل ایران یہاں کے مالک بن گئے تھے۔ ان کی طرف سے یہاں ایک گورنر ہوتا تھا، جو یمن پر حکومت کرتا تھا۔

یمن میں اسلام کی تحریک کے لیے متعدد عوائق موجود تھے، مثلاً اختلاف جنسیت کہ اہل یمن قحطانی تھے۔ داعیِ اسلام اسماعیلی، اہل یمن کو اپنے قدیم جاہ و جلال اور تمدن و حکومت پر ناز تھا، اور تمام عرب بجا طور سے ان کی پیش روی کو تسلیم کرتا تھا، اور تمام عرب میں وہی حکومت کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ ملک میں جہاں کوئی باقاعدہ حکومت تھی وہ نسلاً اسی خاندان سے شمار ہوتی تھی، چنانچہ جب یمن سے قبیلہ کندہ کا وفد آیا ہے جو یمن کا ایک شاہی خاندان تھا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک عرب فرمانروا سمجھ کر رئیس وفد نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ اور ہم ہم خاندان نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا "ہم نضر بن کنانہ کے خاندان سے ہیں۔ نہ اپنی ماں پر تہمت لگا سکتے ہیں اور نہ اپنے باپ سے انکار کر سکتے ہیں[1]"۔

یمن میں اشاعت اسلام کا سب سے بڑا عائق یہ ہو سکتا تھا کہ وہ پولیٹکل حیثیت سے ایرانیوں کے ماتحت تھا اور باشندے مذہباً علی العموم یہودی یا عیسائی تھے لیکن قبولِ حق کے لیے کوئی چیز ان میں سے مانع نہ آئی۔

یمن میں اسلام کی دعوت ہجرت سے بہت پہلے پہنچ چکی تھی، یمن میں دوس ایک ممتاز قبیلہ تھا، اس قبیلہ کا رئیس طفیل بن عمرو اتفاق سے مکہ آیا، اور مسلمان ہو گیا۔ اسی زمانہ میں کندہ کا قبیلہ حج کیلئے مکہ آیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت

---

[1] ابن حنبل حدیث اشعث بن قیس وفد دائمہ ا و جلد ۱ صفحہ ۲۱۲ (مصر)

دی، لیکن انھوں نے انکار کیا، ۷ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیبر میں تشریف فرما تھے، دوس کا قبیلہ مسلمان ہو کر دار الاسلام میں منتقل ہو گیا، یمن کا ایک مشہور قبیلہ اشعر تھا وہ بھی مہاجرین حبشہ کی معیت میں اسی زمانہ میں بلا تحریک خود بخود اسلام لایا، اور آستانۂ نبوت پر حاضر ہوا، (ابوہریرہؓ دوسی اور ابو موسیٰ اشعریؓ ان ہی قبائل کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے)

یمن میں ہمدان سب سے بڑا کثیر التعداد اور صاحب اثر خاندان تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (۸ھ کے آخر میں) ان کو دعوتِ اسلام دینے کے لیے حضرت خالدؓ کو بھیجا۔ خالد چھ مہینے تک ان کو اسلام کی دعوت دیتے رہے لیکن ان لوگوں نے قبول نہیں کیا، بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خالدؓ کو بلا لیا، اور حضرت علیؓ کو بھیجا، حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو جمع کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک پڑھ کر سنایا، اور ساتھ ہی سارے کا سارا قبیلہ مسلمان تھا، حضرت علیؓ نے جب اس واقعہ کی اطلاع بارگاہِ رسالت میں دی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور سر اٹھا کر ۲ دفعہ فرمایا السلام علیٰ ہمدان۔

(۱ ابن ہشام ذکر عرض الاسلام علی القبائل) ۲ زرقانی بسند صحیح از بیہقی (اصل واقعہ بخاری جزء غزوات میں موجود ہے۔ لیکن ہمدان کی اس میں تخصیص نہیں اور نہ ان کے اسلام کا اس میں ذکر ہے) اس واقعہ کے متعلق اور بھی روایتیں ہیں، لیکن وہ صحیح نہیں، چنانچہ خود مواہب لدنیہ نے تسلیم کیا ہے، ان روایتوں کا یہ مفہوم ہے کہ ہمدان کے لوگوں نے حضرت علیؓ کے ڈر سے اسلام قبول کر لیا لیکن یہ راویوں کا حسن ظن ہے، واقعہ نہیں، (ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ہمدان کو حکم دیا کہ وہ ثقیف سے ہمیشہ لڑا کریں اور ان پر غارت گری کیا کریں لیکن حافظ ابن قیم نے تصریح کی ہے کہ یہ روایت بالکل غلط ہے، ہمدان یمن کا قبیلہ تھا، اور ثقیف مکہ کے پاس طائف میں تھے، یہ حکم تو دہسایہ قبیلوں کو دیا جا سکتا تھا)

Marfat.com

بعض روایتوں میں ہے کہ ہمدان نے جب اسلام کا غلغلہ سنا تو عامر بن شہر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا کہ یہ مذہب اگر تم کو پسند آئے تو ہم سب اس کے قبول کے لیے تیار ہیں، اور اگر ناپسندیدہ ٹھہرے تب بھی ہم تمھارے ساتھ ہیں، عامر بن شہر جب دربار رسالت سے واپس آیا تو اس کا دل نور اسلام سے معمور تھا اور ساتھ ہی سارا قبیلہ بھی مسلمان تھا، ممکن ہے کہ یہ دونوں واقعے ہوں، اور دونوں کی کوشش سے یہ کامیابی حاصل ہوئی ہو،

یمن میں حضرت علیؓ سے لوگ مانوس ہو گئے تھے، ربیع الاول سنہ ۱۰ھ میں تین سو سواروں کی حفاظت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ان کو یمن کے قبیلۂ مذحج میں تبلیغ اسلام کے لیے نامزد فرمایا، اور ساتھ ہی یہ تاکید فرمادی کہ جب تک وہ حملہ آور نہ ہوں پیش دستی نہ کرنا، حضرت علیؓ جب مذحج کی سرزمین میں پہنچے تو مال گذاری وصول کرنے کے لیے ادھر ادھر لوگوں کو متعین کیا، اسی اثنا میں قبیلۂ مذحج کی ایک جمعیت نظر آئی، حضرت علیؓ نے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی لیکن ادھر سے اس احسان کا جواب تیر اور پتھروں کی زبان سے ملا، یہ دیکھ کر حضرت علیؓ نے بھی اپنے ساتھیوں کی صف آرائی کی، مذحج اپنے بیس آدمی مقتول چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے، مسلمانوں نے ان کا تعاقب نہ کیا کہ ان کا مقصود صرف مدافعت تھا، اس کے بعد رؤسائے قبیلہ خود حاضر ہوئے اور انھوں نے اسلام قبول کیا، اور دوسروں کی طرف سے نیابۃً اسلام کا اعلان کیا۱،

۱ حضرت علیؓ کی مہم یمن کا واقعہ تمام حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے لیکن یہ تفصیل ابن سعد جزء مغازی سے ماخوذ ہے،

Marfat.com

یمن میں فارس کے جو رؤسا قیام پذیر ہوگئے تھے، ان کو ابنا کہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۱۰ھ میں وبر بن یحنس کو ان کے پاس دعوتِ اسلام کے لیے بھیجا، وہ نعمان بن بزرج (بزرگ) کے گھر ان کے مہمان ہوئے، اور فیروز دیلمی، مرکبود، وہب بن منبہ کے پاس دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجے، سب نے اسلام قبول کیا۔ صنعا میں سب سے پہلے جس نے قرآن مجید حفظ کیا وہ مرکبود کے صاحبزادے عطا اور وہب بن منبہ تھے[1]۔

(عام یمن) میں تبلیغِ اسلام کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل اور ابو موسیٰ اشعری کو نامزد فرمایا، دونوں صاحب یمن کے ایک ایک ضلع میں بھیجے گئے، چلتے وقت آپؐ نے ان لوگوں کو جو باتیں تعلیم فرمائیں وہ درحقیقت اسلامی تبلیغ کے اصول ہیں، آپ نے فرمایا "سہولت سے کام کرنا، سخت گیری نہ کرنا، لوگوں کو خوشخبری سنانا، نفرت نہ دلانا، دونوں مل کر کام کرنا، تم کو ایسے لوگ ملیں گے جو پہلے سے کوئی مذہب رکھتے ہیں جب ان کے ہاں پہنچنا تو پہلے ان کو توحید اور رسالت کی دعوت دینا، جب وہ اس کو تسلیم کرلیں تو کہنا کہ خدا نے تم پر روز و شب میں پانچ وقت کی نماز بھی فرض کی ہے، جب یہ بھی مان لیں تو ان کو سمجھانا کہ تم پر زکوٰۃ بھی واجب ہے، تم میں جو امیر ہوں ان سے لے کر جو غریب ہیں ان کو دے دی جائے گی، دیکھو جب وہ زکوٰۃ دینا منظور کرلیں تو چن کر اچھی اچھی چیزیں نہ لے لینا، مظلوموں کی بد دعا سے ڈرتے رہنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں۔" حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے پوچھا یا نبی اللہ! ہمارے ملک یمن میں جَو اور شہد

---

[1] طبری ص ۱۷۶۳ (۲ اضافہ تا بحرین)

Marfat.com

کی شراب بنتی ہے، کیا یہ بھی حرام ہے؟ آپ نے فرمایا ہر شے جو نشہ پیدا کرے حرام ہے[۱]۔)

نجران — یمن کے پاس ہی نجران کا ضلع ہے، نجران عرب میں عیسائیت کا خاص مرکز تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مغیرہ بن شعبہ کو جو صلح حدیبیہ سنہ ۶ھ سے پہلے اسلام لا چکے تھے، دعوت اسلام کے لیے نجران بھیجا۔ عیسائیوں نے قرآن پر اعتراضات شروع کیے، یہ جواب نہ دے سکے اور واپس چلے آئے[۲]۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام کا ان کو خط بھیجا جس میں تحریر تھا کہ اگر اسلام قبول نہ ہو تو اسلام کی سیاسی اطاعت قبول کرو، اور جزیہ دو[۳]، اہل نجران نے راہبوں اور مذہبی پیشواؤں کی ایک جماعت کو دریافت حال کے لیے مدینہ بھیجا، اس وفد کا تفصیلی بیان آگے آئے گا۔

نصاری کے علاوہ نجران میں مشرکین کی بھی کچھ آبادی تھی، ان میں ایک قبیلہ بنو حارث ابن زیاد تھا، جو مدان نام ایک بت کو پوجتا تھا، اور اس لیے عبد المدان کے نام سے مشہور تھا، ربیع الآخر سنہ ۱۰ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید کو وہاں دعوت اسلام کے لیے بھیجا، حضرت خالدؓ وہاں پہنچے تو سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا، حضرت خالدؓ نے یہاں تھوڑے دن قیام کیا اور قرآن اور احکام اسلام کی تعلیم دی[۴]،

اہل یمن کا بغیر کسی ترغیب و ترہیب کے خلوص دل سے قبول اسلام کوئی ایسا واقعہ نہ تھا جو خاص رحمت الٰہی کا مستوجب نہ ہو، جب اشعریوں کی آمد کی خبر ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

الیمانیین
وعائے خیر

(۱ یہ پورا واقعہ بخاری جزء مغازات میں مذکور ہے ہم نے بخاری کی مختلف روایتوں کو یکجا کر لیا ہے ۲ ترمذی تفسیر سورۂ مریم ۳ قانی بحوالہ بیہقی ۴ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۱۱۶)

Marfat.com

نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ "کل اہل یمن آتے ہیں، جو رقیق القلب اور نرم دل ہیں"[1] جب ہمدان مسلمان ہوا تو آپ نے سجدۂ شکر ادا کیا، اور ان کو سلامتی کی دعا دی[2]۔ حمیر اور تمیم کا وفد آیا تو آپ نے پہلے تمیم کی طرف خطاب کیا، تمیم بشارت قبول کرو، بنو تمیم نے کہا "یا رسول اللہ! ہم نے بشارت تو قبول کرلی کچھ عطا بھی فرمایئے"۔ آپ نے منہ پھیر لیا کہ بشارت سے بڑھ کر کیا چیز ہو سکتی تھی، پھر اہل یمن کی طرف رخ کر کے فرمایا "اے اہل یمن! تمیم نے بشارت قبول نہ کی، تم قبول کرلو" اہل یمن بے اختیار بول اٹھے "اے خدا کے رسول ہم نے قبول کیا"، پھر آپ نے عام طور سے فرمایا "ایمان یمن کا ایمان ہے اور دانائی یمن کی دانائی ہے"[3]۔

مبلغین یمن میں سے حضرت علیؓ اور ابو موسیٰؓ حجۃ الوداع کے موقع پر یمن سے واپس آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج ادا کیا، ان مبلغین کے ساتھ یمن کے بہت سے نومسلم بھی حج و زیارت کو آئے۔

بحرین میں اسلام

بحرین سنہ ۸ھ | بحرین ایران کی حدود حکومت میں داخل تھا، عرب کے قبائل وادیوں میں آباد تھے، جن میں مشہور اور با اثر خاندان عبد القیس، بکر بن وائل اور تمیم تھے، ان میں سے عبد القیس کے قبیلہ میں سے منقذ بن حبان تجارت کے لیے نکلے، راہ میں مدینہ پڑتا تھا وہاں ٹھہرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو ان کے پاس تشریف لے گئے اور اسلام کی دعوت دی، انھوں نے اسلام قبول کیا، اور سورہ فاتحہ اور اقرا سیکھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک فرمان عنایت کیا، وہ سفر سے واپس گئے تو چند روز

[1] بخاری قدوم الاشعریین واہل الیمن [2] زرقانی بحوالہ بیہقی [3] بخاری کتاب بدء الخلق و قدوم الاشعریین۔

تک کسی سے اس کا اظہار نہیں کیا، لیکن ان کی بیوی نے ان کو نماز پڑھتے دیکھا تو اپنے باپ منذر بن عائذ سے شکایت کی، انھوں نے منقذ سے دریافت کیا بحث و مباحثہ کے بعد منذر بھی مسلمان ہو گئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک لوگوں کو سنایا سب نے اسلام قبول کر لیا[1]

صحیح بخاری (کتاب الجمعہ) میں روایت ہے کہ مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلا جمعہ جس مسجد میں ادا کیا گیا وہ بحرین کی مسجد تھی، جو جواثی میں واقع ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بحرین میں ابتدائی زمانہ میں اسلام کی اشاعت ہو چکی تھی،

اسلام قبول کرنے کے بعد ان لوگوں نے چودہ شخصوں کی ایک سفارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجی، جس کے افسر منذر بن الحارث تھے، ان کا قافلہ کاشانۂ نبوت کے قریب آیا تو یہ لوگ اس قدر بیتاب ہوئے کہ سواریوں سے کود پڑے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ چومے لیکن منذر کو پاس ادب ملحوظ تھا، انھوں نے قیام گاہ پر جاکر کپڑے بدلے، پھر خدمت میں حاضر ہو کر دست بوسی کی،[2]

[1] زرقانی بحوالہ کرمانی قبیلہ عبد القیس کی ایک سفارت کا ذکر صحیح بخاری میں ہے، اور وہ اس زمانہ کے بعد کی ہے، بخاری کی روایت سے بھی اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ عبد القیس اس سفارت سے پہلے ایمان لا چکے تھے، اصابہ میں ابن شاہین سے جو روایت ہے وہ گو زرقانی کی روایت سے مختلف ہے اور رئیس سفارت کے نام میں اختلاف ہے، تاہم اس قدر روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلی سفارت چھٹی صدی ہجری سے پہلے کی ہے،

[2] (زرقانی بہ روایت بیہقی بہ سند جید)

۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علا حضرمیؓ کو تبلیغ اسلام کے لیے بحرین بھیجا، اس زمانہ میں یہاں ایران کی طرف سے منذر بن ساوی گورنر تھا، اس نے اسلام قبول کیا اور اسکے ساتھ تمام عرب اور کچھ عجم جو یہاں مقیم تھے، مسلمان ہوگئے،[1]

بحرین کے علاقہ میں "ہجر" ایک مقام ہے، یہاں ایران کی طرف سے سیبخت حاکم تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے نام بھی خط بھیجا تھا اور اس نے بھی اسلام قبول کیا،[2]

عمان میں اسلام

عمان ۸ھ اس شہر پر قبیلہ ازد کا قبضہ تھا، اور عبید و جیفر یہاں کے رئیس تھے، ۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوزید انصاری کو جو حافظ قرآن تھے اور عمرو بن العاصؓ کو دعوتِ اسلام کا خط دیکر بھیجا، دونوں رئیسوں نے اسلام قبول کیا، اور وہاں کے تمام عرب ان کی ترغیب سے اسلام لائے،[3]

حدودِ شام میں اسلام

عربِ شام ۹ھ شام کے اطراف میں جو عرب آباد تھے، ان میں متعدد ریاستیں تھیں، ان میں سے معان اور اس کے اضلاع فروۃ بن عمرو کے زیر حکومت تھے لیکن خود فروۃ رومی سلطنت کی طرف سے گویا گورنر تھے، انھوں نے اسلام سے واقفیت پیدا کی تو مسلمان ہوگئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اظہار اسلام کے ساتھ ایک خچر ہدیہ کے طور پر بھیجا، (عیسائی) رومیوں کو ان کے اسلام کا حال معلوم ہوا تو ان کو گرفتار کرکے سولی دے دی، اس وقت یہ شعر ان کی زبان پر تھا،[4]

(۱ فتوح البلدان ۲ فتوح البلدان ذکر بحرین ۳ فتوح البلدان ذکر فتح عمان) ۴ ابن ہشام اسلام فروۃ، ذکر وفود

Marfat.com

بلغ سراۃ المسلمین بانّی سلمٰ لربّی اعظمی و مقامی

(مسلمان سرداروں کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ میرا جسم اور میری عزت سب اپنے پروردگار کے نام پر نثار ہے)

(شام اور عرب کے درمیان عذرہ، بلی، جذام وغیرہ قبائل آباد تھے، قبیلہ بلی میں حضرت عمرو بن العاصؓ کا نانہال تھا، اس لیے ایک جماعت کے ساتھ ان اطراف میں بھیجے گئے، جب وہ جذام کے تالاب پر پہنچے تو ان کو حملہ کا خوف ہوا، دربار نبوت میں اطلاع کی، وہاں سے حضرت ابو عبیدہؓ کی ماتحتی میں بغرض حفاظت کچھ فوج بھیج دی گئی، اسی کو اہل سیر کی اصطلاح میں غزوۂ ذات السلاسل کہتے ہیں)

وفود عرب

(جن لوگوں نے مبلغینِ اسلام کی دعوت قبول کر لینے کے بعد خود بارگاہ نبوت میں جا کر اسلام کا اعلان کرنا چاہا، اربابِ سیر "وفود" کے عنوان سے ان کا ذکر کرتے ہیں، اس قسم کے وفود کی تعداد بہت زیادہ ہے، ابن اسحاق نے صرف پندرہ وفوہ کا حال لکھا ہے، ابن سعد میں ستر وفود کا تذکرہ ہے، دمیاطی، مغلطائی، زین الدین عراقی بھی یہی تعداد بیان کرتے ہیں، لیکن مصنف سیرت شامی نے زیادہ استقصا کیا ہے، اور ایک سو چار وفود کے حالات بہم پہنچائے ہیں، اگرچہ ان میں کہیں کہیں ضعیف روایتوں سے استناد کیا گیا ہے اور اکثر وفود کے نام مبہم ہیں، تاہم یہ مسلم ہے کہ اصل تعداد ابن اسحاق کی روایت سے کہیں زیادہ ہے، حافظ ابن قیم اور قسطلانی نے نہایت تحقیق اور احتیاط کے ساتھ ان میں سے صرف ۳۴ وفود کی تفصیل کی ہے)

اصل یہ ہے کہ تمام عرب مکہ کے فیصلہ اخیر کا انتظار کر رہا تھا، مکہ فتح ہو چکا تو یہ انتظار جاتا رہا، اب ہر قبیلہ نے چاہا کہ خود دار الاسلام میں جا کر کوئی فیصلہ کرے، اہل عرب کو یہ بات تو معلوم ہو چکی تھی کہ اب وہ اسلام کے مقابلہ میں سرکشی نہیں کر سکتے، لیکن خیبر وغیرہ کی نظیروں سے یہ بھی جانتے تھے کہ اسلام لانے پر وہ مجبور نہیں ہیں، بلکہ جزیہ یا کسی اور طریقہ سے صلح کر کے ان کی سابق حالت قائم رہ سکتی ہے،

فتح مکہ کے ساتھ ہی ہر طرف سے سفارتیں آنی شروع ہو گئیں اور بجز چند کے باقی جس قدر

سفارتیں آئیں انھوں نے بارگاہ نبوت میں پہنچکر وہ کچھ دیکھا کہ واپس آئے تو ایمان کی دولت سے مالا مال آئے۔

عرب کے سب سے طاقتور قبیلے جن کا اثر دور تک پھیلا ہوا تھا بنو تمیم، بنو سعد، بنو حنیفہ، بنو اسد، کندہ، سلاطین حمیر، ہمدان، ازد اور طے تھے، ان تمام قبائل کی سفارتیں دربار نبوت میں آئیں، ان میں سے بعض ملکی حیثیت رکھتی تھیں یعنی جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ بحیثیت فاتح کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ معاہدہ کرلیں لیکن اکثر اس غرض سے آئیں کہ اسلام کی حقیقت سے مطلع ہوکر اسکے حلقہ میں آجائیں۔ یہ وفود زیادہ تر فتح مکہ کے بعد ۸ھ و ۹ھ اور ۱۰ھ میں آئے لیکن تسلسل بیان کیلیے اس سے پہلے کے چند وفود کا تذکرہ کرنا بھی موزوں ہوگا۔

مزینہ یہ ایک بڑا قبیلہ تھا جو مضر تک پہنچکر قریش کے خاندان سے ملجاتا ہے، نعمان بن مقرن مشہور صحابی جو فتح مکہ میں قبیلہ مزینہ کے علمبردار تھے، اسی قبیلہ سے تھے، اصفہان انہی نے فتح کیا تھا، ۵ھ میں اس قبیلہ کے چار سو شخص قبیلہ کے سفیر بنکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور اسلام لائے[1]، عراقی نے سیرت منظوم میں لکھا ہے:

اول وفد وفد المدینہ — سنۃ خمس وفدوا مزینہ

سب سے پہلا وفد جو مدینہ میں آیا — وہ مزینہ کا قبیلہ تھا جو ۵ھ میں آیا

بنو تمیم بنو تمیم کے وفود بڑی شان و شوکت سے آئے، قبیلہ کے تمام بڑے بڑے رؤسا، مثلاً اقرع بن حابس، زبرقان، عمرو بن الاہتم، نعیم بن یزید سب اس سفارت میں شامل تھے۔

[1] اصابہ فی احوال الصحابہ (ترجمۂ نعمان بن مقرن و ابن اسعد جز وفود صفحہ ۳۸)

Marfat.com

عیینہ بن حصن فزاری جو مدینہ کے حدود تک حملہ آور ہوا کرتا تھا وہ بھی ساتھ تھا،

یہ لوگ اگرچہ اسلام قبول کرنے کی غرض سے آئے تھے، تاہم عربی فخر و غرور کا نشہ سر میں اب بھی باقی تھا، دربار نبوت یعنی مسجد نبویؐ میں پہنچے تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) گھر میں تشریف رکھتے تھے، آستانۂ اقدس پر جاکر پکارے کہ محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) باہر آؤ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو بولے کہ محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم اس لیے آئے ہیں کہ تم سے مفاخرہ کریں، آپ نے اجازت دی عطارد ابن حاجب جو مشہور خطیب تھا، اور جس نے نوشیروان کے دربار سے حسن تقریر کے صلہ میں کمخواب کا خلعت حاصل کیا تھا، اٹھا اور اپنی قوم کے مفاخر پر ایک پرزور تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا:۔[1]

"خدا کا شکر ہے جس کے الطاف کی بدولت ہم صاحب تاج و تخت، خزانہ ہائے گراں بہا کے مالک اور مشرق میں تمام قوموں سے معزز ترین، ہماری برابری آج کون کر سکتا ہے، ہماری ہمسرگی کا جس کو دعویٰ ہو وہ یہ خصایص اور اوصاف گنائے جو ہم نے گنائے ہیں۔"

عطارد خطبہ دے کر بیٹھ گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس کو جواب دینے کا اشارہ کیا، انھوں نے جو تقریر کی اس کا ماحصل یہ تھا:۔

"اس کی تعریف جس نے زمین و آسمان بنائے، اس نے ہم کو بادشاہت دی، اور اپنے بندوں میں سے بہترین شخص کو انتخاب کیا جو سب سے زیادہ شریف النسب، سب سے زیادہ راست گفتار، سب سے زیادہ شریف الاخلاق تھا، وہ تمام عالم کا انتخاب تھا، اس لیے خدا نے اس پر کتاب نازل کی، اس نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو سب سے پہلے مہاجرین اور ان کے بعد ہم (انصار) نے دعوت اسلام پر لبیک کہا، ہم لوگ انصار الٰہی اور وزرائے رسالت ہیں۔"

[1] اصابہ فی احوال الصحابہ

Marfat.com

تقریریں ہوچکیں تو اشعار کی باری آئی، سفارت کی طرف سے تمیم کے مشہور شاعر زبرقان ابن بدر نے قصیدہ پڑھا،

نحن الکرام فلا حی یعادلنا　　منا الملوک وفینا تنصب البیع

ہم شرفائے قوم ہیں، کوئی قبیلہ ہمارا ہمسر نہیں ہوسکتا　　ہم میں تخت نشین ہیں اور ہم کلیساؤں کے بانی ہیں

روایتوں میں آیا ہے کہ ایک شخص نے مدینہ میں آکر خطبہ دیا تو اس کی خوبیِ تقریر نے تمام حاضرین کو حیرت زدہ بنادیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ان من البیان لسحرا یعنی بعض بعض تقریروں میں جادو ہوتا ہے، اصابہ فی احوال الصحابہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زبرقان ہی کی تقریر پر یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے، غرض جب زبرقان تقریر کر چکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دربار رسالت کے شاعر یعنی حسان بن ثابت کی طرف دیکھا، انھوں نے برجستہ کہا

ان الذوائب من فہر و اخوتھم　　قد بینوا سنۃ للناس یتبعو

شرفائے قبیلۂ فہر و برادران فہر نے لوگوں کو　　وہ راستہ بتادیا ہے جس کی وہ پیروی کرتے ہیں

ارکان سفارت میں اقرع بن حابس عرب کا مشہور حکم تھا، یعنی قومی مقدمات کا مرافعہ اسکے پاس جاتا تھا، اور اس کے فیصلوں پر لوگ گردن جھکا دیتے تھے، وہ اسلام لانے سے پہلے مجوسی تھا، اس کا دعویٰ یہ تھا کہ جب سفارت کے ساتھ دربار رسالت میں آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا[1]:

ان حمدی لزین وان　　میں جس کی تعریف کردوں وہ چمک جاتا ہے

ذمی لشین　　اور جس کو برا کہدوں اس کو داغ لگ جاتا ہے

---

[1] اصابہ تذکرہ اقرع بن حابس

نظم ونثر کی معرکہ آرائی ہوچکی تو سفارت نے اعتراف کیا کہ دربار رسالت کے خطیب اور شاعر دونوں ہمارے شاعر اور خطیب سے افضل ہیں، پھر سب نے اسلام قبول کیا،

بنو سعد | بنو سعد نے ضمام بن ثعلبہ کو سفیر بنا کر بھیجا، وہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں آئے اور جس طریقہ سے سفارت ادا کی اس سے عرب کی اصلی سادگی اور آزادروی کا اندازہ ہوسکتا ہے،

صحیح بخاری میں متعدد موقعوں پر اس کا ذکر ہے، کتاب العلم کی روایت حسب ذیل ہے:

حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ ہم لوگ دربار رسالت میں حاضر تھے، ایک شخص ناقہ پر سوار آیا اور صحن مسجد میں آکر ناقہ سے اترا، پھر حاضرین سے پوچھا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کس کا نام ہے؟ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ "یہ گورے رنگ کے جو تکیہ لگائے بیٹھے ہیں"۔ پاس آکر کہا "اے عبد المطلب کے بیٹے!" آپ نے فرمایا کہ "میں جواب دیچکا" بولا کہ "میں تم سے کچھ باتیں پوچھوں گا، لیکن سختی سے پوچھوں گا، اس پر ناراض نہ ہونا"! ارشاد ہوا کہ "جو پوچھنا ہو پوچھو" بولا کہ "اپنے خدا کی قسم کھا کر کہو، کیا خدا نے تم کو تمام دنیا کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے"۔ آپ نے فرمایا "ہاں"۔ پھر قسم دلا کر پوچھا کہ "کیا تم کو خدا نے پنجوقتہ نماز کا حکم دیا ہے؟" اسی طرح زکوٰۃ، روزہ، حج کی نسبت پوچھا اور آپ برابر "ہاں" فرماتے جاتے تھے، جب سب احکام سن لیے تو کہا کہ "میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے اور مجھ کو میری قوم نے بھیجا ہے، میں جاتا ہوں اور جو تم نے بتایا ہے میں اس سے ایک ذرہ نہ زیادہ کروں گا نہ کم"۔ وہ جاچکا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ "اگر یہ سچ کہتا ہے تو اس نے فلاح پائی"۔

ضمام نے واپس جاکر اپنی قوم سے کہا کہ لات وعزیٰ کوئی چیز نہیں" لوگوں نے کہا کیا کہتے ہو

---

[1] یہ روایت صحیح بخاری میں مختلف ابواب میں منقول ہے۔

تم کو جنون یا جذام نہ ہو جائے" انھوں نے کہا خدا کی قسم وہ نہ کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر، میں تو خدا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا ہوں" ان کی مختصر تقریر کا یہ اثر تھا کہ شام نہیں ہونے پائی تھی کہ قبیلہ کا قبیلہ زن و مرد بچے سب مسلمان تھے[1]۔

اشعریین ۷ھ — یمن کا ایک نہایت معزز قبیلہ اشعریین کا تھا، ابو موسیٰ اشعریؓ اسی قبیلہ سے ہیں، ان لوگوں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر سنی تو ترپن شخصوں نے مدینہ کی ہجرت کا قصد کیا، اسی قافلہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بھی تھے یہ لوگ جہاز میں سوار ہو کر چلے، لیکن ہوائے مخالف نے جہاز کو حبش میں پہنچا دیا، وہاں حضرت جعفر طیارؓ موجود تھے، وہ اپنے ساتھ لے کر عرب کو روانہ ہوئے، اس زمانہ میں خیبر فتح ہو چکا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہیں تشریف فرما تھے، چنانچہ یہیں لوگوں نے شرف باریابی حاصل کیا،

یہ صحیح مسلم (فضائل اشعریین) کی روایت ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ جب اشعریوں کا وفد آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ تمھارے ہاں یمن کے لوگ آتے ہیں جو نہایت رقیق القلب اور نرم دل ہیں۔

مسند احمد بن حنبل میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب اشاعرہ کا وفد آیا تو یہ لوگ جوش مسرت سے یہ رجز پڑھتے تھے۔

غدا نلقی الاحبۃ — محمدا وحزبہ

(کل ہم دوستوں سے ملیں گے — محمدؐ اور پیروانِ محمدؐ سے)

(بارگاہ نبوت میں پہنچے تو عرض کی یا رسول اللہ! ہم اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ اپنے

[1] ابن ہشام

Marfat.com

مذہب کے کچھ احکام سیکھیں اور ابتدائے کائنات کے کچھ حالات پوچھیں، آپ نے فرمایا "پہلے خدا تھا اور کچھ نہ تھا، اس کا تخت پانی پر تھا[۱]"

دوس ۷ھ | دوس عرب کا ایک مشہور قبیلہ ہے حضرت ابوہریرہؓ اسی قبیلہ سے ہیں، اس قبیلہ کے مشہور شاعر اور رئیس طفیل بن عمرو تھے، وہ ہجرت سے پہلے مکہ گئے، قریش نے ان کو منع کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ جائیں لیکن اتفاقاً ایک دفعہ یہ حرم میں گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے، قرآن مجید سنکر متاثر ہوئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ آپ مجھکو اسلام کی حقیقت سمجھائیں، آپنے اسلام کی تبلیغ کی اور قرآن کی آیتیں سنائیں وہ نہایت خلوص سے اسلام لائے، وطن جاکر لوگوں کو اسلام کی دعوت دی لیکن ان کے قبیلہ میں زنا کا بہت رواج تھا، لوگ سمجھے کہ اسلام کے بعد اس آزادی سے محروم ہو جائیں گے، اس لیے لوگوں نے تامل کیا طفیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر یہ حقیقت بیان کی، آپنے دعا فرمائی کہ "خدایا! دوس کو ہدایت دے" پھر طفیل سے ارشاد فرمایا کہ جاکر نرمی اور ملاطفت سے لوگوں کو اسلام کی دعوت دو، غرض (دعائے نبوی کی برکت اور) طفیل کی ترغیب و ہدایت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا، اور اسی خاندان جن میں ابوہریرہؓ بھی تھے ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے[۲]،

بنو حرث بن کعب ۹ھ | یہ نجران کا ایک نہایت معزز خاندان تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو ان کے پاس دعوت اسلام کے لیے بھیجا، یہ لوگ نہایت خلوص کے ساتھ اسلام لائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو مدینہ میں بلا بھیجا، چنانچہ قیس بن الحصین و یزید بن عبدالمدان وغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

[۱] صحیح بخاری باب بدء الخلق [۲] اصابہ اور زاد المعاد اور ابن سعد جزو وفود

Marfat.com

کی خدمت میں حاضر ہوئے، چونکہ اکثر معرکوں میں قبائل عرب پر غالب رہے تھے، آپ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے غلبہ کے اسباب کیا تھے۔ بولے ہم ہمیشہ متفق ہو کر لڑتے تھے اور کسی پر ظلم نہیں کرتے تھے۔ آپ نے قیس کو ان کا رئیس مقرر کیا۔[1]

قبیلہ طے ۹ھ یمن میں طے نہایت نامور قبیلہ تھا، اس قبیلہ کے رؤسا زید الخیل وعدی بن حاتم طائی تھے، اور ان کے حدود حکومت الگ تھے۔

زید زمانۂ جاہلیت کے مشہور شاعر، خطیب، خوش جمال، فیاض، بہادر تھے، ۹ھ میں یہ چند معزز اشخاص کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی، انھوں نے مع اپنے ساتھیوں کے نہایت صدق دل سے اسلام قبول کیا، شہسواری کی وجہ سے یہ زید الخیل کے لقب سے مشہور تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لقب کو زید الخیر سے بدل دیا۔[2]

عدی بن حاتم ۹ھ عدی مشہور حاتم طائی کے بیٹے اور قبیلۂ طے کے (سردار اور مذہباً عیسائی تھے) سلاطین عرب کی طرح ان کو بھی آمدنی کا چوتھا حصہ ملتا تھا، جس زمانہ میں اسلامی فوجیں یمن گئیں، یہ بھاگ کر شام چلے گئے، ان کی بہن گرفتار ہو کر مدینہ آئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بڑی عزت وحرمت سے رخصت کیا، وہ اپنے بھائی کے پاس گئیں اور کہا کہ جس قدر جلد ہو سکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو، وہ پیغمبر ہوں یا بادشاہ ہر حال میں ان کے پاس جانا مفید ہے، غرض عدی مدینہ آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے، عدی نے مسجد میں جا کر سلام کیا، آپ نے جواب سلام کے بعد نام پوچھا، پھر ان کو لیکر گھر کی طرف چلے، اسی اثنا میں ایک بڑھیا آگئی، اس نے

[1] اصابہ، وزاد المعاد [2] ایضاً

آپ کو روک لیا، اور دیر تک آپ سے کسی کام کے متعلق باتیں کرتی رہی، عدی خود رئیس تھے، شام میں رومیوں کا دربار دیکھا تھا، ان کو حیرت ہوئی کہ شہنشاہِ عرب ایک بڑھیا کے ساتھ اس مساوات سے پیش آتا ہے، اسی وقت ان کو خیال ہوا کہ یہ شخص بادشاہ نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے، چمڑے کا ایک گدا تھا، اس کو عدی کی طرف بڑھایا، یہ اصرار کے بعد اس پر بیٹھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیوں عدی! تم اپنی قوم سے مرباع لیتے تھے لیکن یہ تو تمھارے مذہب (نصرانیت) میں جائز نہیں ہے"[1]

پھر فرمایا کہ خدا کے سوا کوئی اور خدا ہے؟ بولے نہیں! پھر پوچھا کہ خدا سے کوئی بڑا ہے؟ بولے کہ نہیں، آپ نے فرمایا کہ "یہودیوں پر خدا کا غضب نازل ہوا ہے، اور عیسائی گمراہ ہو گئے ہیں"[2]

غرض عدی نے اسلام قبول کیا، اور اس قدر ثابت قدم رہے کہ ردہ کے زمانہ میں بھی ان پر کچھ اثر نہیں پڑا،

باپ کی سخاوت کا اثر ان پر بھی تھا، ایک دفعہ ایک شخص نے ان سے سو روپیہ طلب کیے، بولے کہ تم حاتم کے بیٹے سے اس قدر حقیر رقم مانگتے ہو، بخدا ہرگز نہ دوں گا۔[3]

وفد ثقیف | (یادہ ہوگا) جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف کا محاصرہ چھوڑ کر روانہ ہونے لگے تو صحابہؓ نے عرض کی تھی کہ آپ ان کے حق میں بد دعا فرمائیں، آپ نے جن لفظوں میں دعا فرمائی تھی یہ تھی

اللھم اھد ثقیفا وائت بھم — اے خدا ثقیف کو ہدایت دے اور ان کو میرے پاس بھیج،

(یہ دعا کرشمۂ ربانی کا ایک اعجاز تھی، وہ قبیلہ جو تلوار سے زیر نہ ہوا، صداقت کے جلال نے آستانۂ اسلام پر اس کی گردن جھکا دی)

---

[1] ابن ہشام اسلام عدی بن حاتم [2] مسند امام احمد حدیث عدی، ترمذی تفسیر فاتحہ [3] اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر عدی،

طائف دو رئیسوں کے قبضہ میں تھا جن میں ایک عروہ بن مسعود تھے جن کی نسبت کفار مکہ کہا کرتے تھے کہ کلام الٰہی اترتا تو ان پر اترتا، عروہ اگرچہ ابتک اسلام نہیں لائے تھے لیکن مادۂ قابل رکھتے تھے، حدیبیہ کی صلح بھی ان ہی کی سفارت سے انجام پائی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب طائف سے واپس چلے تو خدا نے ان کو اسلام کی توفیق دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ نہیں پہنچنے پائے تھے کہ وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اسلام لاکر واپس گئے، واپس جاکر انھوں نے اسلام کا اظہار کیا اور لوگوں کو اسلام کی ترغیب دی، لوگوں نے ان کو بہت برا بھلا کہا، صبح کو جب اپنے بالاخانہ پر اذان دی تو ہر طرف سے تیروں کا مینھ برسا، یہانتک کہ وہ شہید ہوگئے، مرتے وقت وصیت کی کہ محاصرۂ طائف میں جو مسلمان شہید ہو چکے ہیں ان ہی کے پہلو میں دفن کیے جائیں،

(عروہ کا خون رائگاں نہیں جا سکتا تھا، صخر بن عیلہ رئیس احمس یہ سن کر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں، کچھ سوار لیکر چل کھڑا ہوا تھا، اتفاق سے اسوقت پہنچا، جب آپ طائف چھوڑ کر مدینہ کی طرف مراجعت فرما چکے تھے، صخر نے عہد کیا کہ جب تک اہل طائف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ قبول کرلیں گے میں قلعہ کا محاصرہ نہ چھوڑوں گا، آخر اہل طائف نے اطاعت قبول کرلی، صخر نے خدمت نبوی میں اطلاع کی تو آپ نے مسجد نبوی میں تمام لوگوں کو جمع کیا اور احمس کے لیے دس بار دعا فرمائی)[1] چند روز کے بعد اہل طائف نے باہم مشورہ کیا کہ تمام عرب اسلام لاچکا، اب ہم اکیلے کیا کر سکتے ہیں، غرض یہ رائے قرار پائی کہ چند سفیر مقرر کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجے جائیں۔

---

[1] (ابوداؤد باب اقطاع الارضین)

ان کی سفارت نے مدینہ کا رخ کیا تو مسلمانوں کو اس قدر مسرت ہوئی کہ سب سے پہلے مغیرہ بن شعبہ دوڑے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جاکر خبر کریں، راہ میں حضرت ابوبکرؓ مل گئے، ان کو معلوم ہوا تو مغیرہ کو قسم دلائی کہ یہ خوشخبری مجھ کو پہنچانے دو،

مغیرہ نے ان لوگوں کو تعلیم دی کہ دربار رسالت میں جانا تو اس طریقہ سے سلام عرض کرنا، لیکن یہ لوگ اسی قدیم دستور کے موافق آداب بجا لائے،

عبد یالیل طائف کا مشہور رئیس امیر الوفد تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو (حالانکہ اب تک وہ کافر تھا) مسجد نبوی میں اتارا (کہ مسلمانوں کی محویت واستغراق کو دیکھ کر متاثر ہو[1])

یہ لوگ صحن مسجد میں خیمے نصب کرا کر ٹھہرائے گئے، نماز اور خطبہ کے وقت یہ لوگ موجود رہتے تھے گو خود شریک نہیں ہوتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ خطبہ میں اپنا نام نہیں لیتے تھے، ان لوگوں نے آپس میں تذکرہ کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے تو اپنی پیغمبری کا اقرار لیتے ہیں لیکن خطبہ میں خود اپنی پیغمبری کا اقرار نہیں کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ "میں سب سے پہلے شہادت دیتا ہوں کہ میں فرستادۂ الٰہی ہوں"

جماعت سفراء میں عثمان بن ابی العاص سب سے کم عمر تھے، سفراء دربار نبوی میں آتے تو ان کو بچہ سمجھ کر قیام گاہ میں چھوڑ آتے، عثمان گو کمسن تھے لیکن سب سے زیادہ تیز فہم اور رسائی تحقیق تھے، ان کا معمول تھا کہ جب سفراء دن کو قیلولہ کرتے تو یہ چپکے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور قرآن مجید اور مسائل اسلام سیکھتے، یہاں تک کہ اکثر ضروری مسائل سیکھ لیے،

[1] ابوداؤد، باب ما جاء فی خبر الطائف

Marfat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ان لوگوں کو اسلام کی تبلیغ کرتے (نماز عشا کے بعد انکے پاس تشریف لیجاتے اور کھڑے کھڑے ان سے باتیں کرتے، زیادہ تر یہ کہ قریش کے ہاتھ سے جو اذیتیں اٹھائی تھیں ان کو بیان فرماتے، مدینہ میں جو لڑائیاں پیش آئیں ان کا بھی تذکرہ فرماتے) بالآخر ان لوگوں نے اسلام پر آمادگی ظاہر کی لیکن یہ شرطیں پیش کیں،

۱۔ زنا ہمارے لیے جائز رکھا جائے، کیونکہ ہم میں سے اکثر مجرد رہتے ہیں اور اس لیے انکو اس سے چارہ نہیں،

۲۔ ہماری قوم کا تمام کاروبار اور ذریعۂ معاش سود ہے، اسلیے سودخواری جائز رکھی جائے،

۳۔ شراب سے نہ روکا جائے، ہمارے شہر میں کثرت سے انگور پیدا ہوتا ہے اور یہ ہماری بڑی تجارت ہے،

لیکن یہ تینوں درخواستیں نامنظور ہوئیں، بالآخر ان لوگوں نے کہا اچھا ہم یہ شرطیں واپس لیتے ہیں لیکن ہمارے معبود (طائف کا سب سے بڑا بت جس کا نام لات تھا) کی نسبت کیا ارشاد ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ توڑ دیا جائے گا، یہ سن کر ان کو سخت حیرت ہوئی کہ کیا کوئی شخص انکے خدائے اعظم کو ہاتھ بھی لگا سکتا ہے! بولے کہ اگر ہمارے معبود کو معلوم ہوجائے کہ آپ کا یہ ارادہ ہے تو وہ تمام شہر کو تباہ کردے گا، حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہوسکا، بولے کہ تم لوگ کس قدر جاہل ہو، منات صرف ایک پتھر ہے، ان لوگوں نے کہا عمر! ہم تمہارے پاس نہیں آئے، یہ کہکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ ہم منات کو ہاتھ نہیں لگا سکتے، آپ جو چاہیں کریں لیکن

ؒ (ابوداؤد باب تحزیب القرآن)

Marfat.com

ہم کو اس جرأت سے معاف رکھا جائے، آپ نے یہ درخواست منظور کرلی،[1]

ان لوگوں نے نماز، زکوٰۃ اور جہاد سے مستثنیٰ ہونے کی بھی درخواست کی، نماز سے معافی تو کسی حالت میں ممکن نہ تھی، وہ ہر روز پانچ دفعہ ادا کرنے کی چیز ہے، لیکن زکوٰۃ سال بھر کے بعد واجب ہوتی ہے، اور جہاد فرض کفایہ ہے، ہر شخص پر واجب نہیں، اور واجب بھی ہو تو اس کے خاص مواقع ہیں روز کا کام نہیں، اس بنا پر اس وقت ان دونوں باتوں پر ان کو مجبور نہیں کیا گیا، کیونکہ یہ معلوم تھا کہ جب وہ اسلام قبول کرلیں گے تو رفتہ رفتہ خود ان میں صلاحیت آجائے گی، حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے اس واقعہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا کہ جب یہ ایمان لاچکیں گے تو زکوٰۃ بھی دینے لگیں گے اور جہاد بھی کریں گے،[2] (چنانچہ دو ہی برس کے بعد حجۃ الوداع کا موقع آیا، تو کوئی ثقفی ایسا نہ تھا جس نے اسلام نہ قبول کرلیا ہو[3])

سفارت جب واپس چلی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان اور مغیرہ بن شعبہ کو بھیجا کہ شرط کے موافق طائف کے صنم اعظم (لات) کو جا کر توڑ آئیں مغیرہ نے طائف پہنچکر بتکدہ کو ڈھانا چاہا تو مستورات روتی ہوئی ننگے سر گھروں سے نکل آئیں اور یہ اشعار پڑھتی جاتی تھیں،[4]

الا ابکین دفاع	(لوگوں پر رو کہ پست ہمتوں نے
اسلمها الرضاع	اپنے بتوں کو دشمنوں کے سپرد
لم یحسنوا المصاع	کر دیا، اور معرکہ آرائی نہ کر سکے)

[1] زاد المعاد، بحوالہ مغازی موسیٰ بن عقبہ [2] ابوداؤد کتاب الخراج والامارۃ باب ما جاء فی خبر الطائف

[3] اصابہ ترجمہ جبیر بن حیہ ثقفی [4] تاریخ طبری،

دعربوں میں کثیرالازدواجی کی عام عادت تھی۔ قبیلہ ثقیف کے ایک نامور سردار غیلان بن سلمہ کی دس بیویاں تھیں، جب وہ مسلمان ہوا، احکام اسلام کے مطابق چار کے سوا تمام بیویوں سے اس کو مفارقت کرنا پڑی[1])

وفد نجران ۹ھ | نجران مکہ معظمہ سے یمن کی طرف سات منزل پر ایک وسیع ضلع کا نام ہے، جہاں عیسائی عرب آباد تھے، یہاں عیسائیوں کا ایک عظیم الشان کلیسا تھا جس کو وہ کعبہ کہتے تھے اور حرم کعبہ کا جواب سمجھتے تھے۔ اس میں بڑے بڑے مذہبی پیشوا رہتے تھے، جن کا لقب سید اور عاقب تھا، عرب میں عیسائیوں کا کوئی مذہبی مرکز اس کا ہمسر نہ تھا، اعشی اسی کی شان میں کہتا ہے

وکعبة نجران حتم علیك   حتی تناخی بابوابها

نزور یزید او عبد المسیح   وقیسا هم خیر اربابها

یہ کعبہ تین سو کھالوں سے گنبد کی شکل میں بنایا گیا تھا، جو شخص اس کے حدود میں آجاتا تھا وہ مامون ہو جاتا تھا، اس کعبہ کے اوقاف کی آمدنی دو لاکھ سالانہ تھی[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دعوت اسلام کا خط لکھا تو اس کعبہ کے محافظ اور ائمہ مذہب ساٹھ آدمیوں کے ساتھ مدینہ میں آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مسجد میں اتارا، تھوڑی دیر کے بعد نماز کا وقت آیا تو ان لوگوں نے نماز پڑھنی چاہی صحابہ نے روکا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پڑھنے دو چنانچہ ان لوگوں نے مشرق کیطرف منھ کرکے نماز ادا کی، ابوحارثہ جو لاٹ بشپ تھا، نہایت محترم اور فاضل شخص تھا، قیصر روم نے اس کو منصب عطا کیا تھا، وہ اس کیلئے گرجے

---

[1] جامع ترمذی و ابوداؤد کتاب النکاح) [2] یہ تمام تفصیل معجم البلدان میں ہے پہلا فقرہ فتح الباری سے اقتباس ہے جہاں وفد نجران کا ذکر ہے

اور مسجد بنوائے تھے،[1]

ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف مسائل پوچھے، اور آپ نے وحی کی رو سے ان کا جواب دیا،

ان کے زمانۂ قیام میں سورہ آل عمران کی ابتدا کی اسی آیتیں اتریں، ان آیتوں میں ان کے سوالات کا جواب تھا، جس آیت میں دعوتِ اسلام کی تشریح تھی وہ یہ ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ	کہدے کہ اے اہل کتاب! و ایک ایسی بات کو
سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ	مان لیں جو ہم تم دونوں میں مشترک ہے، وہ یہ کہ
اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا	ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو خدا
وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا	کا شریک نہ بنائیں اور ہم میں کوئی کسی کو خدا
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا	کے سوا رب نہ قرار دے، پھر اگر یہ لوگ نہ مانیں تو
اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (آل عمران)	کہدو کہ تم گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو اسلام کی دعوت دی تو ان لوگوں نے کہا، ہم تو پہلے سے مسلمان ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک تم صلیب پوجتے ہو، عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہو، کیونکر مسلمان ہو سکتے ہو؟ جب یہ لوگ اس پر راضی نہ ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے مطابق ان سے کہدیا کہ اچھا مباہلہ کرو، یعنی ہم تم دونوں اپنے اہل و عیال کو لے کر آئیں اور دعا کریں کہ جو شخص جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو،

---

[1] زاد المعاد ابن قیم

Marfat.com

مِمَّنْ حَاجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ	تو جو شخص تجھ سے علم آنے کے پیچھے جھگڑا کرتا ہے اس سے
مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ	کہدے کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور
اَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا	خود اپنے آپ کو بلائیں، پھر مباہلہ کریں اور خدا
وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ	سے دعا کریں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو اس پر
اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (آل عمران)	خدا کی لعنت ہو،

لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ زہرا اور امام حسن و حسین علیہما السلام کو لیکر مباہلہ کے لیے نکلے تو خود ان کی جماعت میں سے ایک شخص نے رائے دی کہ مباہلہ نہیں کرنا چاہیے، اگر یہ شخص واقعی پیغمبر ہے تو ہم لوگ ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائیں گے، غرض ان لوگوں نے کچھ سالانہ خراج قبول کر کے صلح کر لی،

بنو اسد ۹ھ یہ وہ قبیلہ ہے جو لڑائیوں میں قریش کا دست و بازو تھا، طلیحہ بن خویلد جس نے حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں نبوت کا دعوی کیا تھا، اسی قبیلہ سے تھا، ۹ھ میں یہ لوگ بھی اسلام لائے اور سفارت بھیجی لیکن اب تک ان کے دماغ میں فخر کا نشہ باقی تھا، سفراء دربار رسالت میں آئے تو احسان کے لہجہ میں کہا کہ آپ نے ہمارے پاس کوئی مہم نہیں بھیجی بلکہ ہم نے خود اسلام قبول کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا	یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ ہم اسلام لائے
عَلَىَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ	کہدو کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو،
هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (حجرات)	بلکہ خدا تم پر احسان کرتا ہے کہ تم کو ایمان لانے کی

Marfat.com

بنو فزارہ ۹ھ یہ نہایت سرکش اور زور آور قبیلہ تھا، عیینہ بن حصن اسی قبیلہ سے تھے، اس قبیلہ نے رمضان ۹ھ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے، اپنا وفد بھیجا اور اسلام قبول کیا[1]،

کندہ ۱۰ھ یہ حضرموت (یمن) کے اضلاع میں سے ایک شہر تھا، یہاں کندی خاندان کی سلطنت تھی، اس زمانہ میں اس خاندان کے حاکم اشعث بن قیس تھے، یہ ۱۰ھ میں اسی سوار کے ساتھ بڑی شان و شوکت سے، حیرۃ کی چادریں جن کے سنجاف کے حریر تھے، کاندھوں پر ڈالے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے، یہ پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھکر فرمایا کیا تم اسلام نہیں لا چکے ہو؟ بولے "ہاں" آپ نے فرمایا کہ پھر یہ حریر کیسا؟" ان لوگوں نے فوراً چادریں پھاڑ کر زمین پر ڈال دیں[2]،

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں اپنی بہن ام فروۃ سے ان کی شادی کر دی تھی، نکاح ہو چکا تو فوراً اٹھ کر اونٹوں کے بازار میں پہنچے، اور جو اونٹ سامنے آیا تلوار سے ان کی کوچیں اڑا دیں، تھوڑی دیر میں بیسوں اونٹ زمین پر پڑے تھے، لوگوں کو حیرت ہوئی، انہوں نے کہا، میں اپنی دار الریاست میں ہوتا تو اور ہی سر و سامان ہوتا، یہ کہکر اونٹوں کے دام دیدیے اور لوگوں سے کہا یہ آپ کی دعوت ہے[3]،

یہ جنگ قادسیہ و یرموک میں شریک تھے، اور صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے،

عبد القیس یہ قبیلہ جیسا کہ اوپر گذر چکا، بحرین کا باشندہ تھا، یہاں اسلام کا اثر بہت پہلے پہنچ چکا تھا، سب سے

---

[1] زرقانی [2] ابن ہشام ذکر کندہ، [3] اصابہ

Marfat.com

پہلے اس قبیلہ کے تیرہ آدمی ۵ھ میں یا اس سے آگے پیچھے زمانہ میں خدمت نبویؐ میں حاضر ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم کون لوگ ہو؟ عرض کی یا رسول اللہ! ہم خاندان ربیعہ سے ہیں، فرمایا "مرحبا لاخزایا ولا ندامی" پھران لوگوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہمارا ملک بہت دور ہے (بحرین) اور بیچ میں کفار مضر کی آبادیاں ہیں، ہم اشہر حرم کے سوا اور مہینوں میں نہیں آسکتے، چند ایسی باتیں تلقین فرمایئے جن پر ہمیشہ عمل کریں، اور اپنے اہل وطن کو بھی انکی تعلیم دیں، ارشاد ہوا کہ میں تم کو چار باتوں کا حکم دیتا ہوں، خدا کو ایک جانو، نماز پڑھو، روزہ رکھو اور خمس دو، اور چار چیزوں سے منع کرتا ہوں، دبا، حنتم، نقیر، مزفت،

دُبا، حنتم، نقیر، مزفت، یہ عرب میں چار قسم کے برتن ہوتے تھے، جن میں رکھ کر شراب بنائی جاتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریف یہ جاری تھی کہ جس قبیلہ میں جو مخصوص عیوب ہوتے تھے، ان کے پند و موعظت میں ان ہی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرماتے تھے، لوگوں کو تعجب تھا کہ حضورؐ نے ان ظروف کا کیوں مخصوص طور سے ذکر فرمایا، چنانچہ انھوں نے پوچھا کہ "یا رسول اللہ! نقیر کے متعلق آپ کو کیا معلوم ہے؟" ارشاد فرمایا "ہاں کھجور کی موٹی لکڑی کو اندر سے کھود کے تم اس میں پانی ڈالتے ہو، جب ابال کم ہو جاتا ہے تو اس کو پی کر اپنے بھائیوں پر تلوار چلاتے ہو۔" اتفاق یہ کہ وفد میں ایک صاحب ایسے تھے جن پر یہی واقعہ گذرا تھا، ان کی پیشانی پر تلوار کا داغ بھی تھا، اس کو وہ شرم سے چھپائے تھے۔[۱]

بعض روایتوں میں ہے کہ عبد القیس نے خود پوچھا کہ یا رسول اللہ! ہم کو کیا پینا چاہیے؟

---

[۱] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب الایمان [۲] صحیح مسلم باب الایمان

Marfat.com

اس کے جواب میں آپ نے ان چاروں چیزوں کا ذکر فرمایا۔[1]

بنو عامر سنہ ۹ھ بنو عامر کا قبیلہ عرب کے مشہور قبیلہ قیس عیلان کی شاخ تھا، بنو عامر میں اس وقت تین رئیس تھے، عامر بن طفیل، اربد بن قیس اور جبار بن سلمیٰ۔ عامر اور اربد صرف حصولِ جاہ کے خواہاں تھے، یہ عامر وہی شخص تھا، جو اس سے پہلے متعدد فتنوں کا باعث ہو چکا تھا، اور اس وقت بھی شر کی نیت سے آیا تھا، جبار اور قبیلہ کے عام لوگ خلوصِ قلب سے صداقت کے طالب تھے،

عامر مدینہ پہنچکر خاندان سلول کی ایک خاتون کا مہمان ہوا، جبار اور مشہور صحابی کعبؓ بن مالک میں پہلے کے مراسم تھے، اس لیے وہ تیرہ آدمیوں کے ساتھ ان ہی کے گھر مہمان اترے، اور اسی تقریب سے کعبؓ ان کو لیکر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، بنو عامر نے سلسلۂ کلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کر کے کہا "انت سیدنا" حضور ہمارے آقا ہیں، آپ نے فرمایا "السید اللہ" آقا خدا ہے، انھوں نے پھر عرض کی حضور ہم میں سب سے افضل اور سب سے بڑھکر فیاض ہیں، ارشاد ہوا بات بولو تو اس کا لحاظ رہے کہ شیطان تم کو بہکا نہ لیجائے، یعنی یہ تکلف اور تملق بھی ایک قسم کا جھوٹ ہے۔[2]

عامر بن طفیل نے کہا محمدؐ! تین باتیں ہیں، اہل بادیہ پر تم حکومت کرو، اور شہر میرے قبضہ

---

[1] مسلم اور دیگر کتبِ صحاح میں عبد القیس کے اسی وفد کا ذکر ہے، ابن مندہ و دولابی وغیرہ نے اس قبیلہ کے ایک اور وفد کا ذکر کیا ہے جس میں ۴۰ آدمی شریک تھے، اس بنا پر علامہ قسطلانی نے اسی قبیلہ کے دو وفد قرار دیے ہیں، پہلا تقریباً ۵ھ میں اور دوسرا ۸ھ میں، حافظ ابن حجر نے کتاب المغازی میں بعینہ یہی تحقیق کی ہے، لیکن کتاب الایمان کی شرح میں دونوں روایتوں کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے [2] اصابہ [3] مشکوٰۃ باب المفاخرہ بحوالہ ابوداؤد،

Marfat.com

ہوں، اگر یہ نہیں تو اپنے بعد مجھے اپنا جانشین بنا جاؤ، اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو میں غطفان کو لیکر چڑھ آؤں گا۔" عامر نے اربد کو یہ سمجھا دیا تھا کہ میں ادھر محمدؐ کو باتوں میں لگاؤں گا، ادھر تم ان کا کام تمام کر دینا، اب عامر نے جو دیکھا تو اربد میں جنبش تک نہ تھی، نبوت کے غیر مرئی جاہ و جلال نے اسکی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں، دونوں اٹھ کر چلے آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خدایا ان کے شر سے بچانا" عامر کو طاعون ہو گیا، عرب میں صاحبِ فراش ہونا شرم کی بات تھی، عامر نے کہا مجھے گھوڑے پر بٹھا دو، گھوڑے پر بٹھا دیا گیا، اور اسی پر اس نے دم توڑا،

جبار اور عامر اشخاص ایمان کی دولت سے مالا مال ہو کر دار الاسلام سے واپس آئے[1]

حمیر وغیرہ کی سفارت

حمیر میں مستقل سلطنت نہیں رہی تھی، سلاطین حمیر کی اولاد نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لی تھیں، اور برائے نام بادشاہ کہلاتے تھے، عربی میں ان کا لقب قیل تھا، یہ لوگ خود نہیں آئے، لیکن قاصد بھیجے کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے،

اسی زمانہ میں بہرا، بنو بکا، وغیرہ کی سفارتیں بھی آئیں،

---

[1] عام واقعات ابن اسحاق وزرقانی سے ماخوذ ہیں، عامر کی تقریر اور اس کی موت کا واقعہ صحیح بخاری میں مذکور ہے)

Marfat.com

تاسیس حکومت الٰہی

استخلاف فی الارض

لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ

دیرہ و تار راتوں کے بعد سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے، گھنگھور گھٹائیں جب چھٹ جاتی ہیں تو خورشید تاباں ضیا گستری کرتا ہے، دنیا گنہگاریوں اور ظلم و ستم کی تاریکیوں سے گھری ہوئی تھی کہ دفعۃً صبحِ سعادت نے ظہور کیا۔ اور حق و صداقت کا آفتاب پرتو افگن ہوا، عرب جس طرح ایک خدا کو پوجنے لگا تھا، اب وہ صرف ایک ہی حکومت کے ماتحت تھا،

خدائے پاک نے وعدہ فرمایا تھا،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا	خدا نے تم میں سے ایمانداروں اور نیکوکاروں سے وعدہ
الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ	کیا ہے کہ ان کو بے شبہ زمین میں اپنی خلافت اسی طرح
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ	عطا کریگا جس طرح کہ گزشتہ امتوں کو اس نے اپنی خلافت
لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى	عطا کی تھی، اور ان کے اس مذہب کو جسکو اس نے ان کیلئے
لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ	پسند کیا ہے یقیناً قوت بخشے گا، اور انکی بے امنی کو امن سے
اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ع	بدل دیگا کہ مجھکو پوجیں اور کسی کو میرا شریک نہ بنائیں،

یہ پورا باب اضافہ ہے

حکومت الٰہی و استخلاف فی الارض نبوت کے ضروری لوازم نہیں لیکن جب دعوتِ الٰہی سیاستِ ملکی کی دیواروں سے آکر ٹکراتی ہے، یا جب اصلاحات کا دامن ملک کی بدامنی و انتشار حال کے کانٹوں میں الجھ جاتا ہے، تو پیغمبر ابراہیمؑ[1] اور موسیٰؑ کے قالب میں آگے بڑھتا ہے اور قوم و ملک کو نمرودوں و فراعنہ کی غلامی سے آزادی دلاتا ہے، پیغمبروں میں عیسیٰؑ اور یحییٰؑ بھی گزرے ہیں جن کو حکومت کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا، اور موسیٰؑ اور داؤدؑ و سلیمانؑ بھی، جو قوموں اور ملکوں کی قسمت کے مالک تھے لیکن محمدؐ رسول اللہ عیسیٰ و یحییٰ بھی تھے اور موسیٰ و داؤد بھی، عرب کے خزانے دستِ تصرف میں تھے لیکن کاشانۂ نبوت میں نہ کوئی نرم بستر تھا، نہ غذائے لطیف، نہ جسم مبارک پر خلعتِ شاہانہ تھا، نہ جیبِ آستین میں درہم و دینار، عین اس وقت جب اس پر کسریٰ و قیصر کا دھوکا ہوتا تھا، وہ گلیم پوش، مکہ کا یتیم اور آسمان کا معصوم فرشتہ نظر آتا تھا،

اسلام کی حکومت کی غرض و غایت جس کو خدا نے خود اپنے الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے یہ تھی،

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا
وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ الَّذِیْنَ
اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ
یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ
النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ
صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْ کَرُ

مسلمان جن سے (بلا سبب) جنگ کیجاتی ہے اب انکو
بھی جنگ کی اجازت دیگئی کہ وہ مظلوم ہیں، اور خدا
انکی مدد پر قادر ہے، وہ جو ناحق اپنے گھروں سے نکالدیے گئے،
سوا اس کے انکا اور کوئی قصور نہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ
ہمارا پروردگار ہی ہمارا خدا ہے، اگر دنیا میں ایک قوم
کو دوسری قوم سے بچایا نہ جائے تو بہت سی خانقاہیں

---

[1] حضرت ابراہیمؑ اپنے قبیلہ کے شیخ تھے، چار سو غلاموں کی فوج ساتھ رہتی تھی، شام و اطراف بابل کے کئی بادشاہوں سے انکو لڑنا پڑا، اور خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ ان کی اولاد کو ارض مقدس کی حکومت کریگا، (توراۃ سفر تکوین)

فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ	کلیسے، عبادتگاہیں، مسجدیں جن میں اکثر خدا کا نام لیا
اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ	جاتا ہے برباد کر دیجائیں، جو خدا کی مدد کرتا ہے خدا اسکی مدد کرتا
عَزِيزٌ الَّذِينَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ	ہے، خدا طاقتور اور غالب ہے، مسلمان وہ ہیں
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ	جنکو اگر خدا زمین میں قوت عطا کرے تو عبادت الٰہی
اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ	کریں، مستحقین کی مالی اعانت کریں (زکوٰۃ) لوگوں کو
وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (سورۂ حج)	نیکیوں کی تاکید کریں، برائیوں سے روکیں، انجام کار خدا کے ہاتھ ہے

ان آیتوں میں بالاجمال یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں غزوات کی ابتدا کیوں اور کیونکر ہوئی؟ اسلام کی حکومت کے کیا اغراض و مقاصد تھے، اور استخلاف فی الارض کے کیا فرائض ہیں؟ اور دنیا کی عام حکومتوں سے وہ کن امور میں ممتاز ہے؟ ان مباحث کا اصولی اور مفصل بیان کتاب کے دوسرے حصوں میں آئیگا، یہاں عرب کے نظم و نسق کے متعلق عام اور جزئی باتیں بیان کرنی منظور ہیں۔

صفحات بالا سے معلوم ہو چکا ہے کہ اب تمام عرب میں امن و امان قائم ہے، سیاسی مشکلات کا خاتمہ ہو چکا ہے، ملک کے ہر گوشہ میں دعاۃ اسلام پھیلے ہوئے ہیں، قبائل دور دراز صوبوں سے بارگاہ نبوت کا رخ کر رہے ہیں، فتح مکہ اسلام کی شہنشاہی کا پہلا دن تھا، جو رمضان ۸ھ کا واقعہ ہے، اسی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل میں محصلین زکوٰۃ کا تقرر فرمایا لیکن اصل خلافت الٰہی کے تمام اجزاء اواخر ۱۰ھ میں زمانۂ حجۃ الوداع کے قریب تکمیل پائے۔

یورپ کی ناآشنا نگاہ میں اگرچہ آپ کی زندگی کا یہ دور جدید ایشیائی شاہانہ زندگی کا ایک طرب انگیز منظر تھا، لیکن آشنایان حقیقت کو شہنشاہ عرب پھٹے پرانے کپڑوں میں، مدینہ کی گلیوں

کے اندر غلاموں اور مسکینوں کے کام کرتا ہوا نظر آتا ہے، وہ تاج و تخت سے بے نیاز، قصر و ایوان سے مستغنی، حاجب و دربان سے بے پروا، مال و زر سے خالی، خدم و حشم کے بغیر دلوں پر حکومت کر رہا تھا، نہ اس کی حکومت میں پولیس تھی، نہ بڑے بڑے انتظامی دفاتر، نہ کثیر التعداد اربابِ منصب، نہ وزرائے شورہ، نہ امرائے سیاست، نہ الگ الگ حکام و قضاۃ، وہ ایک ہی ذات تھی، جو ہر فرض و خدمت کی خود ذمہ دار تھی لیکن بایں ہمہ وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے اونٹ کے ایک بال کا بھی زیادہ مستحق[1] نہیں سمجھتا تھا، اس کے عدل و انصاف کے آگے فاطمہؓ جگر گوشۂ نبوت اور عام مجرم برابر تھے[2]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل بعثت کا مقصد دعوتِ مذہب، اصلاحِ اخلاق اور تزکیۂ نفوس تھا۔ اس کے علاوہ اور تمام فرائض محض ضمنی تھے، اس بنا پر انتظامات ملکی آپ نے اسی حد تک قائم کیے جہاں تک ملکی بدامنی کے باعث دعوتِ توحید کے لیے عوائق پیش آتے تھے، تاہم یہ کام بھی کچھ اہم نہ تھا۔)

انتظامِ ملکی (عمر شریف اس وقت ساٹھ برس کی تھی، اس عمر میں اس حکومت کے تمام کام خود انجام دیتے تھے، ولاۃ اور عمال کا تقرر، موذنین اور ائمہ کا تعین، محصلینِ زکوٰۃ و جزیہ کی نامزدگی، غیر قوموں سے مصالحت، مسلمان قبائل میں جائدادوں کی تقسیم، فوجوں کی آراستگی، مقدمات کا فیصلہ، قبائل کی خانہ جنگیوں کا انسداد، وفود کے لیے تعین وظائف، اجرائے فرامین، نومسلموں کے تعلیماتِ سنت، مسائلِ شرعیہ میں افتا، جرائم کے لیے اجرائے تعزیر، ملک کے بڑے بڑے سیاسی انتظامات

[1] ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب صلوۃ القافلہ [2] صحیح بخاری کتاب الحدود۔

عہدہ داروں کی خبرگیری اور احتساب، دور کے صوبوں میں متعدد صحابہ گورنر اور والی بنا کر بھیجدیے گئے تھے لیکن خود مدینہ اور اطراف مدینہ کے فرائض آپ خود انجام دیتے تھے،

خلافت الٰہی کے ان فرائض و اعمال نے آپکے دل و دماغ پر جو بار عظیم ڈالا، اس نے آپ کے نظام جسمانی کو چور چور کر دیا، عام روایتوں سے ثابت ہے کہ آپ آخر زندگی میں تہجد کی نماز بیٹھکر پڑھا کرتے تھے، جو ضعف جسمانی کا اقتضا تھا لیکن یہ ضعف جسمانی خود کس چیز کا نتیجہ تھا، اس کا جواب حضرت عائشہؓ کی زبان سے سننا چاہیے، جن سے بڑھ کر آپ کے اعمال زندگی کا کوئی ترجمان نہیں ہو سکتا،

عن عبد اللّٰہ بن شقیق قال سألت	عبد اللہ بن شقیق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ
عائشۃ افکان یصلی قاعداً قالت	سے پوچھا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھکر نماز پڑھتے تھے،
حین حطمہ الناس[1]	انھوں نے کہا ہاں لیکن اسوقت جب لوگوں نے آپکو چور چور کر دیا تھا

امیر العسکری (چھوٹے چھوٹے غزوات و سرایا کے امیر الجیش اگرچہ اکابر صحابہ ہوتے تھے لیکن جو بڑے معرکے پیش آتے تھے، ان کی قیادت خود آپ بنفس نفیس فرماتے تھے، چنانچہ بدر، احد، خیبر، فتح مکہ، تبوک میں خود آپ ہی امیر العسکر تھے، اس کا مقصد صرف فوج کا لڑانا اور آخری فتح و ظفر حاصل کرنا نہ تھا، بلکہ فوج کی عام اخلاقی اور روحانی نگرانی کرنا تھا، چنانچہ آپ نے مجاہدین اسلام کی جن جزئی سے جزئی بے اعتدالیوں پر گرفت فرمائی ہے، وہ احادیث میں بہ تصریح مذکور ہیں، اور اسلام کا قانون جنگ اسی دار و گیر کے ذریعہ سے وجود میں آیا ہے)

[1] ابو داؤد کتاب الصلوٰۃ

افتاء (آپ کے عہد مبارک میں اگرچہ متعدد صحابی بھی بطور خود فتوی دیتے تھے لیکن زیادہ تر آپ ہی اس فرض کو بھی ادا کرتے تھے. فتوی دینے کے لیے آپ نے کوئی خاص وقت مقرر نہیں فرمایا تھا، بلکہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، غرض جس وقت لوگ آپ سے احکام اسلام کے متعلق سوالات کرتے تھے آپ ان کا جواب دیتے تھے، چنانچہ امام بخاری نے کتاب العلم میں ان فتاوی کو اس قسم کے متعدد ابواب میں تقسیم کر دیا ہے. خلافت کا یہی فرض تھا جس کو حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں نہایت ترقی دی، اور اس کا ایک مستقل صیغہ قائم کر دیا)

فصل قضایا (اگرچہ آپؐ کے عہد مبارک میں عہدۂ قضاءت قائم ہو چکا تھا، اور حضرت علیؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو آپ نے خود یمن کا قاضی مقرر فرما کے بھیجا تھا، تاہم مدینہ اور اس کے حوالی و مضافات کے تمام مقدمات کا آپ خود فیصلہ کرتے تھے. اس کے لیے کسی قسم کی روک ٹوک اور پابندی نہ تھی، امام بخاری نے ایک خاص باب باندھا ہے جس کا عنوان یہ ہے،)

باب ما ذکر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن لہ بواب — یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر دربان نہ تھا.

اس بنا پر گھر کے اندر بھی آپ اطمینان و سکون کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے تھے، عورتوں کے معاملات عموماً زنانخانہ ہی میں پیش ہوتے تھے، احادیث کی کتابوں میں آپ کے فیصلوں کا اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اگر ان کا استقصا کیا جائے تو ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے. عموماً احادیث کی کتاب البیوع میں دیوانی کے مقدمات اور کتاب القصاص والدیات وغیرہ میں فوجداری کے مقدمات مذکور ہیں.

توقیعات و فرامین (یہ اس قدر اہم کام تھا کہ عہد مبارک میں اگرچہ اور صیغوں کا کوئی مستقل دفتر نہیں

Marfat.com

قائم ہوا تھا، تاہم توقیعات و فرامین کے لیے اس کی ابتدائی شکل قائم ہو چکی تھی، چنانچہ اس خدمت پر حضرت زید بن ثابتؓ، اور آخر میں معاویہ مامور ہوئے، ان کے علاوہ اور دوسرے صحابہ بھی وقتاً فوقتاً یہ خدمت انجام دیتے تھے، آپ نے سلاطین و ملوک کو دعوت اسلام کے جو خطوط روانہ فرمائے، غیر قوموں کے ساتھ جو معاہدے کیے، مسلمان قبائل کو جو احکام بھیجے، عمال و محصلین کو جو تحریری فرامین عنایت کیے، فوج کا جو رجسٹر مرتب کرایا، بعض صحابہ کو جو حدیثیں لکھوائیں وہ سب اسی سلسلہ میں داخل ہیں، زرقانی وغیرہ نے آپ کے احکام و فرامین تحریری کا ایک مستقل باب قائم کیا ہے)

مہمانداری (منصب نبوت کے بعد آپ کی ذاتی حیثیت تقریباً فنا ہو گئی تھی، اس لیے آپ کی خدمت میں جو لوگ حاضر ہوتے تھے، ان کا تعلق بھی خلافت الٰہی یا نبوت ہی کے ساتھ ہوتا تھا، اور آپ ذاتی حیثیت سے ان کی مہمانداری فرماتے تھے، مہمانوں کی زیادہ تر تعداد قبول اسلام کے لیے آتی تھی جن کی مہمانداری کے لیے آپ نے ابتدائے نبوت ہی سے خاص طور پر حضرت بلالؓ کو مامور فرما دیا تھا، چنانچہ جب کوئی تنگدست مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ اس کو برہنہ تن دیکھتے تو حضرت بلالؓ کو حکم دیتے اور قرض لیکر اس کے کھانے اور کپڑے کا انتظام کرتے جب آپ کے پاس کہیں سے کچھ مال آتا، تو اس کے ذریعہ سے وہ قرض ادا کیا جاتا، یہانتک کہ اگر کوئی شخص آپ کو ذاتی طور پر ہدیہ دیتا تو وہ بھی اسی صیغہ میں صرف کیا جاتا[1]، کبھی کبھی اس غرض کے لیے آپ تمام صحابہ کو صدقہ و خیرات کی ترغیب دیتے، اور جو رقم وصول ہوتی، وہ ان مفلوک الحال مہاجرین

[1] ابوداؤد کتاب الخراج والامارۃ باب فی الامام یقبل ہدایا المشرکین

کی اعانت میں صرف ہوتی. چنانچہ ایک بار مہاجرین کی ایک برہنہ پا برہنہ جماعت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی، ہر شخص کے بدن پر صرف ایک چادر اور گلے میں ایک تلوار حمائل تھی، آپ نے انکی پریشان حالی کو دیکھا، تو چہرے کا رنگ بدل گیا، فوراً حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک خطبہ میں تمام صحابہ کو ان لوگوں کی اعانت کی ترغیب دی، اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک انصاری اٹھے، اور ایک توڑا جو اس قدر وزنی تھا کہ ان سے بمشکل اٹھ سکتا تھا، لاکر آپ کے آگے ڈال دیا، اس سے تمام لوگوں میں اور بھی جوش پیدا ہوا، اور تھوڑی دیر میں ان بے سر و سامان مہاجرین کے آگے غلہ اور کپڑے کا ڈھیر لگ گیا،[1]

فتح مکہ کے بعد تمام اطراف ملک سے بکثرت ملکی و مذہبی وفود آنے لگے، آپ بنفس نفیس ان کی خاطر مدارات کرتے تھے، اور ان کے لیے حسب حاجت وظائف اور سفر کے مصارف ادا فرماتے تھے، قبائل پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا تھا، آپ اس کا اس قدر لحاظ فرماتے تھے کہ وفات کے وقت آپ نے جو آخری وصیتیں فرمائی تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھا.

اجیزوا الوفود بنحو ما کنت اجیزھم[2] — جس طرح میں وفود کو عطیہ دیا کرتا تھا تم بھی اسی طرح دیا کرنا

(وفود کے حالات آگے آتے ہیں)

عیادت مرضیٰ (مریضوں کی عیادت اور ان کی تجہیز و تکفین میں بھی شریک ہونا اگرچہ ایک مذہبی فرض تھا، اور مذہبی حیثیت سے اس کی ابتدا بھی ہوئی، چنانچہ جب آپ مدینہ تشریف لائے تو یہ عام دستور ہو گیا کہ دم نزع میت کے اعزہ آپ کو اطلاع دیتے، آپ ان کے پاس آکر ان کے

لہ مسند احمد حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۵۰ ؎۲ صحیح بخاری جلد ۱ باب اخراج الیہود من جزیرۃ العرب

Marfat.com

لیے دعائے مغفرت کرتے لیکن بعض حیثیتوں سے اس کا تعلق خلافت کے ساتھ بھی ہو گیا تھا، کیونکہ بعض صحابہ اس حالت میں اپنی جائداد کو وقف یا صدقہ کرنا چاہتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر ان کا صحیح طریقہ بتاتے تھے جن لوگوں پر قرض آتا تھا آپ ان کے جنازہ میں شریک نہیں ہوتے تھے، اس لیے ان کے ورثہ یا دوسرے صحابہ کو مجبوراً یہ قرض ادا کرنا پڑتا تھا، اور اس طرح بعض معاملات و نزاعات کا فیصلہ ہو جاتا تھا چنانچہ احادیث میں اس قسم کی متعدد مثالیں موجود ہیں،

احتساب — تمدن اسلام کے دور ترقی میں محکمۂ احتساب ایک مستقل محکمہ تھا جو نہایت وسیع پیمانہ پر تمام قوم کے اخلاق و عادات بیع و شرا، اور معاملات داد و ستد کی نگرانی کرتا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ محکمہ قائم نہیں ہوا تھا، بلکہ خود ہی آپ اس فرض کو ادا فرماتے تھے، ہر شخص کے جزئیات اخلاق اور تصرف مذہبی کے متعلق آپ وقتاً فوقتاً دار و گیر فرماتے رہتے تھے، تجارتی معاملات کی بھی نگرانی فرماتے تھے، عرب میں تجارتی معاملات کی حالت نہایت قابل اصلاح تھی، اور مدینہ میں آنے کے ساتھ ہی آپ نے ان اصلاحات کو جاری کر دیا لیکن تمام لوگوں سے اصلاحات پر عمل کرانا صیغۂ احتساب سے تعلق رکھتا تھا، چنانچہ نہایت سختی کے ساتھ ان معاملات کی نگرانی فرماتے تھے، اور تمام لوگوں سے ان پر عمل کراتے تھے، اور جو لوگ باز نہیں آتے تھے، ان کو سزائیں دلاتے تھے صحیح بخاری کتاب البیوع میں ہے،

لقد رأیت الناس فی عهد النبی صلی اللہ علیه وسلم یبتاعون جزافاً یعنی الطعام	حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں دیکھا کہ جو لوگ تخمیناً غلہ خریدتے تھے،

سنن مسند جلد سو صفحہ ۶۶

يضربون ان يبيعوه فی مکانهم — انکو اس بات پر سزا دیجاتی تھی کہ اپنے گھروں میں منتقل کرنے

حتی یووه الی رحالهم — سے پہلے اسکو خود اسی جگہ بیچ ڈالیں جہاں اسکو خریدا تھا،

کبھی کبھی تحقیق حال کے لیے آپ خود بازار تشریف لیجاتے، ایک بار آپ بازار میں گذرے تو غلہ کا ایک انبار نظر آیا، اس کے اندر ہاتھ ڈالا تو نمی محسوس ہوئی، دوکاندار سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بارش سے بھیگ گیا ہے، ارشاد ہوا کہ "پھر اس کو اوپر کیوں نہیں کر لیا، تاکہ ہر شخص کو نظر آئے، جو لوگ فریب دیتے ہیں، وہ ہم میں سے نہیں ہیں"۔[1]

فرائض احتساب میں آپ کا سب سے بڑا فرض عمال کا محاسبہ تھا یعنی جب عمال زکوٰۃ اور صدقہ وصول کر کے آتے تھے، تو آپ اس غرض سے ان کا جائزہ لیتے تھے، کہ انھوں نے کوئی ناجائز طریقہ تو نہیں اختیار کیا ہے، چنانچہ ایک بار آپ نے ابن اللتبیہ کو صدقہ وصول کرنے کے لیے مامور فرمایا، وہ اپنی خدمت انجام دیکر واپس آئے، اور آپ نے ان کا جائزہ لیا، تو انھوں نے کہا یہ مال مسلمانوں کا ہے اور یہ مجھکو ہدیۃً ملا ہے، آپ نے فرمایا کہ "گھر بیٹھے بیٹھے تم کو یہ ہدیہ کیوں نہیں ملا"۔ اس کے بعد آپ نے ایک عام خطبہ دیا جس میں اس کی سخت ممانعت فرمائی[2]

اصلاح بین الناس

اسلام تمام دنیا کے تفرقوں کو عموماً اور عرب کے اختلافات کو خصوصاً مٹانے کے لیے آیا تھا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنا ایک ضروری فرض قرار دیا تھا، اور جب آپ کو اس قسم کے منازعات کی خبر ہوتی تھی تو آپ اصلاح کو تمام مذہبی فرائض پر مقدم رکھتے تھے، چنانچہ ایک بار قبیلہ بنو عمرو بن عوف کے چند اشخاص کے درمیان نزاع پیدا ہوئی، آپ کو معلوم ہوا

---

[1] صحیح مسلم جلد اصفحہ ۵۳ کتاب الایمان [2] بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۶۸ کتاب الاحکام

Marfat.com

تو چند صحابہ کے ساتھ ان میں مصالحت کرانے کے لیے تشریف لے گئے، آپ کو اس معاملہ میں دیر ہوئی اور نماز کا وقت آگیا، حضرت بلال ؓ نے اذان دی لیکن اذان کے بعد بھی آپ تشریف نہیں لائے، تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد انھوں نے حضرت ابو بکر ؓ کو امام بنا کر نماز شروع کر دی، آپ اسی حالت میں تشریف لائے اور صفوں کو چیرتے ہوئے اگلی صف میں جا کھڑے ہوئے، حضرت ابو بکر ؓ اگرچہ نماز میں ادھر ادھر نہیں دیکھتے تھے، لیکن جب لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجانی شروع کیں تو انھوں نے پیچھے مڑکر دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہیں، آپ نے اگرچہ ہاتھ سے اشارہ کیا کہ کھڑے رہیں لیکن آپ کی موجودگی میں انھوں نے امامت کرنا سوء ادب خیال کیا اس لیے پیچھے ہٹ آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھ کر ان کی جگہ کھڑے ہو گئے۔[1]

ایک بار اہل قبا کے درمیان نزاع قائم ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگوں نے باہم سنگ اندازی کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ صحابہ کے ساتھ مصالحت کرانے کی غرض سے تشریف لے گئے۔[2] (یہ دونوں واقعات گو امام بخاری نے الگ لکھے ہیں، لیکن شراح حدیث کی تحقیق میں یہ ایک ہی واقعہ کے دو حصے ہیں) بخاری کی دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ اتنی دور پیدل گئے تھے،

ابن ابی حدرد پر حضرت کعب بن مالک ؓ کا کچھ قرض تھا، انھوں نے مسجد میں تقاضا کیا، حدرد قرض کا ایک حصہ معاف کرانا چاہتے تھے لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوتے تھے، بات زیادہ بڑھی اور شور وغل ہوا تو آپ گھر کے اندر سے نکل آئے، اور کعب کو پکارا، کعب نے لبیک کہا تو آپ نے فرمایا کہ نصف معاف کر دو۔" وہ راضی ہو گئے تو آپ نے حدرد سے کہا کہ "جاؤ اور بقیہ حصہ ادا کر دو۔"

[1] بخاری ج ۱ ص ۳۷۰ کتاب الصلح [2] بخاری کتاب الصلح

Marfat.com

اس قسم کے سیکڑوں جزئی واقعات روزانہ پیش آیا کرتے تھے۔

مدینہ میں اور مدینہ سے باہر دیگر فرائض کی انجام دہی کے لیے اکابر صحابہ اور ارباب سنن راد کو مختلف عہدوں پر نصب فرمایا۔ کتابت وحی، نامہ و پیام، اجرائے احکام و فرامین کیلئے سب سے پہلی ضرورت عہدۂ انشاء اور کتابت کی تھی، اسلام سے پہلے عرب میں عام طور پر لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا، لیکن اسلام عرب کے لیے رحمتوں کا جو خزانہ لایا تھا، اس میں ایک یہ شے بھی تھی،

اسیران بدر میں نادار لوگوں کا فدیہ صرف یہ قرار دیا گیا کہ وہ مدینہ کے بچوں کو لکھنا سکھادیں حضرت زید بن ثابتؓ نے جن کے متعلق کتابت وحی کی مقدس خدمت تھی، اسی طریقہ پر تعلیم پائی تھی، ابوداؤد کی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب صفہ کو جو تعلیم دیجاتی تھی اسکا ایک جز کتابت کی تعلیم بھی تھی)

کتاب (عہدۂ انشاء گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حیثیت سے نیابت تھی، اس لیے مختلف اوقات میں بڑے بڑے صحابہ اس خدمت پر مامور کیے گئے، جن میں شرجیل بن حسنہ کندی سب سے پہلے اس شرف سے ممتاز ہوئے، یہ نہایت قدیم الاسلام تھے، مکہ میں ان ہی نے سب سے پہلے کتابت وحی کا فرض انجام دیا، قریش میں سب سے پہلے کاتب عبداللہ بن ابی سرح تھے، مدینہ میں اس کی اولیت کا شرف حضرت ابی بن کعبؓ کو حاصل ہوا،

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عامر بن فہیرہؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت عبداللہ بن ارقمؓ، حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ، حضرت حنظلہ بن الربیع الاسدیؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ،

حضرت خالدبن سعیدبن العاص، حضرت علاء بن حضرمی، حضرت حذیفہ بن الیمان، حضرت معاویہ ابن ابی سفیان، حضرت زید بن ثابت مختلف اوقات میں اس منصب پر مامور ہوئے، اگرچہ تمام بزرگوں کو کبھی کبھی یہ خدمت ادا کرنی پڑتی تھی، چنانچہ صلحنامۂ حدیبیہ حضرت علیؓ نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا، امراء اور سلاطین کے نام خطوط حضرت عامرؓ وغیرہ لکھتے تھے، اور امرائے عمان کے نام آپ نے جو مکتوب بھیجا تھا، وہ حضرت ابی بن کعب کا لکھا تھا قطن بن حارثہ کو جو خط بارگاہ نبوت سے بھیجا گیا تھا، وہ حضرت ثابت بن قیس نے لکھا تھا لیکن عام طور پر یہ خدمت حضرت زید بن ثابت کے متعلق تھی، اور صحابہ کے گروہ میں ان کا نام اسی حیثیت سے زیادہ نمایاں ہے[1]،

حضرت زید بن ثابت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ان تمام بزرگوں پر ایک خاص امتیاز حاصل کیا کہ عبرانی زبان سیکھی جس کی ضرورت یہ پیش آئی کہ مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ تر یہود سے تعلق رہتا تھا جن کی مذہبی زبان عبرانی تھی، اس بنا پر آپ نے حضرت زید بن ثابت کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا، اور انھوں نے پندرہ دن میں اس میں مہارت حاصل کرلی،

حکام اور ولاۃ فصل قضایا، اقامت عدل، بسط امن، رفع نزاع کے لیے متعدد ولاۃ و حکام کی ضرورت تھی، اس غرض سے آپ نے متعدد صحابہ کو مختلف مقامات کا حاکم و والی مقرر فرمایا، چنانچہ ان کے ناموں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

باذان بن ساسان	بہرام گور کے خاندان سے تھے، اور سلاطین عجم میں سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے، اسکے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

[1] ان بزرگوں کے نام اور تفصیلی حالات زرقانی جلد ۳ صفحہ ۱۳-۳۹ میں مذکور ہیں،

	نے ان کو یمن کا والی مقرر فرمایا،
شہر بن باذانؓ	باذان بن ساسان کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صنعاء کا والی مقرر فرمایا،
خالد بن سعیدؓ بن العاص	شہر بنؓ باذان مارے گئے تو ان کے بعد آپ نے ان کو صنعاء کا عامل مقرر فرمایا،
مہاجر بنؓ امیۃ المخزومی	آپ نے انکو کندہ وصدف کا والی مقرر فرمایا تھا، لیکن وہ ابھی روانہ بھی نہ ہوئے تھے کہ آپ نے انتقال فرمایا،
زیاد بن لبید الانصاریؓ	حضر موت کے والی تھے،
ابو موسیٰ اشعریؓ	زبید، عدن، زمعہ وغیرہ کے والی تھے،
معاذ بن جبلؓ	والی جند
عمرو بن حزمؓ	والی نجران
یزید بن ابی سفیانؓ	والی تیما،
عتاب بن اسیدؓ	والی مکہ
علی بن ابی طالبؓ	متولی اخماسِ یمن،
عمرو بن العاصؓ	والی عمان
علاء بن حضرمیؓ	والی بحرین

ان ولاۃ یعنی گورنروں کا تقرر ملک کی وسعت اور ضروریات کے لحاظ سے ہوتا تھا، آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں عرب کے جو حصے اسلام کے زیر اثر آئے، ان میں یمن سب سے زیادہ وسیع اور متمدن تھا، اور مدت تک ایک باقاعدہ سلطنت کے زیر سایہ رہ چکا تھا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پانچ حصوں میں منقسم فرمایا، اور ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ گورنر مقرر فرمائے، خالد بن سعید کو صنعا پر، مہاجر بن ابی امیہ کو کندہ پر، زیاد بن لبید کو حضر موت پر، معاذ بن جبل کو جند پر، ابو موسیٰ اشعری کو زبید، زمعہ، عدن اور سواحل پر۔[1]

عموماً جب کسی مہاجر کو کہیں کا عامل مقرر فرماتے تھے تو اسی کے ساتھ ایک انصاری کا تقرر بھی فرماتے تھے،[2] ملکی انتظام فصل مقدمات اور تحصیل خراج وغیرہ کے علاوہ ان عمال کا سب سے مقدم فرض اشاعت اسلام اور سنن و فرائض کی تعلیم تھی، اس لحاظ سے جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، یہ لوگ حاکم ملک اور والی صوبہ ہونے کے ساتھ مبلغ دین اور معلم اخلاق کی حیثیت بھی رکھتے تھے، استیعاب، تذکرہ معاذ بن جبل میں ہے،

وبعثہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کے ایک حصہ
قاضیا الی الجند من الیمن یعلم الناس	یعنی جند کا قاضی بنا کر روانہ فرمایا کہ لوگوں کو قرآن
القرآن وشرائع الاسلام ویقضی	اور شرائع اسلام کی تعلیم دیں اور جو عمال یمن میں
بینھم وجعل الیہ قبض الصدقات	تھے ان کے صدقات کے جمع کرنے کی خدمت بھی
من العمال الذین بالیمن	ان کے متعلق کی،

چنانچہ جب یہ لوگ روانہ ہوتے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان فرائض کی تعیین فرما دیتے تھے

[1] استیعاب تذکرہ معاذ بن جبل [2] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۸۶،

معاذ بن جبلؓ کو روانہ فرمایا تو یہ وصیت کی،

انك تاتی قوما من اهل الکتاب فادعهم الی شهادة ان لا اله الا الله وانی رسول الله فان هم اطاعوا لذلك فاعلمهم ان الله افترض علیهم خمس صلوات فی کل یوم ولیلة فان هم اطاعوا لذلك فاعلمهم ان الله افترض علیهم صدقة تؤخذ من اغنیائهم وترد الی فقرائهم فان هم اطاعوا لذلك فایاك وکرائم اموالهم واتق دعوة المظلوم فانه لیس بینها وبین الله حجاب،

تم اہل کتاب کے پاس جاتے ہو، پہلے انکو کلمہ توحید کی دعوت دو، اگر وہ اسکو قبول کرلیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے رات اور دن میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اگر وہ اسکو بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے امراء سے لیکر انکے غرباء پر تقسیم کردیا جائیگا، اگر وہ اسکو بھی تسلیم کرلیں تو ان کے بہترین مال سے احتراز کرنا، اور مظلوم کی بد دعا سے بچنا، کیونکہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے،

ان فرائض کے ادا کرنے کے لیے سب سے زیادہ ضرورت تبحر علمی، وسعت نظر اور اجتہاد کی تھی، اس بنا پر آپ ان لوگوں کے تبحر علمی اور طرز عمل کا امتحان لیتے تھے، چنانچہ جب حضرت معاذؓ کو روانہ فرمایا تو پہلے ان کی اجتہادی قابلیت کے متعلق اطمینان فرمالیا، ترمذی میں ہے،

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لمعاذ بن جبل حین وجهه الی الیمن بم تقضی قال بما فی کتاب الله قال فان لم تجد قال بما فی سنة رسول الله قال فان لم تجد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبلؓ کو یمن کیطرف بھیجا تو فرمایا کس چیز سے مقدمات کا فیصلہ کروگے، انھوں نے کہا قرآن مجید سے، آپ نے فرمایا اگر اسمیں وہ فیصلہ تم کو نہ ملے انھوں نے کہا احادیث سے، پھر آپ نے فرمایا اگر احادیث میں بھی

Marfat.com

قال اجتهد برائی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یحب رسول اللہ

اسکے متعلق ہدایت نہ ملے تو انھوں نے کہا میں اپنی رائے سے اجتہاد کرونگا، اسپر آپ نے فرمایا اس خدا کا شکر ہے جس نے رسول کے رسول کو اس چیز کی توفیق دی جسکو خود اس کا رسول محبوب رکھتا ہے۔

لیکن اہل عرب کے دلوں کے مسخر کرنے کے لیے ان تمام چیزوں سے زیادہ رفق و ملاطفت، نرمی اور خوشخوئی کی ضرورت تھی، جنکی آمیزش سیاست اور حکومت کے اقتدار کے ساتھ تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گورنروں کو بار بار اس کی طرف متوجہ فرماتے رہتے تھے، چنانچہ جب معاذ بن جبلؓ کو ایک صحابی کے ساتھ یمن کی گورنری پر روانہ فرمایا تو پہلے دونوں کو عام طور سے وصیت فرمائی،

یسرا ولا تعسرا و بشرا ولا تنفرا و تطاوعا ولا تختلفا۔ (مسلم جلد ۲ صفحہ ۴۳ کتاب الایمان)

آسانی پیدا کرنا، دشواری نہ پیدا کرنا، لوگوں کو بشارت دینا اور انکو وحشت زدہ نہ کرنا، باہم اتفاق رکھنا اور اختلاف نہ کرنا۔

اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو معاذ بن جبلؓ جب رکاب میں پانوں ڈال چکے تو ان سے خاص طور پر یہ الفاظ فرمائے،

احسن خلقک للناس (ابن سعد تذکرہ معاذ بن جبل)

لوگوں کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ برتاؤ کرنا

اگرچہ یہ اصول صحیح ہے کہ کوئی حکومت کتنی ہی رحمدل کیوں نہ ہو، لیکن ابتدا میں جب وہ کسی ملک کو اپنے قبضۂ اقتدار میں لاتی ہے تو سرکش لوگوں کے مطیع کرنے کے لیے اس کو مجبوراً سختیاں کرنی پڑتی ہیں، تو عرب سب سے زیادہ اس کا مستحق تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی مقدس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ ریگستان عرب کا ایک ذرہ بھی ولاۃ کے مظالم کے سنگ گراں سے نہ دبا، یہانتک کہ اخیر زمانہ میں جب

Marfat.com

صحابہ عمال حکومت کے مظالم کو دیکھتے تھے تو ان کو سخت استعجاب ہوتا تھا، اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقینات کے ذریعہ سے ان کو روکتے تھے، چنانچہ ایک بار ہشام بن حکیم بن حزام نے دیکھا کہ شام کے کچھ نبطی دھوپ میں کھڑے کیے گئے ہیں، انھوں نے لوگوں سے اس کی وجہ پوچھی، لوگوں نے کہا کہ جزیہ وصول کرنے کے لیے ان لوگوں کے ساتھ یہ سختی کی جارہی ہے، انھوں نے یہ سنکر کہا کہ

اشھد لسمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ
یقول ان اللہ یعذب الذین یعذبون	علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو عذاب
الناس فی الدنیا[1]	دیگا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں،

محصلین زکوٰۃ وجزیہ

عرب کا خلوص اور جوش ایمان اگرچہ خود ان کو صدقہ وزکوٰۃ کے ادا کرنے پر آمادہ کردیتا تھا، چنانچہ اسلام لانے کے ساتھ ہی ہر قبیلہ اپنی قوم کا صدقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتا اور آپ کی دعا سے برکت اندوز ہوتا تھا لیکن ایک وسیع ملک اور ایک وسیع حکومت کے لیے یہ طریقہ کافی نہ تھا، اس لیے ولاۃ کے علاوہ یکم محرم ۹ھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ وزکوٰۃ کے وصول کرنے کے لیے ہر قبیلہ کے لیے الگ الگ محصلین مقرر فرمائے، جو قبائل کا دورہ کرکے لوگوں سے زکوٰۃ اور خراج وصول کرکے آپکی خدمت مبارک میں پیش کرتے تھے، عموماً خود رؤسائے قبائل اپنے اپنے قبیلوں کے محصل ہوتے تھے، اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً انکا تقرر وقتی ہوتا تھا بہرحال آپنے اس فرض کی انجام دہی کیلیے حسب ذیل اشخاص کو مختلف قبائل اور شہروں میں متعین فرمایا[2]

[1] صحیح مسلم باب لوعید الشدید لمن عذاب الناس بغیر حق [2] اس فہرست کے اکثر نام ابن سعد جز مغازی صفحہ ۱۱۵ میں مذکور ہیں، عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ بن الجراح کا ذکر بخاری کتاب الصدقات اور بعض کا ابوداؤد کتاب الخراج میں ہے بقیہ کے لیے زاد المعاد ذکر مصدقین وامرائے نبوی اور فتوح البلدان بلاذری دیکھو،

نام	مقام تقرر	نام	مقام تقرر
عدی بن حاتم	طے و بنی اسد	ابوجہم بن حذیفہ	بنو لیث
صفوان بن صفوان[1]	بنی عمرو	ایک ہذیمی	بنو ہذیم
مالک بن نویرہ	بنو حنظلہ	عمر فاروقؓ	شہر مدینہ
بریدہ بن حصیب الاسلمی	غفار و اسلم	عبیدہ بن جراحؓ	شہر نجران
عباد بن بشر الاشہلی	سلیم و مزینہ	عبداللہ بن رواحہؓ	شہر خیبر
رافع بن مکیث جہنی	جہینہ	زیاد بن لبید	حضرموت
زبرقان بن بدر	بنو سعد	ابوموسیٰ اشعریؓ	صوبۂ یمن
قیس بن عاصم	″	خالدؓ	″
عمرو بن عاص	بنو فزارہ	ابان بن سعید	بحرین
ضحاک بن سفیان کلابی	بنو کلاب	عمرو بن سعید بن العاص	تیماء
بسر بن سفیان الکعبی	بنو کعب	محمیۂ بن جزء الاسدی	تحصیلِ خمس
عبداللہ بن اللتبیہ	بنو ذبیان	عیینہ بن حصن فزاری	بنو تمیم

ان محصلین کے تقرر میں آپ حسب ذیل امور کی پابندی فرماتے تھے،

(۱) ان کو ایک فرمان عطا ہوتا تھا جس میں بہ تصریح بتایا جاتا تھا کہ کس قسم کے مال کی کتنی تعداد میں زکوٰۃ کی کیا مقدار ہے، چھانٹ کر مال لینے کی یا حق سے زیادہ لینے کی اجازت نہ تھی، عام حکم تھا کہ

۱؎ اصابہ باب صفوان

Marfat.com

ایاک وکرائم اموالھم یہ عمال نہایت شدت کے ساتھ اس فرمان پر عمل کرتے تھے۔ اور اس سے سر مو تجاوز جائز نہیں رکھتے تھے، بعض لوگوں نے بخوشی حق سے زیادہ دینا چاہا، لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا، سوید بن غفلہ کا بیان ہے کہ ہمارے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محصل آیا، میں جاکر اس کے پاس بیٹھا، تو اس نے پہلے جانوروں کے ان اقسام کو بیان کیا جن کے لینے کی فرمان میں اجازت نہ تھی، چنانچہ اسی وقت ایک شخص ایک نہایت عمدہ کوہان دار اونٹنی لیکر حاضر ہوا، اور اس کی خدمت میں پیش کیا، لیکن اس نے انکار کر دیا،[1] اسی طرح جب ایک شخص نے ایک محصل کو بچے والی بکری دی تو اس نے کہا کہ ہم کو اس کے لینے کی ممانعت کی گئی ہے[2]۔

(۲) عرب کے مال و دولت کی کل کائنات بکریوں کے ریوڑ اور اونٹوں کے گلے تک محدود تھی، جو جنگلوں میں، بیابانوں میں، پہاڑوں کے دامنوں میں چرتے رہتے تھے، لیکن بجائے اس کے کہ دنیوی حکومتوں کی طرح جابرانہ احکام کے ساتھ لوگ خود زکوٰۃ کے جانور لاکر محصلین کے سامنے پیش کرتے، محصلوں کو خود ان دروں میں جاکر زکوٰۃ وصول کرنا پڑتا تھا، ایک صحابی کا بیان ہے کہ میں پہاڑ کے ایک درہ میں بکریاں چرا رہا تھا، کہ دو شخص اونٹ پر سوار ہو کر آئے، اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد ہیں، یہاں تمھاری بکریوں کا صدقہ وصول کرنے کیلئے آئے ہیں، میں نے ایک بچے والی شیر دار بکری پیش کی لیکن انھوں نے کہا کہ ہم کو اس کے لینے کا حکم نہیں، میں نے ایک دوسرا بچہ دیا تو انھوں نے اس کو اپنے اونٹ پر لادلیا اور چلتے ہوئے[3]۔

(۳) اگرچہ صحابہؓ اپنے تقدس اور پاک باطنی کی بنا پر ہر قسم کے ناجائز مال لینے سے خود احتراز

---

[1] نسائی صفحہ ۳۹۰ [2] ایضاً ص ۳۹۳ [3] ایضاً

Marfat.com

کرتے تھے، چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن رواحہ کو خیبر کے یہودیوں کے پاس بھیجا کہ وہاں کی زراعت کی نصف پیداوار حسب معاہدہ تقسیم کرا کے لائیں تو انھوں نے ان کو رشوت دینی چاہی تو انھوں نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ "اے خدا کے دشمنو! کیا مجھے حرام مال کھلانا چاہتے ہو"[1]

لیکن باایں ہمہ زہد و تقدس جب محصل اپنے دورہ سے واپس آتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کا محاسبہ فرماتے تھے، چنانچہ ایک بار آپ نے ابن اللتبیہ کو صدقہ وصول کرنے کے لیے روانہ فرمایا جب وہ واپس آئے اور آپ نے انکا محاسبہ کیا تو انھوں نے کہا یہ آپ کا مال ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے، یہ سنکر آپ نے فرمایا کہ تم کو گھر بیٹھے بیٹھے ہدیہ کیوں نہیں ملا، اس پر بھی تسکین نہیں ہوئی تو ایک عام خطبہ دیا، اور تمام لوگوں کو اس قسم کے مال لینے سے سختی کے ساتھ ممانعت فرمائی،[2]

(۴) چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان پر صدقہ و زکوٰۃ کا مال حرام کر دیا تھا، اس لیے خاندانِ نبوت کا کوئی شخص صدقہ کا محصل مقرر نہیں ہوا، ایک بار عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث اور فضل ابن عباس نے کہ عم زاد بھائی اور بھتیجے تھے آپ کی خدمت میں درخواست کی کہ اب ہمارا سن نکاح کے قابل ہو گیا ہے، تمام لوگوں کی طرح ہم کو بھی صدقہ کا عامل مقرر فرما دیجئے، تاکہ اسکے معاوضہ سے کچھ مال جمع کر کے نکاح کیلیے سرمایہ مہیا کریں، لیکن آپ نے فرمایا کہ صدقہ آل محمد کیلیے جائز نہیں ہے، وہ لوگوں کا میل ہے۔[3]

(۵) عمال کا انتخاب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے، اور جو لوگ اپنے آپ کو اس خدمت کیلیے خود پیش کرتے تھے، ان کی درخواست نامنظور ہوتی تھی، چنانچہ ابو موسیٰ اشعری کیساتھ دو شخص آئے اور عامل بننے کی درخواست کی، آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "تم کیا کہتے ہو"

[1] فتوح البلدان صفحہ ۱س [2] صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۱۳ [3] صحاح کتاب الصدقات

Marfat.com

انھوں نے کہا کہ مجھکو یہ خبر نہ تھی کہ یہ لوگ اس غرض سے آئے ہیں، آپ نے ان دونوں کی درخواست نامنظور کی اور فرمایا کہ جو لوگ خود خواہش کرتے ہیں ہم ان کو عامل مقرر نہیں کرتے لیکن اسی وقت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بلا درخواست یمن کا عامل مقرر کرکے روانہ فرمایا۔[1]

(۹) عمال کو صرف بقدر ضرورت معاوضہ ملتا تھا، آپ نے عام منادی فرمادی تھی کہ جو شخص ہماری مقررہ شرح سے زیادہ لیگا وہ خیانت مالی ہے، مقدار ضرورت کی تصریح خود آپ نے فرمادی تھی۔[2]

من کان لنا عاملا فلیکتسب زوجۃ فان	جو شخص ہمارا عامل ہو اسکو ایک بی بی کا خرچ لینا
لم یکن لہ خادم فلیکتسب خادما وان	چاہیے، اگر اس کے پاس نوکر نہ ہو تو نوکر کا، اگر مکان
لم یکن لہ مسکن فلیکتسب مسکنا	نہ ہو تو گھر کا، لیکن اگر کوئی اس سے زیادہ لیگا
ومن اتخذ غیر ذلک فھو غال	تو وہ خائن ہوگا،

آپ کے زمانہ میں حضرت عمر فاروقؓ کو بھی اس قسم کا معاوضہ ملا تھا، چنانچہ ان کے عہد خلافت میں جب صحابہ نے زہد وتقدس کی بنا پر معاوضہ لینے سے انکار کیا تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی طرز عمل سے استدلال کیا۔

قضاۃ ان مناصب کے علاوہ بعض اور عہدے بھی سادہ طور سے قائم ہوگئے تھے، مثلاً فصل مقدمات کا کام اگرچہ زیادہ تر آپ خود انجام دیتے تھے لیکن کبھی کبھی آپ کے حکم سے حسب ذیل صحابہ نے بھی اس فرض کو انجام دیا ہے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ ابن عوف، ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبلؓ۔

[1] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۰۹ [2] ابوداؤد جلد ۲ باب ارزاق العمال میں دونوں حدیثیں ہیں۔

Marfat.com

پولیس | اگرچہ خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں بھی باضابطہ طور پر پولیس کا محکمہ قائم نہیں ہوا، اور اس کی ابتدا بنو امیہ کی سلطنت میں ہوئی، تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی اسکا ابتدائی نمونہ قائم ہو چکا تھا، چنانچہ آپ کے عہد مبارک میں قیس بن سعد اس خدمت کو انجام دیتے تھے، اور اس غرض سے ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتے تھے[۱]

جلاد | مجرموں کی گردن مارنے کی خدمت حضرت زبیرؓ، حضرت علیؓ، مقداد بن الاسودؓ، محمد ابن مسلمہ، عاصم بن ثابت، ضحاک بن سفیان کلابی کے سپرد تھی[۲]

غیر قوموں سے معاہدے | عرب میں اب کفر و شرک کا بالکل وجود نہ تھا کہیں کہیں صرف مجوس نصاریٰ اور یہود کی آبادیاں تھیں، ان میں سے معتدبہ افراد نے گو نور ایمان سے قلوب کو روشن کر لیا تھا، لیکن مجموعی حیثیت سے وہ ابتک تاریکی میں تھے، تاہم خلافت الٰہی کی ہمہ گیر قوت سے وہ سرتابی نہ کر سکے، حجاز کے یہودیوں کے سوا عرب کی تمام قوموں نے بخوشی اسلام کی اطاعت قبول کی اس لیے اسلام نے بھی ان کی جان و مال، عزت و آبرو اور مذہب کی حفاظت کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی، اور اس کے مقابلہ میں جزیہ کی ایک ایک خفیف رقم (یعنی ہر مستطیع عاقل بالغ مرد پر ایک دینار سالانہ) ان پر مقرر کی، اس رقم کا نقد روپیہ کی صورت میں ادا ہونا ضروری نہ تھا، بلکہ عموماً جہاں جس چیز کی پیداوار ہوتی تھی، یا جو چیز بنتی تھی، وہی چیز جزیہ قرار پائی[۳]،

غیر قوموں میں سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۷ھ میں خیبر، فدک، وادی القریٰ اور تیماء کے یہودیوں سے مصالحت فرمائی، اس وقت تک آیت جزیہ کا نزول نہیں ہوا تھا، اس بنا

---

[۱] فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۱۱۰ [۲] بخاری کتاب الاحکام [۳] زاد المعاد ابن قیم [۴] ایضاً جلد فصل جزیہ

باہمی رضامندی سے جو شرائط قرار پا گئے تھے، وہ آیت جزیہ کے نزول کے بعد بھی قائم رہے۔[1] اصل شرط یہ تھی کہ وہ رعایا کی حیثیت سے کام کریں گے اور پیداوار کا نصف حصہ خود لیں گے اور نصف مالکوں کو ادا کریں گے۔[2]

سـ۹ـھ میں جزیہ کی آیت نازل ہوئی۔ اس کے بعد تمام معاہدے اسی کی رو سے قرار پائے۔

نجران کے عیسائیوں نے مدینہ میں آکر مصالحت کی درخواست کی جس کو آپ نے منظور فرمایا، شرائط صلح یہ تھے کہ "وہ مسلمانوں کو سالانہ دو ہزار کپڑے دینگے، اور ان کو دو قسط میں یعنی آدھا ماہ صفر اور آدھا ماہ رجب میں ادا کریں گے۔ اگر یمن میں کبھی بغاوت یا شورش ہوگی تو وہ عاریۃً تیس زرہیں تیس گھوڑے، تیس اونٹ اور تیس تیس عدد ہر قسم کے ہتھیار دینگے، اور مسلمان انکی واپسی کے ضامن ہوں گے۔ اس کے معاوضہ میں جب تک وہ سودی لین دین یا بغاوت نہ کریں گے، نہ انکے گرجے ڈھائے جائینگے، نہ انکے پادری نکالے جائینگے، نہ ان کو انکے مذہب سے برگشتہ کیا جائے گا"[3]

حدود شام میں بہت سے عیسائی اور یہودی گاؤں میں آباد تھے، رجب سـ۹ـھ میں غزوہ تبوک کے موقع پر دومۃ الجندل، ایلہ، مقنا، جربا، اذرح، تبالہ اور جرش کے جو عیسائی اور یہودی زمیندار اسلام نہیں لائے، بلکہ جزیہ دینا قبول کیا، ان میں سے ہر بالغ مرد پر ایک دینار سالانہ مقرر ہوا، اور مسلمان جب ادھر سے گذریں تو ان کی ضیافت بھی ان پر لازمی قرار دی گئی۔[4]

یمن کے جن یہودیوں نے اسلام قبول نہیں کیا ان پر بھی جزیہ کی یہی مقدار مقرر کی گئی، انکو

---

[1] زاد المعاد ابن قیم جلد اول [2] بخاری و مسلم و ابوداؤد، ذکر خیبر و فتوح البلدان بلاذری ذکر فدک وادی القری و تیماء
[3] ابوداؤد کتاب الخراج باب اخذ الجزیہ [4] فتوح البلدان بلاذری

Marfat.com

ایک آسانی یہ بھی دی گئی کہ اگر نقد نہ ادا کرسکیں تو اسی کے برابر معافری کپڑے دیا کریں[1]، بحرین کے مجوسیوں سے بھی جزیہ کی اسی شرح مقدار پر مصالحت کی گئی[2])

اصناف محاصل ومخارج

(مختلف اغراض ومصالح کی بنا پر اسلام میں آمدنی کے صرف پانچ ذرائع تھے، غنیمت، فی، زکوٰۃ، جزیہ، خراج، اول و دوم کے سوا بقیہ ذرائع آمدنی سالانہ تھے،

غنیمت کا مال صرف فتوحات کے موقع پر آتا تھا، عرب میں قاعدہ تھا کہ رئیس فوج غنیمت کا چوتھا حصہ خود لیتا تھا جس کو اصطلاح میں مرباع کہتے تھے، اور بقیہ جو جس کے ہاتھ لگ جاتا تھا لے لیتا تھا، تقسیم کا کوئی نظام نہ تھا، غزوہ بدر کے بعد خدا نے غنیمت کو خود اپنی ملک قرار دیا، جس میں خمس یعنی پانچواں حصہ خدا اور رسول کے نام سے حکومت الٰہی کے مصالح واغراض کے مخصوص فرمایا۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (انفال)

اے پیغمبر لوگ تجھ سے مال غنیمت کی نسبت پوچھتے ہیں، کہدے کہ وہ خدا اور رسول کی ملک ہے۔

خدا اور رسول کی ملکیت سے مقصود یہ ہے کہ وہ سپاہیوں کی شخصی ملکیت نہیں ہے، بلکہ مصالح کی بنا پر صاحب خلافت جس طرح مناسب سمجھے اس کو صرف کرسکتا ہے، اسی طرح خمس کی نسبت ارشاد ہوا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (انفال)

مسلمانو! جان لو کہ تم کو جو مال غنیمت ہاتھ آئے اس کا پانچواں حصہ خدا و رسول، اہل قرابت اور یتیموں اور مسکینوں کا ہے۔

[1] ابوداؤد باب اخذ الجزیہ [2] ابوداؤد اخذ الجزیہ من المجوس و تاریخ بلاذری ذکر بحرین۔

ایک دو استثنائی واقعہ کے سوا جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت مخصوص مہاجرین کو یا مکہ کے نومسلموں کو عنایت فرمایا، ہمیشہ آپ کا یہ طرز عمل رہا کہ خمس کے بعد ایک ایک حصہ سپاہیوں پر برابر برابر تقسیم فرما دیتے تھے، سواروں کو تین حصے اور پیادہ کو ایک حصہ، بعض روایتوں میں ہے کہ سواروں کو صرف دو حصے ملتے تھے[1] خمس کا بھی عموماً بہت کم حصہ ذاتی مصرف میں آتا تھا، آیت بالا میں جن ارباب استحقاق کا ذکر ہے، زیادہ تر ان ہی پر صرف کر دیا جاتا تھا۔

زکوٰۃ۔ صرف مسلمانوں پر فرض تھی، اور وہ چار مدوں سے وصول ہوتی تھی، نقد روپیہ[1] پھل اور پیداوار، مویشی[2]، (بجز گھوڑا) اسباب تجارت[3]، دو سو درہم چاندی، بیس مثقال سونے اور پانچ اونٹ سے کم پر زکوٰۃ نہ تھی، پیداوار سے جو زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کی مقدار ۵ وسق (۳۰۰ صاع بہ تحقیق امام ترمذی) یا پانچ وسق سے زیادہ ہو، سونا اور چاندی کا چالیسواں حصہ وصول کیا جاتا تھا، مویشیوں کا نرخ زکوٰۃ بھی مختلف جنس کی مختلف تعداد پر مقرر تھا جو حدیث اور فقہ کی تمام کتابوں میں مفصل مذکور ہے، اراضی کی دو قسمیں کی گئیں، ایک وہ جس کی سیرابی صرف بارش یا بہتے پانی سے ہوتی ہے[3]، اس قسم کی اراضی کی پیداوار میں دسواں حصہ (عشر) وصول ہوتا تھا، اور جس کو آب پاشی کے ذریعہ سے سیراب کیا جاتا تھا، اس میں نصف عشر یعنی بیسواں حصہ لیا جاتا تھا[4]، سبزی پر کوئی زکوٰۃ نہ تھی[5]،

زکوٰۃ کے آٹھ مصرف تھے، جن کی تفصیل خود قرآن مجید نے کر دی تھی، فقراء[1]، مساکین[2]، نومسلم[3]، غلام[4]،

---

[1] ابوداؤد حکم ارض خیبر، بروایت مجمع [2] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب العروض، اذا کانت للتجارۃ [3] صحیح بخاری جلد ۱ ص ۲۰۱ [4] ترمذی کتاب الزکوٰۃ [5] ایضاً

Marfat.com

جن کو خریا کر آزاد کرانا ہے، مقروض، مسافر، محصلینِ زکوٰۃ کی تنخواہ، دیگر کارِ خیر عموماً جہاں سے زکوٰۃ کی رقم وصول کی جاتی تھی، وہیں کے مستحقین پر صرف کر دیجاتی تھی صحابہ اس حکم کے اسقدر عادی ہو گئے تھے کہ ایک صحابی کو زیاد نے عامل بنا کر ایک مقام میں بھیجا، جب وہ واپس آئے تو زیاد نے ان سے رقم کا مطالبہ کیا، انھوں نے جواب میں کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے جس طرح ہم کرتے آئے تھے وہی ہم نے کیا[۱] معاذ بن جبل جب عامل بنا کر یمن بھیجے گئے تو زکوٰۃ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وصدقة توخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم۔

جزیہ غیر مسلم رعایا سے ان کی حفاظت اور ذمہ داری کے معاوضہ میں لیا جاتا تھا، اس کی مقدار متعین نہ تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں ہر مستطیع بالغ مرد سے ایک دینار وصول کرنے کا حکم دیا تھا، بچے اور عورتیں اس میں داخل نہ تھیں، ایلہ کے جزیہ کی مقدار ۳۰۰ دینار تھی، عہد نبویؐ میں جزیہ کی سب سے بڑی مقدار بحرین سے وصول ہوتی تھی،

خراج غیر مسلم کاشتکاروں سے حق مالکانہ کے معاوضہ میں زمین کی پیداوار کا جو مخصوص حصہ باہمی مصالحت سے طے ہو گیا ہو، اس کا نام خراج ہے خیبر، فدک، وادی القریٰ، تیما وغیرہ سے خراج ہی وصول ہوتا تھا، پھل یا پیداوار کے تیار ہونے کا وقت جب آتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی کو بھیج دیتے تھے، وہ باغوں اور کھیتوں کو دیکھکر تخمینہ لگاتے تھے، رفع اشتباہ کیلئے تخمینہ میں سے ثلث کم کر دیا جاتا تھا[۲] بقیہ پر حسب شرائط خراج وصول کیا جاتا، خیبر وغیرہ میں آدھی پیداوار پر صلح ہوئی تھی،

جزیہ اور خراج کی رقم سپاہیوں کی تنخواہ اور جنگی مصارف میں صرف ہوتی تھی، تمام صحابہ ضرورت

[۱] ابو داؤد کتاب الزکوٰۃ، باب الصدقۃ تحمل من البلد الی بلد [۲] بحوالہ مذکور باب فی الخرص

Marfat.com

کے وقت والنٹیر سپاہی تھے، جو کچھ وصول ہو کر آتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب کو اسی وقت تقسیم فرما دیتے، اول آپ ان لوگوں کو عطا فرماتے تھے جو پہلے غلام رہ چکے تھے، ایک جسٹر پر لوگوں کے نام لکھے ہوتے تھے اسی ترتیب سے نام پکارے جاتے تھے، جو لوگ صاحب اہل وعیال ہوتے تھے، ان کے دو حصے اور مجرد لوگوں کو ایک حصہ ملتا تھا)[1]

جاگیریں اور افتادہ زمینوں کی آبادی ملک عرب کا اکثر حصہ ریگستانی، پتھریلا، شور اور بنجر تھا، جو سرسبز قطعات تھے، ان پر بیرونی قومیں قابض تھیں، بقیہ افتادہ زمینیں تھیں، مدینہ اور طائف میں البتہ کاشتکاری ہوتی تھی، بقیہ عام عرب تجارت یا لوٹ مار پر زندگی بسر کرتے تھے، عربوں کی غیر مامون زندگی کا راز یہی تھا، کہ وہ مستقل پیشہ ور نہ تھے، اس بنا پر قیام امن کے لیے بھی ضروری تھا کہ زمین کا نئے سے بندوبست کیا جائے، حجاز، یمن میں غیر قوموں کے انخلا کے سبب سے یوں بھی بہت سی زمینیں خالی ہو گئی تھیں، جن کا انتظام ضروری تھا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام طور پر صحابہ کو اس کی ترغیب دی،

من احیا ارضا میتة فھی لہ	جس شخص نے افتادہ زمینوں کو آباد کیا وہ اسکی ملک ہے،
من احاط حائطا علی ارض فھی لہ	جس شخص نے کسی زمین کو گھیر لیا وہ اس کی ملک ہے،

ترغیب عام کے ساتھ خاص خاص انتظامات بھی فرمائے، بنو نضیر اور قریظہ کے نخلستان اور کھیت خاص بارگاہ نبوت کی ملک قرار پائے، اور آپ نے اپنی طرف سے ان کو مہاجرین اور بعض انصار میں تقسیم فرما دیا، خیبر کی زمین کچھ خالصہ رہی، اور بقیہ ان مہاجرین و انصار میں تقسیم فرما دی جو حدیبیہ میں شریک

---

[1] ابو داؤد کتاب الخراج باب قسم الفئ،

Marfat.com

تھے لیکن عملاً یہودیوں کے ساتھ ان کا بندوبست رہا، پیداوار کا نصف حصہ وہ خود لیتے تھے اور نصف
مالکوں کو ادا کرتے تھے، اور جو زمینیں آباد تھیں ان کو بعض شرائط پر اصل مالک کے ہاتھ میں رہنے دیا
چنانچہ عک، ذوخیوان اور ایلہ، اذرح، نجران وغیرہ میں اسی طرح معاملات طے پائے، افتادہ زمینیں
بھی صحابہ کو بطور جاگیر عطا فرمادیں، حضرت وائلؓ کو حضرموت میں ایک قطعۂ زمین عنایت فرمایا، بلال
ابن حارث مزنی کو قابلِ زراعت زمین کا ایک بہت بڑا ٹکڑا اور کانیں مرحمت فرمائیں، حضرت زبیرؓ
کو مدینہ کے پاس اور حضرت عمرؓ کو خیبر میں جاگیریں عطا کیں، بنو رفاعہ کو دومۃ الجندل کے پاس زمین عنایت کی
یہ جاگیریں اس فیاضی اور وسعت کے ساتھ دیجاتی تھیں کہ ہر شخص حسب استطاعت ان کا انتخاب
اور ان کے رقبہ کی تحدید کرسکتا تھا، ایک بار آپ نے حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ جہاں تک ان کا گھوڑا دوڑ سکے
وہ زمین ان کی جاگیر میں داخل ہوگی، چنانچہ انھوں نے گھوڑا دوڑایا جب گھوڑا ایک خاص حد تک
پہنچکر رک گیا تو انھوں نے اپنا کوڑا پھینکا، اور وہ جس نقطے پر گرا، وہی انکی جاگیر کا رقبہ قرار پایا، عرب
کی خشک زمین میں سب سے زیادہ ضرورت چشمہائے آب کی تھی، چنانچہ ایک بار جب آپ نے حکم دیا
من سبق الی ماء لم یسبقہ الیہ مسلم فھو لہ۔ یعنی جو شخص ایسے چشمہ پر قبضہ کرلے جس پر
کسی مسلمان نے قبضہ نہیں کیا ہے تو وہ اس کا ہے"۔ تو تمام لوگوں نے دوڑ دوڑ کر اپنے اپنے
چشموں کے حدود مقرر کرلیے۔

اس فیاضی کی اس قدر شہرت ہوئی کہ لوگوں نے دور دور سے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ
سے جاگیروں کی درخواست کرنا شروع کی، ابیض بن حمال یمن سے خدمتِ مبارک میں حاضر ہوئے
اور ایک نمک کی کان کی درخواست کی جس کو آپ نے منظور فرمالیا، لیکن ایک صحابی نے کہا کہ آپ نے ا

Marfat.com

کچھ جاگیر میں عطا فرمایا ہو وہ پانی کا ایک بہت بڑا چشمہ ہو، چونکہ وہ ایک پبلک چیز تھی، اس بنا پر آپ نے اس کو واپس لے لیا،

یہ تمام فیاضیاں صرف ان ہی چیزوں کیساتھ مخصوص تھیں جنکا تعلق پبلک کے ساتھ نہیں ہو سکتا تھا، لیکن جو چیزیں رفاہِ عام کے کام میں آسکتی تھیں انکو آپ نے اسی قدیم حالت پر چھوڑ دیا، عرب کا قدیم دستور تھا کہ اپنے مویشیوں کیلیے چراگاہیں متعین کر لیتے تھے جنکو حمیٰ کہتے تھے، عرب میں پیلو کا درخت اونٹوں کی عام غذا تھی، اور اس کے متعلق کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی لیکن ابیض بن حمال نے جب اس کو اپنے حمیٰ میں داخل کرنا چاہا تو آپ نے منع فرمایا لا حمی فی الاراک۔

عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ مویشیوں کے چرانے کے لیے رؤسا اور ارباب اقتدار اپنے لیے چراگاہ مخصوص کر لیتے تھے اور وہاں کسی دوسرے کو نہیں آنے دیتے تھے، چونکہ اس سے عام لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی اس لیے اس طریقہ کو بھی روک دیا،[۵]

اسی طرح عرب میں ایک مقام دہنا ہے جسکے ایک طرف بکر بن وائل کا قبیلہ تھا اور دوسری طرف بنو تمیم رہتے تھے، حریث بن حسان نے بکر بن وائل کیلیے اس زمین کی درخواست کی، آپ نے فرمان لکھنے کا حکم دیا، اتفاق سے اس وقت ایک تمیمیہ موجود تھی، آپ نے اسکی طرف دیکھا، اس نے عرض کی یا رسول اللہ! وہ اونٹوں اور بکریوں کی چراگاہ ہے، اور اسی کے پاس بنو تمیم کی عورتیں اور بچے بھی رہتے ہیں، آپ نے فرمایا "بیچاری سچ کہتی ہے، فرمان نہ لکھو، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، ایک چشمہ اور ایک چراگاہ سب کو کافی ہو سکتا ہے۔")

[۵] یہ تمام واقعات ابوداؤد کتاب الخراج کے مختلف ابواب میں مذکور ہیں،

Marfat.com

مذہبی انتظامات

ملک میں امن قائم رکھنے کی غرض سے جو بعض ضروری انتظامات سرانجام پائے تھے ان سے زیادہ ضروری مسلمانوں کے مذہبی امور کے انتظامات کا مسئلہ تھا۔ یہودیوں میں مذہبی فرائض کے ادا کرنے کے لیے ایک مخصوص خاندان مقرر تھا۔ اس کے علاوہ کسی اور کو ان خدمات کی بجاآوری کا حق حاصل نہیں ہو سکتا تھا عیسائیوں میں گو خاندان کی تخصیص نہ تھی لیکن ان میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس نے ان خدمات کو اپنا حق قرار دے لیا تھا۔ ہندوؤں میں غیر برہمن کسی مذہبی خدمت کا مستحق نہیں، دنیا کی دوسری قوموں کا بھی یہی حال تھا لیکن جو شریعت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں قائم کی اس میں مخصوص اشخاص مخصوص خاندان اور مخصوص طبقہ کی حاجت نہ تھی، بلکہ ہر شخص جو اسلام کا کلمہ گو تھا۔ اس رتبہ کا مستحق ہو سکتا تھا)

دعاۃ اور معلمین اسلام | ایک مشہور مغربی مورخ نے لکھا ہے کہ "مدینہ میں آکر اسلام نبوت کا منصب چھوڑ کر سلطنت بن گیا تھا، اور اب اسلام کے معنی بجائے اسکے کہ خدا پر ایمان لایا جائے، یہ رہ گئے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت تسلیم کرلی جائے"[1]، اسلام کا مقصد وہ تھا جو خدا نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا	(وہ لوگ جنکو ہم زمین میں اگر طاقت دیں تو نماز قائم
الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ	کریں، زکوٰۃ دیں، اچھی باتوں کا حکم دیں،

[1] دیکھو ولیموسن صاحب آرٹیکل اسلام پر (انسائیکلوپیڈیا)

Marfat.com

وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (حج) اور بری باتوں سے روکیں)

اس بنا پر ہر مسلمان واعظ بھی ہوتا تھا اور محتسب بھی، داعی مذہب بھی اور راہبر شریعت بھی یہی وجہ ہے کہ یا تو اسلام سے پہلے عرب میں اسقدر جہالت پائی جاتی تھی کہ شرفا میں لکھنا پڑھنا عیب خیال کیا جاتا تھا، یا ایک ایک گھر فقہ، حدیث اور تفسیر کا دار العلم بن گیا، تاہم چونکہ ہر شخص کو تفقہ و تدریس کا کافی وقت نہیں مل سکتا تھا، اسلیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ ہر جماعت اور ہر قبیلہ میں کچھ ایسے لوگ موجود رہیں جو تعلیم وارشاد کا فرض انجام دے سکیں، اسی بنا پر قرآن مجید میں حکم آیا۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (توبہ، رکوع ۱۴)

اور سب کے سب مسلمان تو سفر کر کے (مدینہ) نہیں آ سکتے اسلیے ہر قبیلہ سے ایک گروہ کو آنا چاہیے تاکہ وہ شریعت (دین) میں تفقہ حاصل کریں اور تاکہ واپس جا کر اپنی قوم کو ڈرائیں شاید یہ لوگ بری باتوں سے بچیں،

ان کی تعلیم و تربیت چونکہ مقصد یہ تھا کہ ایک ایسی جماعت تیار کیجائے جو نہ صرف شریعت کے اوامر و نواہی سے واقف ہو بلکہ شب و روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنے سے تمام اسلامی رنگ میں ڈوب جائے، جسکی گفتار، کردار، بات چیت، نشست و برخاست، قول و عمل ایک ایک چیز تعلیم نبوی کے پرتو سے منور ہو جائے، تاکہ وہ تمام ملک کے لیے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل بن سکے، اس لیے عرب کے ہر قبیلہ سے ایک جماعت آتی تھی اور آپ کی خدمت میں رہ کر تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتی تھی حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔

كَانَ يَنْطَلِقُ مِنْ كُلِّ حَيٍّ مِنَ الْعَرَبِ عِصَابَةٌ

عرب کے ہر قبیلہ کا ایک گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

Marfat.com

فیاتون النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیسألونه	جاتا تھا اور آپ سے مذہبی امور دریافت
عما یریدون من امر دینهم ویتفقهوا	کرتا تھا، اور دین میں تفقہ حاصل
فی دینهم[1]	کرتا تھا،

داعیانِ اسلام جو اطراف عرب میں بھیجے جاتے تھے، ان کو ہدایت کی جاتی تھی کہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وطن چھوڑ کر مدینہ میں آجائیں، اور یہیں بود و باش اختیار کریں، اسکا نام ہجرت تھا، اس بنا پر بیعت کی دو قسمیں کر دی گئی تھیں، بیعت اعرابی اور بیعت ہجرت بیعت اعرابی صرف ان بدوؤں کے لیے تھی جن کو کچھ دنوں مدینہ منورہ میں رکھکر تعلیم دینا مقصود تھا، مختصر مشکل الآثار میں روایت ہے کہ عقبہ جہنی جب اسلام لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ بیعتِ اعرابی کرتے ہو یا بیعتِ ہجرت، اس کے بعد مصنف لکھتا ہے۔

ان البیعة من المهاجر توجب الاقامة	ہجرت کی بیعت کرنے سے لازم ہو جاتا ہے کہ آنحضرت
عنده صلی اللہ علیہ وسلم لیصرف فیما یصرفه	صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قیام کرے تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
فیه من امور الاسلام بخلاف	انکو اسلامی امور میں لگائیں اور بیعت اعرابی
البیعة الاعرابیة	میں یہ ضرور نہیں

اسی بنا پر عرب کے بہت سے خاندان اپنے گھروں سے ہجرت کر کے مدینہ میں چلے آئے تھے، حضرت ابوموسیٰ اشعری آئے تو اسی شخصوں کو لے کر آئے، اور مدینہ میں آباد ہوئے، خلاصۃ الوفاء سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں جہینہ وغیرہ قبائل کی الگ الگ مسجدیں تھیں، یہ وہی قبائل تھے

[1] تفسیر خازن سورہ توبہ آیت وماکان المومنون لینفروا کافۃ

جو ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تھے، اور چونکہ مسجد نبوی سب کے لیے کافی نہ تھی، اس لیے الگ الگ مسجدیں بن گئی تھیں۔

تعلیم و ارشاد کے مختلف طریقے تھے۔

ایک یہ کہ دس بیس دن یا مہینہ دو مہینہ رہ کر عقائد اور فقہ کے ضروری مسائل سیکھ لیتے تھے اور اپنے قبائل میں واپس جاتے تھے، اور ان کو تعلیم دیتے تھے، مثلاً مالک بن الحویرث جب سفارت لے کر آئے تو بیس دن قیام کیا، اور ضروری مسائل کی تعلیم حاصل کی جب چلنے لگے تو آپ نے فرمایا،

رجعوا الی اھلیکم فعلموھم ومروھم	اپنے خاندان میں واپس جاؤ، ان میں رہ کر ان کو
وصلوا کما رایتمونی اصلی	اوامر شریعت کی تعلیم دو، اور جس طرح مجھکو نماز پڑھتے
(بخاری باب رحمۃ البھائم)	دیکھا ہے، اسی طرح نماز پڑھو،

دوسرا مستقل طریقہ درس کا تھا یعنی لوگ مستقل طریقہ سے مدینہ میں رہتے تھے، اور عقائد شریعت اور اخلاق کی تعلیم پاتے تھے، ان کے لیے صفہ کا خاص درسگاہ تھا، اور اس میں زیادہ تر وہ لوگ قیام کرتے تھے، جو تمام دنیاوی تعلقات سے آزاد ہو کر شب و روز زہد و عبادت اور زیادہ تر خدمتِ علم میں مصروف رہتے تھے۔

مشکوٰۃ کتاب العلم میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے، اس وقت مسجد میں دو حلقے تھے، حلقۂ ذکر، اور حلقۂ درس، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حلقۂ درس میں جا کر بیٹھ گئے، اس وقت کی اصطلاح میں ان طالبان علم کو قُرّاء کہتے تھے، چنانچہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہر جگہ

Marfat.com

یہی نام آتا ہے، عرنیہ میں جو لوگ تعلیم و ارشاد کو لیے گئے تھے، اور کفار نے ان کو دھوکے سے شہید کر دیا تھا، وہ اسی درسگاہ کے تربیت یافتہ تھے، اور کتبِ حدیث میں ان کا نام اسی لقب (قراء) کے ساتھ آیا ہے، اربابِ سیر نے لکھا ہے کہ ان لوگوں میں سے جب کوئی شادی کر لیتا تھا، تو اس جماعت سے نکل آتا تھا اور ان کے بجائے دوسرے لوگ داخل ہوتے تھے،

اصحاب صفہ اگرچہ اس قدر مفلس اور نادار تھے کہ کسی کے پاس ایک کپڑے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا جس کو گردن سے باندھ کر گھٹنوں تک چھوڑ دیتے تھے، کہ چادر اور تہمد دونوں کا کام دیتا تھا، تاہم یہ لوگ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھتے تھے، بلکہ جنگل میں جا کر لکڑیاں چن لاتے تھے، اور ان کو بیچکر آدھا خیرات کر دیتے تھے اور آدھا اخوان طریقت میں تقسیم ہوتا تھا، اس بنا پر تعلیم اور درس کا وقت رات کو مقرر کیا گیا بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس درسگاہ کے معلمین میں حضرت عبادہ بن الصامت بھی تھے جو مشہور صاحبِ علم تھے، اور جن کو حضرت عمرؓ نے زمانۂ خلافت میں تعلیم فقہ و قرآن کے لیے فلسطین بھیجا تھا، ابو داؤد میں حضرت عبادہ بن الصامت سے روایت ہے،

علّمت ناسًا من اھل الصفۃ القرآن والکتاب فاھدی الی رجل منھم قوسا (صفحہ ۱۲۹ جلد دوم)

میں نے اصحاب صفہ میں سے چند لوگوں کو قرآن مجید اور لکھنے کی تعلیم دی، اس کے صلہ میں مجکو ایک شخص نے ایک کمان تحفہ میں دی

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادہؓ کو اس تحفہ کے قبول کرنے کی اجازت نہیں دی بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ درسگاہ صفہ کے علاوہ اور بھی کوئی جگہ تھی، جہاں

---

۵ صحیح بخاری غزوۂ بیر معونہ۔

Marfat.com

اصحابِ صفہ رات کو تعلیم پاتے تھے، مسند امام ابن حنبل میں ہے:

عن انس کانوا سبعین وکانوا اذا جنّھم اللیل انطلقوا الی معلّم لھم بالمدینۃ فیدرسون اللیل حتی یصبحوا (ج ۳ ص ۱۳۷)	حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اصحاب صفہ میں سے ستر شخص رات کو ایک معلم کے پاس جاتے تھے اور صبح تک درس میں مشغول رہتے تھے۔

عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا، لیکن اسلام آیا تو تحریر و کتابت کا فن بھی گویا ساتھ لیکر آیا، سب سے بڑی ضرورت قرآن مجید کے ضبط و تدوین کی تھی، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع ہی سے کتابت کی ترویج کی طرف توجہ فرمائی، جنگ بدر کے ذکر میں گذر چکا ہے کہ اسیرانِ جنگ میں سے جو لوگ فدیہ نہیں ادا کر سکے ان کو اس شرط پر رہا کیا گیا کہ مدینہ میں رہ کر لوگوں کو لکھنا سکھا دیں، ابوداؤد کی مذکورۂ بالا حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحابِ صفہ کو جو تعلیم دیجاتی تھی اس میں لکھنا بھی داخل تھا، چنانچہ حضرت عبادہؓ قرآن مجید کے ساتھ لکھنے کی بھی تعلیم دیتے تھے۔

مساجد کی تعمیر (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم[1] اگرچہ ترفہ و جاہ پرستی سے طبعاً نفور تھے، اور اسلیے اینٹ اور مٹی پر صرف زر ناپسند فرماتے تھے، تاہم چونکہ اسلام کی تمام تحریکات کا مقصد صرف رفع ذکر اور تسبیح و تقدیس الٰہی تھا، اس بنا پر ہر قبیلہ کو مسلمان ہونے کے ساتھ سب سے پہلے مسجد کی ضرورت پیش آتی تھی، ایک سبب اس کا یہ بھی تھا کہ یہ مسجدیں صرف نماز ہی پڑھنے کے کام میں نہیں آتی تھیں، بلکہ درحقیقت یہ تمام قریہ یا اہل محلہ کو دن میں پانچ بار ایک جگہ جمع کر کے انکی اجتماعی اور اتحادی قوت کو روز بروز اور زیادہ ترقی دینے کا ذریعہ بنتی تھیں، اس لیے آپ باجماعت نماز پڑھنے کی سخت تاکید فرماتے تھے،

[1] اضافہ تا ختم باب "موذنین"

Marfat.com

خود مدینہ کے اندر بہت سے قبائل آباد تھے، ہر قبیلہ کا الگ الگ محلہ تھا، اور ہر محلہ میں ایک ایک مسجد تھی،
ابوداؤد نے کتاب المراسیل میں بسند لکھا ہے کہ صرف مدینہ کے اندر آپ کے زمانہ میں ۹ مسجدیں تھیں،
جہاں الگ الگ جماعتیں ہوتی تھیں، ان کے نام یہ ہیں: مسجد بنی عمرو، مسجد بنی ساعدہ، مسجد بنی عبید،
مسجد بنی سلمہ، مسجد بنی رابح، مسجد بنی زریق، مسجد غفار، مسجد اسلم، مسجد جہینہ، انکے علاوہ متفرق روایات
میں مختلف قبائل کی حسب ذیل مسجدوں کا اور پتہ لگتا ہے، مسجد بنی خدارہ، مسجد بنی امیہ (انصار کا ایک قبیلہ
تھا) مسجد بنی بیاضہ، مسجد بنی الحبلی، مسجد بنی عصیہ، مسجد ابی فضیلی، مسجد بنی دینار، مسجد ابی بن کعب
مسجد النابغہ، مسجد ابن عدی، مسجد بلحارث بن خزرج، مسجد بنی حطمہ، مسجد الفضیخ، مسجد بنی حارثہ، مسجد
بنی ظفر، مسجد بنی عبد الاشہل، مسجد واقم، مسجد بنی معاویہ، مسجد عاتکہ، مسجد بنی قریظہ، مسجد بنی وائل، مسجد الشجرۃ[۱]
روایتوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ اشاعت اسلام کے ساتھ مدینہ سے باہر عرب کے گوشہ گوشہ میں
مسجدیں بنتی جاتی تھیں، جہاں دن میں پانچ بار خدا کا نام پکارا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوات
میں معمول کر لیا تھا کہ رات بھر انتظار فرماتے تھے، صبح کو جہاں سے اذان کی آواز آتی وہاں حملہ نہ
فرماتے، چنانچہ ایک سفر جہاد میں آپ کے کانوں میں ایک طرف سے اللہ اکبر کی آواز آئی، تو آپ نے فرمایا
یہ تو فطری شہادت ہے" اس کے بعد آپ نے اشھد ان لا الہ الا اللہ کی آواز سنی تو فرمایا "آگ
سے نجات ہوگئی" صحابہ نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو معلوم ہوا کہ بکرے کے چرواہے کی آواز ہے[۲]
تمام مجاہدین اسلام کو بھی یہی حکم تھا، چنانچہ ایک بار آپ نے ایک سریہ کو روانہ کیا تو یہ وصیت فرمائی،

---

[۱] یہ تمام تفصیل عینی شرح بخاری جلد ۲ ص ۴۰۸ سے ماخوذ ہے [۲] صحیح مسلم جلد اول کتاب الاذان باب الامساک عن الاغارۃ علی قوم فی دار الکفر اذا سمع فیہم الاذان

اذا رأيتم مسجدًا او سمعتم صوتًا فلا تقتلوا احدًا[1] — اگر کہیں مسجد دیکھو یا اذان کی آواز سنو تو وہاں کسی شخص کو قتل نہ کرو۔

ان روایتوں سے ایک طرف تو عہد نبوت میں اشاعت اسلام کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، اور دوسری یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو قبائل اسلام لائے تھے، انھوں نے الگ الگ مسجدیں تعمیر کرلی تھیں، اور ان میں پنج وقتہ غلغلۂ تکبیر و اذان بلند ہوا کرتا تھا۔

اگرچہ اس وقت کی عام غربت اور سادگی کی وجہ سے جو مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں وہ ایک زمانۂ ممتد تک قائم نہیں رہ سکتی تھیں، اس لیے ان باقیات صالحات کا بہت بڑا حصہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا، اور ان کے ساتھ ان کا نام اور ان کی تاریخ بھی مٹ گئی تاہم جو مسجدیں مدتوں قائم رہیں، ان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کا کوئی گوشہ ان مذہبی یادگاروں سے خالی نہ تھا۔

عرب کے عام قبائل سے بحرین کا ایک قبیلہ عبد القیس اسلام لاچکا تھا، اس قبیلہ نے ایک مسجد تعمیر کی تھی، چنانچہ اسلام میں مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلے جمعہ کی نماز اسی مسجد میں ادا کی گئی، بخاری کتاب الجمعہ میں ہے:

عن ابن عباس انه قال ان اول جمعة جمعت بعد جمعة فى مسجد رسول الله صلى الله عليه وسلم فى مسجد عبد القيس بجواثى من البحرين — حضرت عبد اللہ بن عباس سے روایت ہے کہ مسجد نبوی کے بعد پہلا جمعہ قبیلہ عبد القیس کی مسجد میں پڑھا گیا جو بحرین کے ایک گاؤں جواثی نامی میں واقع تھی۔

اہل طائف جب اسلام لائے تو آپ نے ہدایت فرمائی کہ خاص اس جگہ مسجد تعمیر کرائیں،

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد فی دعاء المشرکین [2] نسائی کتاب المساجد صفحہ ۱۱۸

جہاں ان کا بت نصب تھا[1] حضرت طلق بن علیؓ سے روایت ہے کہ جب ہماری قوم کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے عرض کی کہ ہمارے ملک میں ایک گرجا ہے تو آپ نے اپنے وضو کا پانی عنایت فرمایا اور ہدایت کی کہ گرجے کو توڑ ڈالو اور وہاں یہ پانی چھڑک کر مسجد بنا لو، چنانچہ جب وہ لوگ واپس آئے تو حسب ارشاد مسجد تعمیر کرلی،[2]

اس قسم کی مسجدیں اگرچہ عرب کے گوشہ گوشہ میں تعمیر ہوئی ہونگی لیکن عموماً احادیث کی کتابوں سے صرف ان مسجدوں کا حال معلوم ہوسکتا ہے، جو مدینہ اور حوالی مدینہ میں تعمیر ہوئیں، صحیح مسلم میں ہے کہ حوالی مدینہ میں انصار کے جو گاؤں آباد تھے، عاشورا کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ان میں منادی کرادی کہ جو لوگ روزہ دار ہیں وہ اپنے روزے کو پورا کرلیں اور جو لوگ افطار کرچکے ہیں وہ بقیہ دن روزہ رکھیں، اس اعلان کے بعد صحابہ نے اس پر اس شدت کے ساتھ عمل کیا کہ خود روزے رکھتے تھے اور اپنے بچوں سے روزے رکھواتے تھے، یہاں تک کہ ان کو گھر سے باہر مسجد میں لیجا کر رکھتے تھے، اور جب وہ کھانے کے لیے روتے تھے تو ان کو ان کے بنے ہوئے کھلونوں سے بہلاتے تھے،[3]

امام بخاری نے صحیح بخاری میں ایک مستقل باب باندھا ہے کہ مساجد کو اشخاص کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟" اور اس باب کے تحت میں جو حدیث لائے ہیں، اس میں بہ تصریح مسجد بنی زریق کا نام لیا ہے، حضرت انس بن مالکؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عصر کی نماز

---

[1] زاد المعاد جلد اول صفحہ ۴۸۵ بروایت ابوداؤد الطیالسی [2] سنن نسائی کتاب المساجد صفحہ ۱۱۸

[3] صحیح مسلم کتاب الصیام باب من اکل فی عاشورا فلیکف بقیہ یومہ

Marfat.com

پڑھ کر اپنے محلہ میں آتے تھے، یہاں لوگ مسجد میں منتظر رہتے تھے، وہ آکر کہتے تھے کہ مسجد نبوی میں نماز ہو چکی، تب لوگ یہاں نماز پڑھتے تھے[1]، ان روایتوں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ان قبائل کی مسجدیں الگ الگ تھیں صحاح کی روایتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک جماعت ہوتے تھے، اور پھر اپنے محلہ کی مسجد میں جاکر اپنی قوم کی امامت کرتے تھے، چنانچہ حضرت معاذ بن جبلؓ کا اسی پر عمل تھا، مدینہ میں جو قبائل آباد تھے، ان کے علاوہ جو قبائل ہجرت کرکے آتے تھے وہ بھی اپنی مسجد تعمیر کر لیتے تھے، چنانچہ طبقات ابن سعد میں ہے،

ولجھینۃ مسجد بالمدینۃ[2] — مدینہ میں جہینہ کی ایک مسجد ہے

قبائل کی ضروریات کے علاوہ مسجدوں کی تعمیر کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راہ میں جہاں کہیں نماز پڑھتے تھے، وہاں صحابہ تبرکاً مسجد تعمیر کر لیتے تھے، امام بخاری نے صحیح بخاری میں مستقل باب باندھا ہے جس کا عنوان یہ ہے باب المساجد التی علی طریق المدینۃ والمواضع التی صلی فیھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم، یعنی وہ مسجدیں جو مدینہ کے راستوں اور ان مقامات میں واقع ہیں جہاں آپ نے نماز پڑھی ہے، اور اس کے تحت میں اس قسم کی متعدد مسجدوں کا نام لیا ہے، اور حافظ ابن حجر نے ان کے حسب ذیل نام گنائے ہیں،

مسجد قبا، مسجد الفضیخ، مسجد بنی قریظہ، مشربہ ام ابراہیم، مسجد بنی ظفر یا مسجد بغلہ، مسجد بنی معاویہ مسجد فتح، مسجد قبلتین، حافظ ابن حجر نے یہ بھی لکھا ہے[3] کہ مدینہ اور اطراف مدینہ میں جو مسجدیں منقش پتھروں سے تعمیر ہوئی ہیں ان سب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی ہے، کیونکہ حضرت

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۲۳۲ [2] طبقات ابن سعد جز رابع ص ۱۷ [3] فتح الباری ج اول ص ۴۷۱

عمر بن عبد العزیز نے جب ان مساجد کی تجدید کی تھی تو اہل مدینہ سے اسکی تحقیق کر لی تھی[۱]

ائمہ نماز کا تقرر: مساجد کی تعمیر کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ مختلف قبائل کے لیے الگ الگ امام مقرر کر دیے جائیں، عموماً عادتِ شریف یہ جاری تھی کہ جو قبیلہ مسلمان ہو جاتا اس میں جو شخص سب سے زیادہ حافظِ قرآن ہوتا وہی امام مقرر کر دیا جاتا، اور اس شرف میں چھوٹے بڑے غلام آقا سب برابر تھے، آپ کی تشریف آوری سے پہلے مدینہ میں جو مہاجرین آچکے تھے، ان کے امام حضرت ابو حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالمؓ تھے، جرم کا قبیلہ جب اسلام لایا تو عمرو بن سلمہ جو اس وقت سات یا آٹھ برس کے کمسن بچہ تھے، لیکن چونکہ اپنے قبیلہ میں قرآن کے سب سے بڑے حافظ وہی تھے، اس لیے وہی امام قرار پائے،

امامت کے انتخاب کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اصول مقرر فرما دیے تھے،

عن ابی مسعود الانصاری قال قال	ابو مسعود انصاریؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یؤم القوم اقرأهم	علیہ وسلم نے فرمایا کہ جماعت کی امامت وہ کرے جو
لکتاب اللہ فان کانوا فی القراءة سواء	سب سے زیادہ کلام اللہ پڑھا ہو، اگر اس میں سب
فاعلمهم بالسنة فان کانوا فی السنة	برابر ہوں تو جو سنت سے سب سے زیادہ واقف ہو، اگر
سواء فاقدمهم هجرة فان کانوا فی الهجرة	اسمیں بھی مساوات ہو تو جس نے پہلے ہجرت کی تھی،
سواء فاقدمهم سنا (مسلم)	اور اسمیں بھی سب سے برابر ہوں تو جسکی عمر زیادہ ہو،

جب کوئی ایسا قبیلہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتا تو آپ پوچھتے کہ تم میں سب سے زیادہ

---

[۱] فتح الباری جلد اول صفحہ ۴۷۱

حافظِ قرآن کون ہے، اگر کوئی ایسا شخص ہوتا تو لوگ اس کا نام[1] لیتے اور آپ اس کو اس عہدہ پر خود ممتاز فرماتے، چنانچہ اہلِ طائف کے امام عثمان بن ابی العاص اسی طرح مقرر ہوئے تھے، اور سب مساوی الحیثیت ہوتے تو ارشاد ہوتا، تم میں جو بڑا ہو وہ جماعت کی امامت کرے، مالک بن حویرث جب اپنی قوم کی طرف سے بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ارشاد فرمایا،

مدینہ میں مدینہ سے باہر اطراف میں، عرب کے مختلف صوبوں میں جہاں جہاں مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں، ظاہر ہے کہ وہاں ہر جگہ الگ الگ امام مقرر ہوئے ہوں گے جن قبائل میں عمال مقرر ہوتے تھے، وہی ان کے امام بھی ہوتے تھے[2]، بڑے بڑے مقامات میں یہ دونوں عہدے الگ الگ ہوتے تھے، عمان میں حضرت عمرو بن العاص عامل تھے، اور ابو زید انصاری امام لیکن افسوس ہے کہ احادیث وسیر کی کتابوں میں نام بنام ان کی مستقل تفصیل مذکور نہیں ہے ضمنی واقعات میں جہاں تک سراغ لگ سکا ہے، وہ حسب ذیل ہے،

کیفیت	مقام تقرر	نام
ہجرت نبوی سے پہلے انصار کی امامت کرتے تھے، (ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ)	مدینہ منورہ	مصعب بن عمیر
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مہاجرین کے امام تھے (بخاری وابوداؤد)	"	سالم مولی ابی حذیفہ

[1] مسند ابن حنبل، جلد ۴ صفحہ ۲۱۸ [2] فتوح البلدان بلاذری

نام	مقام تقرر	کیفیت
ابن ام مکتومؓ	مدینہ منورہ	جب آپ مدینہ سے باہر غزوات میں تشریف فرما ہوتے تو اکثر صحابہ بھی ہمرکاب ہوتے لیکن چونکہ یہ آنکھوں سے معذور تھے، اس لیے مدینہ ہی میں رہتے تھے، اس سبب سے اس موقع پر ان ہی کو آپ امام مقرر فرما جاتے (ابوداؤد)
ابوبکر صدیقؓ	"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم تشریف آوری پر مسجد نبویؐ میں امام ہوتے تھے، (صحیح بخاری)
عتبان بن مالکؓ	بنو سالم	اپنے قبیلہ کے امام تھے، (ابوداؤد ونسائی)
معاذ بن جبلؓ	بنو سلمہ	" (بخاری وغیرہ)
ایک انصاری	مسجد قبا	" (بخاری)
عمرو بن سلمہؓ	بنو جرم	(ابوداؤد ونسائی)
اسید بن حضیرؓ		" (ابوداؤد)
انس بن مالک یا کوئی	بنو نجار	" (امام کا نام مشکوک ہے)
دوسرے صحابی)	.	(مسند جلد ۳ صفحہ ۲۳۲)
مالک بن حویرثؓ	.	" (ابوداؤد)
عتاب بن اسیدؓ	مکہ معظمہ	" (نسائی[1])

[1] کتب مذکورہ کی کتاب الصلوٰۃ سے یہ نام ملتقط ہیں،

نام	مقام تقرر	کیفیت
عثمانؓ بن ابی العاص	طائف	اپنے قبیلہ کے امام تھے، (ذکر وفد طائف)
ابو زید انصاریؓ	عمان	" (بلاذری ذکر عمان)

موذنین (عام طور پر اذان کے لیے کوئی خاص شخص منتخب نہیں کیا جاتا تھا، تاہم چند مثالوں سے قیاس ہوتا ہے کہ بڑی بڑی مسجدوں میں یہ عہدہ الگ آپ نے قائم فرمایا تھا، چنانچہ مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں اس عہدہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صاحبوں کو ممتاز فرمایا تھا،

نام	مقام تقرر	کیفیت
بلال بن رباحؓ	مدینہ منورہ	مؤذن مسجد نبوی
عمرو بن ام مکتوم قرشی	"	"
سعد القرظ	عوالی مدینہ	مؤذن مسجد قبا
ابو محذورہ جمحی قرشی[1]	مکہ مکرمہ	مؤذن مسجد حرام)

[1] نسائی صفحہ ۱۰۰

Marfat.com

تاسیس و تکمیل شریعت

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا

آج ہم نے تمھارا مذہب کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور اسلام کو تمھارے لیے مذہب پسند کیا۔

یہ تمام انتظامات اور نظم و نسق اسلام کا حقیقی نصب العین نہ تھا، بلکہ جیسا کہ بہ تفصیل اوپر بیان کیا جا چکا ہے، یہ اس لیے تھا کہ ملک میں امن و امان پیدا ہو، اور ایک منتظم اور باقاعدہ حکومت کا وجود ہو، تاکہ مسلمان بے روک ٹوک اور بلا مزاحمت اپنے مذہبی فرائض انجام دے سکیں، صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کسی نے اس آیت کے معنی پوچھے،

وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ — ان کافروں سے جہاد کرو، یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے۔

ویکون الدین کلہ للہ — اور مذہب تمامتر خدا کے لیے ہو جائے۔

انھوں نے فرمایا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا جب اسلام کم تھا، آدمی اپنے مذہب کی بنا پر فتنہ میں مبتلا ہو جاتا تھا، لوگ اس کو قتل کر دیتے تھے، اب جب اسلام ترقی کر گیا تو کوئی فتنہ نہیں رہا۔[1]

ہجرت سے آٹھ برس تک کا زمانہ تمامتر (ان ہی فتنوں کی دار و گیر، مخالفوں کی شورشوں اور ہنگاموں کی مدافعت اور ملک میں امن و امان قائم کرنے میں گذرا، اسی لیے) آٹھ برس کی دینی

[1] بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۷۰ تفسیر سورۂ انفال)

مدت میں فرائض اسلام سے جو چیز ہر جگہ اور ہر موقع پر نمایاں نظر آتی ہے، وہ صرف جہاد ہے، یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں ایک ایک غزوہ کی تفصیل سیکڑوں صفحات میں ہے لیکن نماز، روزہ، زکوٰۃ کے متعلق دو دو چار چار سطروں سے زیادہ واقعات نہیں ہیں وہ بھی اس طرح کہ جب کوئی سنہ ختم ہوتا ہے تو اس قدر لکھ دیتے ہیں کہ اسی سال فرض نماز کی رکعتیں دو سے چار ہو گئیں،

اس کی وجہ یہ نہیں کہ خدا نخواستہ ارباب سیر و تاریخ فرائض کی اہمیت اور عظمت پیش نظر نہیں رکھتے تھے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ غزوات کی مصروفیت (اور ملک کی بدامنی) کی وجہ سے اکثر فرائض دیر میں فرض ہوئے، اور جو پہلے فرض ہو چکے تھے ان کی تکمیل بھی بتدریج اسی زمانہ میں ہوتی رہی، جس کے لیل و نہار زیادہ تر مخالفین کے تیر باران کے روکنے میں بسر ہو گئے،

(جن احکام کا تعلق قانون ملکی سے تھا، وہ اس وجہ سے نازل نہ ہو سکے کہ اب تک اسلام کوئی حکمران طاقت نہ تھا، خالص مذہبی فرائض اور احکام بھی رفتہ رفتہ اسی زمانہ میں نازل ہوتے رہے، اور بتدریج جیسے جیسے اُن کے مناسب حالات پیدا ہوتے جاتے تھے، وہ تکمیل کو پہنچ رہے تھے، سب سے بڑا نکتہ احکام کے تدریجی نزول میں یہ تھا کہ ان سے مقصود محض عربوں کو انکا بتا دینا نہیں تھا بلکہ عملاً ان کی زندگی کو ان پر کاربند بنا دینا تھا، اس لیے نہایت آہستہ آہستہ بتدریج ترتیب کے ساتھ ان کو آگے بڑھایا گیا، اسی نکتہ کو حضرت عائشہؓ نے نہایت خوبی سے بیان فرمایا ہے کہ پہلے عذاب و ثواب کی آیتیں نازل ہوئیں جب دلوں میں استعداد اور رقت پیدا ہو گئی تو احکام نازل ہوئے، ورنہ اگر پہلے ہی دن یہ حکم ہوتا کہ شراب نہ پیو، تو کون مانتا[۵]

[۵] صحیح بخاری باب تالیف القرآن

Marfat.com

الغرض ان مختلف اسباب کی بنا پر اسلام کے اکثر فرائض اور احکام اس وقت تکمیل کو پہنچے جب تمام ملک میں امن و امان قائم ہوگیا، مکہ معظمہ کے قیام تک روزہ سرے سے فرض نہیں ہوا، مدینہ منورہ میں روزے فرض ہوئے، لیکن زکوٰۃ کی فرضیت سات آٹھ سال کے بعد ہوئی، اسکی وجہ یہی تھی کہ رات دن کی معرکہ آرائیوں سے مالی حالت اس حد تک پہنچنے کہاں پائی تھی کہ زکوٰۃ کی فرضیت کا موقع آتا، فتح مکہ سے پہلے مسلمان اس سرزمین مقدس پر قدم نہیں رکھ سکتے تھے، اسلیے اسوقت تک حج بھی فرض نہ ہوا، نماز روزانہ کا فرض ہے اور یہ فرض اسلام کے وجود کے ساتھ آیا لیکن اسکی تکمیل بتدریج ہجرت کے چھ سات برس کے بعد ہوئی، ۵ھ تک نماز میں بات چیت کرنا جائز تھا، اور کوئی باہر کا آدمی سلام کرتا تو نمازی عین نماز میں جواب دیتے تھے، جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ میں متعدد روایتیں مذکور ہیں[۱]

غرض فتح مکہ کے بعد جب کفر کا زور ٹوٹ گیا، اور تمام ملک میں امن و امان قائم ہوگیا تو مذہبی احکام کی تفصیل اور نظام شریعت کی تکمیل کا موقع آیا، احکام بہت سے ایسے تھے جو سرے سے ابھی شروع ہی نہیں ہوئے تھے مثلاً زکوٰۃ، حج، حرمت ربا وغیرہ، بہت سے ایسے تھے کہ ابتدائی ارکان قائم ہوگئے تھے لیکن تکمیل نہیں ہوئی تھی،[۲]

---

[۱] ابوداؤد باب رد السلام فی الصلوٰۃ) [۲] اسلام کے بعض احکام کے نزول اور تدریجی تکمیل کی تاریخ جلد اول کے واقعات متفرق سے تحت میں بھی ضمناً گذر چکی ہے، ناظرین ایک جگہ احکام کی تاریخ اور سنین میں یہاں سے اختلاف پائینگے، اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ جلد اول میں عام مورخین اور ارباب سیر کی تقلید کی گئی ہے، اور یہاں احادیث اور کتب شان نزول سے استقرا کر کے جوامر محقق نظر آیا ہے اس کی تفصیل کی گئی ہے اور اصل یہ ہے کہ احکام کے سنین اور تاریخیں کتب حدیث میں بالتصریح مذکور نہیں ہیں، محدثین اور ارباب روایت کے قیاسات اور استنباطات ہیں، اور اسی بنا پر باہم ان میں اختلافات ہیں، ہم نے کوشش کی ہے کہ صحیح اور معتبر دلائل کی رہنمائی سے اس راستہ کو طے کریں، والعصمۃ بید اللہ۔ س)

Marfat.com

عقائدؔ اور اسلام کے اصول اولین

اسلام کے فرائض اولین عقائد ہیں یعنی توحید، رسالت، ملائکہ، قیامت حشر ونشر وغیرہ پر ایمان لانا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اول اول جو وحی نازل ہوئی یعنی اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ۔ اس میں خدا کی بڑائی کے سوا کسی مخصوص عقیدہ کی تعلیم نہ تھی لیکن دوسری بار جو وحی نازل ہوئی وہ یہ تھی،[۲]

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ وَرَبَّكَ	اے چادر اوڑھنے والے اٹھ، لوگوں کو ڈرا، اپنے پروردگار
فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (مدثر)	کی بڑائی کر اور بتوں کو چھوڑ دے۔

اس کے بعد مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں جس قدر آیتیں نازل ہوئیں وہ بیشتر عقائد کے متعلق تھیں شرک اور بت پرستی کی برائی، خدا کی عظمت وجلال کا اظہار، قیامت کے ہولناک سماں اور جنت ودوزخ کا پراثر بیان، رسالت کے خواص اور اس کی ضرورت کے دلائل، مکہ میں تیرہ برس تک زیادہ تر یہی مطالب ادا ہوتے رہے،[۳]

غرض عقائد کے تمام اجزا اگرچہ آغاز اسلام ہی میں لوگوں کو سنائے جا چکے تھے لیکن مکی آیتوں کے استقصا سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایک کا بیان الگ الگ ہوتا تھا، عقائد کا مسلسل بیان سورہ بقرہ اور سورہ نسا میں ہے، اور یہ دونوں سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں، مکی سورتوں میں زیادہ تر زور توحید، قیامت کے اعتقاد اور رسول کی صداقت پر صرف ہوا ہے لیکن مدینہ میں

---

[۱] اضافہ تا ختم باب تیمم [۲] صحیح بخاری تفسیر سورہ مدثر، [۳] صحیح بخاری باب تالیف القرآن

Marfat.com

Marfat.com

سورۂ نسا کی آیت یہ ہے جس میں بالتفصیل بتایا گیا ہے کہ جو لوگ مسلمان ہو چکے ہیں ان کے کیا عقائد ہونے چاہئیں،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ	اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو، ایمان لاؤ خدا پر، اس کے
وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ	رسول پر، اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری
الَّذِي أَنزَلَ مِن قَبْلُ وَمَن يَكْفُرْ بِاللَّهِ	اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری، اور جو شخص خدا
وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ	کا، اور اس کے فرشتوں کا، اور اس کی کتابوں کا، اس کے پیغمبروں
فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا۔	کا اور روز آخرت کا انکار کریگا وہ سخت گمراہ ہوا،

احادیث کتاب الایمان میں بہت سے ایسے واقعات ہیں جن میں لوگوں نے آپ سے اسلام اور ایمان کے معنی دریافت کیے ہیں، اور آپ نے سائل کی یا وقت کی مناسبت سے مختلف جوابات دیے ہیں، آپ نے فرمایا کہ "مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لڑوں جب تک لوگ گواہی نہ دیں کہ خدا ایک ہے، محمد خدا کا پیغمبر ہے، نمازیں پڑھیں اور زکوٰۃ دیں"،

ایک دفعہ کسی دیہات سے ایک مسلمان حاضر خدمت ہوا، اور دریافت کیا کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے تین چیزیں بتائیں" رات دن میں پانچ وقت کی نماز، رمضان کے روزے اور زکوٰۃ" عبد القیس کے وفد نے ۵ھ میں حاضر ہو کر عرض کی کہ ہم دشمنوں کی مزاحمت کے سبب سے ہمیشہ نہیں حاضر ہو سکتے، اس لیے ایسے احکام بتا دیے جائیں جو ان لوگوں کو بھی سنا دیے جائیں جو شرف حضوری حاصل نہیں کر سکتے، آپ نے فرمایا:

شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا	اس بات کی شہادت کہ خدا ایک ہی ہے، محمد خدا کے

رسول اللہ، واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ	پیغمبر ہیں، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے
وصیام رمضان وان تعطوا من المغنم الخمس	رکھنا اور مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ دینا۔

ایک دفعہ آپ صحابہ کے مجمع میں تشریف فرما تھے، اس اثنا میں ایک شخص نے آکر سوال کیا، ایمان کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا "ایمان یہ ہے کہ خدا پر، فرشتوں پر، خدا کی ملاقات پر، اس کے پیغمبروں پر اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر یقین ہو"۔ اس نے پوچھا اور اسلام کیا ہے؟ فرمایا "اسلام یہ ہے کہ صرف خدا کو پوجو، کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، فرض زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو"۔ اس نے پھر دریافت کیا کہ "احسان کس کو کہتے ہیں؟" ارشاد ہوا کہ خدا کی اس طرح عبادت کرو، گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے"۔

یہ اصول اسلام کا تقریباً کامل نقشہ ہے، غالباً یہ سوال وجواب فتح مکہ یعنی ۸ھ سے پہلے کا واقعہ ہے، کیونکہ اس میں حج کا ذکر نہیں ہے، تاہم اس قدر اطمینان حاصل ہو چکا تھا کہ تکمیل عبادت کے لیے خضوع وخشوع کی قید بھی اضافہ کی جا سکی۔ اصول اسلام کا آخری اعلان یہ ہے:

بنی الاسلام علی خمس شہادۃ ان لا	اسلام کی بنا پانچ باتوں پر ہے، اس بات کی گواہی کہ
الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ واقام	خدا کے سوا کوئی اور خدا نہیں، محمد اس کا پیغمبر ہے، نماز
الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ والحج وصوم رمضان	پڑھنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا، رمضان کے روزے رکھنا۔

رفتہ رفتہ ایمان اور اسلام کے اصول کلیہ کی جب تکمیل ہو چکی تو اس کے جزئیات اور دیگر لوازم کی بھی تعلیم دی گئی، آپ نے فرمایا کہ "ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں، جن میں ایک شاخ حیا ہے" ایک دفعہ فرمایا کہ "بہترین اسلام یہ ہے کہ مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں"۔ ایک اور صاحب

کے جواب میں فرمایا کہ "بہترین اسلام یہ ہے کہ محتاجوں کو کھانا کھلاؤ اور کسی سے جان پہچان ہو یا نہ ہو مگر اسکو سلام کرو" یہ بھی فرمایا کہ "اس وقت تک تم مومن نہیں جبتک اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔"[1]

غرض اسلام کے تمام اصول وفروع کی تعلیم اسی طرح بتدریج تکمیل کو پہنچی گئی، اور آخر ۹ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ جمعہ کے روز وہ ساعت آئی جب خدا نے فرمایا،[2]

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (آج ہم نے تمھارا مذہب مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی)

عبادات

(اوپر یہ حدیث گذر چکی ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم کی گئی ہے، ان میں سے توحید ورسالت کے علاوہ بقیہ چار چیزیں نماز، روزہ، حج، زکوۃ عبادت میں داخل ہیں، ان میں سب سے اول شے نماز ہی، نماز کی صحت کے لیے متعدد شرطیں ہیں، سب سے اول اور ضروری شرط طہارت ہے)

طہارت (طہارت کے معنی یہ ہیں کہ جسم اور لباس، ظاہری اور معنوی ہر قسم کی نجاستوں سے پاک ہو، طہارت کو اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے، اس کا اندازہ اس سے کرو کہ دوسری ہی دفعہ کی وحی سے جب احکام اور فرائض کا آغاز ہوا تو توحید کے بعد دوسرا حکم طہارت ہی کا دیا گیا،

يٰاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (مدثر)

اے چادر اوڑھنے والے اٹھ اور ڈرا اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر اور اپنے کپڑے پاک کر اور ناپاکی کو چھوڑ دے

اگرچہ مفسرین نے عموماً کپڑے کی طہارت سے "دل کی طہارت" اور "ناپاکی" سے بت پرستی مراد لی ہے،

[1] یہ تمام حدیثیں صحیح بخاری کتاب الایمان میں ہیں [2] صحیح بخاری تفسیر آیت مذکور

Marfat.com

تاہم اس سے ظاہری طہارت اور پاکیزگی کی اہمیت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے، نماز سے پہلے وضو کرنا فرض ہے، اس فرضیت کا ثبوت ابتدائے اسلام سے ثابت ہوتا ہے، تاریخ و سیر اور بعض روایات حدیث میں ہے کہ وضو کا طریقہ آغاز وحی ہی میں حضرت جبریلؑ نے آپ کو سکھایا تھا[1]، حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہجرت سے پہلے بھی وضو فرماتے تھے[2]، لیکن قرآن میں وضو کا حکم باتفاق محدثین مدینہ میں نازل ہوا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ	مسلمانو! جب نماز کے لیے کھڑے ہو تو منہ اور کہنیوں
فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ	تک ہاتھ دھولو، سر پر مسح کرو اور گھٹنوں تک
وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ	پانوں دھولو۔

یہ آیت سورہ مائدہ میں ہے اور اس سورہ کی اکثر آیتیں ہجرت کے چار پانچ سال بعد کی ہیں، اس آیت کے متعلق بخاری میں تصریح ہے کہ وہ آیت تیمم کے ساتھ اتری ہے، آیت تیمم ۵ھ میں نازل ہوئی، اسی بنا پر اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ وضو پر عمل تو پہلے سے تھا لیکن قرآن میں اس کی فرضیت ہجرت کے چار پانچ سال کے بعد نازل ہوئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً لوگ نہایت جلدی جلدی وضو کر لیتے تھے کچھ حصہ بھیگتا تھا کچھ نہیں بھیگتا تھا، ۳ھ میں یا اس کے بعد کے کسی سفر میں آپ مکہ سے واپس آرہے تھے، کچھ لوگ جھٹ پٹ تالاب کے پاس پہنچے، اور جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو لیا، ایڑیاں کچھ بھیگیں، کچھ خشک رہیں، آپ نے فرمایا[3]:

ویل للاعقاب من النار اسبغوا الوضوء	ان ایڑیوں پر دوزخ کی پھٹکار ہے، وضو کو کامل کرو،

---

[1] ابن ہشام و فتح الباری بحوالہ مغازی ابن الہیعہ و امام احمد جلد ۴ صفحہ ۱۶۱ و ابن ماجہ [2] فتح الباری جلد ۱ صفحہ ۲۰۵ و طبرانی فی الاوسط [3] صحیح مسلم باب وجوب غسل الرجلین

اس وقت سے "اسباغ وضو" یعنی سکون و طمانیت کے ساتھ وضو کے تمام فرائض ادا کرنا لازم قرار دیا گیا، اسباغ وضو کے فضائل آپ نے بیان فرمائے۔ ابتداءً وضو ٹوٹے یا نہ ٹوٹے ہر نماز کے وقت تازہ وضو کرتے تھے لیکن آخر عام مسلمانوں پر جبر ہونے کے خیال سے ہر وقت ضروری نہ رہا اور اس کا اعلان آپ نے عملاً فتح مکہ کے وقت فرمایا[2]

تیمم وضو کے لیے پانی کی ضرورت ہے لیکن ہر وقت سفر میں اس کا ملنا مشکل ہے نیز بیماری کی حالت میں پانی کا استعمال کبھی مضر ہے، اس لیے ۵ھ میں تیمم کی آیت نازل ہوئی۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ	اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں کوئی پاخانہ کر کے
اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ	سے آئے یا تم نے عورتوں سے مقاربت کی ہو اور پانی
فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا	میسر نہ آئے تو طاہر مٹی لیکر اس سے تیمم یعنی منہ اور
فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ مَا	ہاتھوں کا اس سے مسح کر لو۔ اللہ تم کو کسی طرح
يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ	تنگی کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تم کو
يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ	پاک و صاف کر دے اور اپنا احسان تم پر
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (مائدہ)	پورا کر دے، تاکہ تم شکر گذار بنو۔

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ غزوۂ بنی مصطلق (۵ھ) سے آپ واپس آ رہے تھے ام المومنین حضرت عائشہؓ ساتھ تھیں، مدینہ کے قریب جب قافلہ پہنچا تو اتفاقاً ام المومنینؓ کا ہار کہیں گر گیا، سارا قافلہ وہیں اتر پڑا، نماز کا وقت آیا تو پانی نہ ملا، تمام صحابہ پریشان خاطر تھے،

---

[1] فتح الباری بحوالہ ابوداؤد و احمد [2] صحیح مسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی، اتنے میں یہ آیت نازل ہوئی، مسلمانوں کو اس اجازت سے بڑی خوشی ہوئی، اسید بن حضیر ایک صحابی نے کہا "اے آل ابی بکر تم لوگوں کے لیے سرمایۂ برکت ہو"۔)

نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ فرض ہوئی[1]، چنانچہ دوسری ہی وحی میں حکم ہوا۔

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (مدثر)	اپنے پروردگار کی بڑائی (تکبیر) بیان کر

اس تکبیر سے مقصود بجز نماز کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن چونکہ تین برس تک دعوتِ اسلام مخفی رہی اور کفار کے ڈر سے علانیہ نماز پڑھنا ممکن نہ تھا، اس لیے صرف رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا، دن میں کوئی نماز فرض نہیں ہوئی، چنانچہ سورۂ مزمل میں جو ابتدائی سورتوں میں سے ہے یہ حکم بہ تصریح مذکور ہے،

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا نِصْفَهُ	اے کملی اوڑھ کر سونے والے! رات کو تھوڑی دیر کے
أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ	علاوہ ساری رات اٹھکر نماز پڑھا کر، آدھی رات تک
الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا	یا اس سے بھی کم کر، یا اس سے بھی کچھ بڑھا دے اور
ثَقِيلًا إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً	قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے

[1] نماز کے بیان تاریخ میں محدثین مختلف الرائے ہیں، ابن حجر نے فتح الباری (جلد ا ص ۳۹۳) میں جو خلاصۂ مباحث نقل کیا ہے اس کا لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے "ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ معراج سے پہلے رات کی غیر موقت نماز کے علاوہ کوئی اور نماز فرض نہ تھی، حربی کی رائے ہے کہ صبح و شام دو دو رکعتیں فرض تھیں، امام شافعی نے بعض اہل علم سے روایت کی ہے کہ پہلے رات کی (دیر تک) نماز فرض تھی، بعد ازیں فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ کی آیت سے یہ منسوخ ہو گیا، اور صرف تھوڑی رات تک نماز فرض رہ گئی، اس کے بعد نماز پنجگانہ نے اس حکم کو بھی منسوخ کر دیا" ہم نے نماز کی تاریخ بیان کی ہے وہ ان ہی چند سطروں کی تفصیل ہے جس کی تطبیق قرآن مجید کی چند آیتوں سے کر دی گئی ہے، اس تفصیل سے یہ گرہ بھی کھل جاتی ہے کہ قرآن مجید میں اوقات نماز کے مختلف بیانات کیوں ہیں) "س"

وَاَقْوَمُ قِيْلًا ۝ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝

ہیں، رات کا اٹھنا نفس کو خوب زیر کرتا ہے اور یہ وقت دعا کیلئے مناسب بھی زیادہ ہے، دن کو تجکو زیادہ شغل رہتا ہے، اپنے پروردگار کا نام لے، سب سے ٹوٹ کر اسی کا (مزمل)

اس کے بعد صبح و شام کی دو دو رکعتیں اور فرض ہوئیں،

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا (دہر)

صبح و شام خدا کا نام لیا کر، اور رات کے وقت دیر تک اس کی تسبیح کیا کر اور اسکی تسبیح بیان کر

رات کو دیر تک نماز پڑھنے کا جو حکم تھا، ایک سال تک قائم رہا، چنانچہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ آپ کا اور اکثر صحابہ کا ایک سال تک اسی پر عمل رہا، نماز پڑھتے پڑھتے ان کے پاؤں سوج جاتے تھے، ایک سال کے بعد فرضیت منسوخ ہوگئی،[1] اور حکم ہوا

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۭ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ

تیرا پروردگار جانتا ہے کہ دو تہائی رات سے کم، اور آدھی رات اور تہائی رات تک نماز پڑھا کرتا ہے، اور کچھ لوگ اور تیرے ساتھ خدا ہی رات اور دن کا اندازہ کرتا ہے، اس نے جان لیا کہ تم اسکو گن نہیں سکتے تم پر اس نے مہربانی کی، اب جتنا ہوسکے اتنا ہی قرآن نماز میں پڑھو اس نے جان لیا کہ تم میں بیمار بھی ہونگے مسافر بھی ہونگے جو خدا کی روزی ڈھونڈھنے کو سفر کرینگے، لوگ تھا کی

[1] ابوداؤد باب فی صلوٰۃ اللیل۔ مسند احمد جلد ۶ ص ۵۴

Marfat.com

فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْهُ　　راہ میں سفر جہاد کریں گے پس اب جتنا ہو سکے اتنا ہی پڑھو

رات کی اس نفل نماز کا نام تہجد ہے، نماز نفل کے تہجد ہو جانے کے بعد، فجر، مغرب اور عشاء تین وقت کی نمازیں فرض ہوئیں

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَ　　دن کے دونوں ابتدائی اور انتہائی کناروں میں یعنی فجر
زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ (ہود - ۱۰)　　ومغرب) اور رات تھوڑی گذرنے کے بعد نماز پڑھا کر

معراج میں جو نبوت کے پانچویں[1] سال ہوئی، پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں[2] (اور سورۂ اسرا میں جو معراج کے بیان پر مشتمل ہے، یہ آیت اتری۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ　　نماز کے اوقات زوال آفتاب سے لیکر ظلمت شب تک ہیں، ظہر
الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا　　عصر، مغرب، عشاء، اور صبح کی نماز کہ صبح کی نماز میں
وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ)　　جمع ہوتے ہیں، اور رات کو تہجد پڑھ، یہ تیرے لیے مزید ہے)

لیکن رکعتیں دو ہی رہیں، مدینہ منورہ میں آکر جب نسبتہً کسی قدر اطمینان ہوا تو اس فرض نے وسعت حاصل کی اور دو کے بجائے چار رکعتیں فرض ہوگئیں[3]،

با ایں ہمہ نماز میں خضوع و خشوع اور تمکین و وقار کے جو ارکان ضروری ہیں، ان کے لیے جس اطمینان کی ضرورت تھی، وہ مدت تک نصیب نہیں ہوا۔ اس لیے فوراً وہ ارکان اور آداب لازمی نہیں قرار پائے، بلکہ رفتہ رفتہ ان کی تکمیل کی گئی، پہلے لوگ نماز میں آنکھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ لیا کرتے تھے، بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

---

[1] ہماری تحقیق میں معراج نبوت کے نویں سال ہوئی، س، [2] فتح الباری مصری جلد ۷ صفحہ ۵ ۵ [3] صحیح بخاری باب الہجرۃ

ما بال اقوام یرفعون البصر الی السماء فی صلواتہم[1] — یہ کیسے لوگ ہیں کہ نماز میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا کرتے ہیں،

ایک مدت تک یہ حالت تھی کہ نماز پڑھنے میں کوئی کام یاد آجاتا تو کسی سے کہہ دیتے یا کوئی سلام کرتا تو نماز ہی میں جواب دیتے، پاس پاس کے آدمی نماز میں باہم باتیں کیا کرتے جب مہاجرین حبش سنہ ۲ھ میں واپس آکر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول تھے، معمول کے موافق لوگوں نے سلام کیا لیکن جواب نہیں ملا، نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خدا نے اب حکم دیا ہے کہ نماز میں باتیں نہ کرو"[2] اسوقت سے بات چیت کرنا یا سلام کا جواب دینا بالکل منع ہو گیا،

معاویہ بن حکم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کی، ایک صاحب کو چھینک آئی میں نے یرحمک اللہ کہا، لوگوں نے تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا، میں نے کہا "آپ لوگ کیا دیکھتے ہیں"، لوگوں نے زانو پر ہات مارے، اس وقت میں سمجھا کہ بات کرنے سے روکنا چاہتے ہیں، میں چپ ہو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے فارغ ہو کر (خلق احمدی سے) مجھ کو نہ سزا دی نہ ڈانٹا نہ برا کہا صرف یہ فرمایا کہ "نماز تسبیح و تکبیر اور قرأت کا نام ہے، اس میں بات چیت جائز نہیں"[3]

تشہد کا جو طریقہ اب ہے، پہلے نہ تھا، مختلف اشخاص کے نام لیکر کہتے تھے السلام علی فلان و فلان، بالآخر التحیات کے خاص الفاظ سکھائے گئے جو اب نماز میں معمول بہا ہیں[4]

حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چھوٹے بچوں کو نماز میں کندھے پر چڑھا لیتے سجدہ میں جاتے وقت اتار دیتے، دوسری رکعت میں کھڑے ہوتے تو پھر چڑھا لیتے حضرت عائشہؓ باہر سے آتیں

---

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب رفع البصر الی السماء فی الصلوٰۃ [2] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ [3] ایضاً [4] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب التشہد

دروازہ کھٹکھٹاتیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے ہوئے عین اسی حالت میں جا کر دروازہ کھول دیتے[1]،

ان حدیثوں کی بنا پر بہت سے فقہا کی رائے یہ ہے کہ یہ سب افعال نماز نفل میں جائز ہیں نفل کی تخصیص اسلیے کہ جن نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے افعال کیے وہ فرض نہ تھیں، بلکہ نفل تھیں لیکن ہمارے نزدیک یہ تاویل صحیح نہیں، ایک حدیث میں صاف موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امامہ بنت ابوالعاص کو کاندھے پر چڑھائے مسجد میں آئے اور نماز ادا کی[2]، ہمارے نزدیک یہ تمام روایتیں اسی زمانہ کی ہیں، جبکہ نماز میں بات چیت اور اس قسم کے حرکات ممنوع نہیں قرار پائے تھے،

رفتہ رفتہ نماز تکمیل کی اس حد کو پہنچی کہ وہ تمامتر خضوع و خشوع و مراقبہ و محویت بن گئی، قرآن مجید میں آیت اتری قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ، یعنی "فلاح پانے والے مسلمان وہ ہیں جو خشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں"، اس بنا پر نماز میں ادھر ادھر دیکھنا یا کوئی حرکت خضوع و خشوع کے خلاف کرنا منع ہو گیا، نماز کے تمام ارکان کا نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ ادا کرنا لازمی قرار پایا، یہاں تک کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نماز ادا کی، اور تمام ارکان ٹھہر ٹھہر کر اچھی طرح نہیں ادا کیے تو آپ نے اس سے فرمایا کہ "تم نے نماز نہیں پڑھی، جا کر پھر پڑھو" اس نے دوبارہ اسی طرح ادا کی، آپ نے پھر فرمایا کہ "نماز نہیں ہوئی" تیسری دفعہ اس نے پوچھا کہ کیونکر پڑھوں"، آپ نے رکوع، سجدہ، قیام سب کی نسبت ہدایت کی کہ نہایت اطمینان کے ساتھ ادا کیے جائیں، چنانچہ صحیح بخاری[3] وغیرہ میں یہ روایت تفصیل کے ساتھ مذکور ہے

غرض بانوی یہ حالت تھی کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھ رہے تھے، اتفاقاً

---

[1] ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب العمل فی الصلوۃ [2] ایضاً [3] صحیح بخاری باب امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم من لا یتم الصلوۃ بالاعادۃ

شام سے تجارت کا قافلہ آیا، بارہ آدمیوں کے سوا جس قدر لوگ نماز میں شریک تھے، اٹھ کر قافلہ کی طرف دوڑے، اس پر یہ آیت اتری[1]

وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا	اور جب لوگ تجارت یا کھیل تماشا دیکھ پاتے ہیں تو ٹوٹ کر
وَتَرَكُوكَ قَائِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ	اس پر گرتے ہیں، اور تجھکو کھڑا چھوڑ دیتے ہیں، کہدے کہ جو کچھ
مِنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ (جمعہ-۲)	خدا کے ہاں ہے وہ تجارت اور کھیل تماشہ سے بہتر ہے،

اور یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت و تعلیم سے یہ حالت ہوئی کہ ایک انصاری نماز کی حالت میں تین دفعہ تیر کا زخم کھاتے ہیں، لیکن نماز نہیں توڑتے کہ جو سورہ انھوں نے شروع کیا تھا، اسکی لذت معنوی اس درد زخم سے زیادہ تھی، اس سے بڑھکر یہ، کہ حضرت عمرؓ فاروق نماز میں زخم کھا کر گرتے اور تڑپتے ہیں، یہ قیامت خیز منظر سب کے سامنے ہے، لیکن ایک شخص مڑ کر نہیں دیکھتا، کیونکہ خشیت الٰہی اور محویت کا عالم جو دلوں پر طاری ہے وہ اور کسی طرف متوجہ ہونے نہیں دیتا۔

نماز جمعہ اور عیدین

مکہ میں چار شخصوں کا یکجا ہو کر نماز ادا کرنا ناممکن تھا، اس لیے جمعہ کی نماز فرض نہ تھی کیونکہ جمعہ کی پہلی شرط جماعت ہے، لیکن مدینہ منورہ میں انصار کی ایک بڑی جماعت اسلام لا چکی تھی، اور کوئی شخص ادائے نماز میں خلل انداز نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل جو مسلمان مدینہ آ چکے تھے، اسعد بن زرارہ کی تحریک سے بنی بیاضہ کے محلہ میں انھوں نے جمعہ کی سب سے پہلی نماز ادا کی[2]، مصعب بن عمیر امام تھے[3]، اور کل چالیس مسلمان نمازی تھے، اسکے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

[1] صحیح بخاری کتاب البیوع تفسیر آیت مذکور [2] ابوداؤد و ابن ماجہ و دارقطنی کتاب الجمعہ نیز عبدالرزاق واحمد و خزیمہ حسب حوالہ فتح الباری [3] ابن اسحاق [4] ابوداؤد و ابن ماجہ وغیرہ کتاب الجمعہ

Marfat.com

جب مدینہ تشریف لائے تو پہلے قبا میں قیام فرمایا، یہاں سے روانگی کے لیے آپ نے قصداً جمعہ کا دن متعین فرمایا، بنی سالم کے محلہ میں پہنچے تو نماز کا وقت آگیا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ نے سب سے پہلے نماز جمعہ یہیں ادا فرمائی، یہ اواخر ربیع الاول سنہ کا واقعہ ہے[1]، مدینہ سے باہر عرب کے دوسرے حصوں میں مسلمانوں کی یکجا تعداد سب سے زیادہ جواثی میں تھی، جو بحرین میں واقع تھا، حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ مسجد نبویؐ کے بعد سب سے پہلے نماز جمعہ یہیں قائم ہوئی[2]،

لیکن بظاہر نماز جمعہ کا اہتمام مسلمانوں میں پہلے اتنا نہ تھا جتنا کہ ہونا چاہیے، ابھی اوپر گذر چکا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھا رہے تھے، اور ایک روایت میں ہے کہ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ اتفاقاً شام سے غلہ کے بیوپاری آگئے، سب لوگ اٹھ کر چلے گئے جماعت میں صرف بارہ آدمی[3] اور دوسری روایت کی رو سے چالیس آدمی[4] رہ گئے، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ	ایمان والو! جب نماز جمعہ کیلیے پکارا جائے تو یاد الٰہی کی طرف
يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ	دوڑو، اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے
ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ فَإِذَا	اگر تم کو علم ہو جب نماز سے فراغت ہو جائے تو زمین میں
قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا	چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو اور خدا کو اکثر یاد
مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ	کیا کرو تاکہ فلاح پاؤ، جب لوگ تجارت اور کھیل تماشہ
وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا	دیکھ پاتے ہیں تو ٹوٹ کر اس پر گرتے ہیں اور تجھکو اے پیغمبر
وَتَرَكُوكَ قَائِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ	کھڑا چھوڑ دیتے ہیں، کہدے کہ جو کچھ خدا کے پاس ہے

[1] طبری صفحہ ۱۲۵۶ [2] صحیح بخاری باب الجمعہ [3] ایضاً [4] دار قطنی کتاب الجمعہ

مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَيْرُ — وہ تجارت اور کھیل تماشہ سے بہتر ہے اور خدا

الرّٰزِقِيْنَ (جمعہ) — بہتر روزی دینے والا ہے،

اس کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ نماز کے سامنے تمام دنیا کی دولت کا خزانہ بھی ان کے آگے ہیچ ہو گیا، خدا نے اُن کی مدح فرمائی،

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا — یہ وہ لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت

بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ — خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی،

عید کی نماز بھی مدینہ ہی میں آکر قائم ہوئی لیکن جس سال آپ تشریف لائے اس سال عید کی نماز نہیں ہوئی، بلکہ ۲ھ میں مسنون ہوئی جس کی وجہ یہ ہے کہ عید کی نماز، روزہ رمضان کے تابع ہے، اور رمضان کے روزے دوسرے سال فرض ہوئے،)

صلوۃ خوف — (نماز کسی حالت میں قضا نہیں کی جا سکتی، خوف کی حالت میں مثلاً جنگ میں یہ حکم ہے کہ تمام فوج کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں، پہلے ایک جماعت ہتھیاروں سے مسلح ہو کر امام کے پیچھے کھڑی ہو، اور نماز قصر ادا کرے، پھر ترتیب سے آگے بڑھے اور دوسری جماعت جو دشمن کے مقابلہ میں تھی وہ پیچھے ہٹے، اور وہ بھی قصر نماز ادا کرے، امام اپنی جگہ پر قیام کرے، راویوں میں اختلاف ہے کہ ہر جماعت دو دو رکعت امام کے ساتھ ادا کرے، یا ایک ایک رکعت امام کے ساتھ اور دوسری رکعت علیحدہ علیحدہ پڑھے، یا صرف ایک ہی رکعت اس حالت میں فرض ہے، ابو داؤد نے صلوۃ الخوف کی تمام صورتیں بروایت صحابہ الگ الگ لکھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں کوئی اختلاف نہیں

---

[1] طبری صفحہ ۱۲۸۱ یورپ

یہ جنگ کی حالت پر موقوف ہے، امام جس وقت جو مناسب سمجھے کرے، اگر لڑائی پورے زور اور شدت پر ہو تو ہر سپاہی اپنی اپنی جگہ پر اشارات سے نماز ادا کریگا، سورۂ نساء میں صلوٰۃ الخوف کی صورت بتفصیل مذکور ہے۔

صلوٰۃ الخوف کا حکم غزوۂ ذات الرقاع ۵ھ میں نازل ہوا، اسی غزوہ کا نام بعض راویوں نے غزوۂ نجد بتایا ہے، ابوداؤد میں ابو عباس زرقی کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ الخوف کی آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر مقام عسفان میں نازل ہوئی یعنی ۶ھ میں لیکن زیادہ تر رواۃ حدیث اور اہل سیر غزوۂ ذات الرقاع کو اس حکم کا زمانہ سمجھتے ہیں[۱]

روزہ اسلام سے پہلے قریش عاشورا کے دن روزہ رکھتے تھے، (اس دن خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا جاتا تھا)[۲] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس دن روزہ رکھتے تھے۔ اور عجب نہیں کہ آپ کی نسبت میں دوسرے صحابہ بھی روزہ رکھتے ہوں، ۵ سنہ نبوی میں یعنی ہجرت سے آٹھ برس پہلے حضرت جعفرؓ نے حبش کے نجاشی کے سامنے اسلام پر جو تقریر کی تھی اس میں روزہ کا ذکر بھی موجود ہے، وہ غالباً اسی دن کا روزہ ہوگا، اسکے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود بھی اس دن روزہ رکھتے ہیں، آپ نے لوگوں سے وجہ پوچھی، لوگوں نے بیان کیا کہ حضرت موسیٰؑ نے اسی روز فرعون کے ہاتھ سے نجات پائی تھی، آپ نے فرمایا، تو ہم کو موسیٰ کی تقلید کا زیادہ حق ہے۔ چنانچہ آپ نے (یہاں بھی) عاشورہ کا روزہ رکھا (اور صحابہ کو بھی رکھنے کا حکم دیا) پھر ۲ھ میں رمضان کے روزے فرض ہوئے۔ تو عاشورا کا روزہ مستحب ہو گیا یعنی جس کا جی چاہتا تھا رکھتا تھا، اور جو نہیں چاہتا تھا نہیں رکھتا تھا[۳] لیکن آپ نے

(۱) دیکھو کتب احادیث صلوٰۃ الخوف اور طبری جلد ۳ صفحہ ۵۴، ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۴۳) (۲) مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۴۴ (معجم کبیر طبرانی) (۳) ابوداؤد کتاب الصوم

بہ نفسِ نفیس اس دن کا روزہ برابر رکھا، ۱۱ھ میں لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہود تو اس دن کی بڑی عزت کرتے ہیں، فرمایا آیندہ سال ۱۰ کے بجائے ۹ کو روزہ رکھوں گا لیکن افسوس کہ آپ نے اسی سال وفات پائی[1])

یہود اس طرح روزہ رکھتے تھے کہ نمازِ عشا کے بعد پھر نہیں کھاتے تھے، اور اسکو حرام سمجھتے تھے، عورت کے ساتھ ہم بستری بھی منع تھی، ابتدائے اسلام میں مسلمان بھی اسی طریقہ کے موافق مامور ہوئے، اسلام کے تمام احکام میں سب سے مقدم یہ اصول ملحوظ رہتے تھے۔

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ)	خدا تعالےٰ حق میں آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا
لا صرورۃ فی الاسلام (ابوداؤد واحمد)	اسلام میں جوگی پن نہیں ہے۔

اسی بنا پر یہ آیت نازل ہوئی،

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ[2]	روزے کی راتوں میں تمہارے لیے عورتوں سے لطف
وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ	اٹھانا حلال کر دیا گیا ہے اور جبتک صبح کی سپید لکیر (رات
الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (بقرہ)	کی) سیاہ لکیر سے الگ نہو جائے تم کھاتے پیتے رہو)

اہلِ عرب روزہ کے بہت کم خوگر تھے، اول اول روزہ ان پر شاق ہوا[3]، اسلیے نہایت تدریج کے ساتھ روزہ کی تکمیل کی گئی، اول اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو سال میں تین روزے رکھنے کا حکم دیا، پھر روزے کی فرضیت نازل ہوئی تو یہ اختیار رہا کہ جو شخص چاہے روزہ رکھے

---

(۱) یہ تمام واقعات صحیح بخاری، صحیح مسلم اور ابوداؤد کتاب الصوم میں بتفصیل مذکور ہیں) ۲ ابوداؤد کتاب الصوم باب مبدء فرض الصیام واسباب النزول للسیوطی صفحہ ۳، ۲ صحیح بخاری میں ہے نزل رمضان فشق علیھم

اور جو چاہے روزہ کے بدلے ایک غریب کو کھانا کھلا دے، رفتہ رفتہ جب لوگ روزے کے خوگر ہو چلے تو یہ آیت اتری،

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ[1] جو رمضان کا مہینہ پائے وہ ضرور روزہ رکھے

اب بالتعین روزہ فرض ہوگیا، اور فدیہ کی اجازت جاتی رہی، البتہ جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو اس کے لیے یہ حکم ہوا کہ اس وقت روزہ توڑ دے، اور ان کے بدلے کسی اور وقت قضا کرے، چونکہ اور تمام قوموں میں خصوصاً عیسائیوں میں رہبانیت بڑی فضیلت کی بات سمجھی جاتی تھی، اسلیے جو لوگ زیادہ خدا پرست تھے وہ روزہ میں زیادہ سختی برداشت کرتے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وقتاً فوقتاً اس سے روکتے رہتے تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے، ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے گرد بھیڑ لگی ہوئی ہے اور اس پر لوگوں نے سایہ کر رکھا ہے، سبب پوچھا معلوم ہوا کہ گرمی میں اس شخص نے روزہ رکھا ہے، آپ نے فرمایا کہ "سفر میں روزہ رکھنا کچھ ثواب کی بات نہیں"[2]،

بعض لوگوں نے صوم وصال رکھنا چاہا یعنی رات دن روزہ رکھیں، بیچ میں افطار نہ کریں" آپ نے اس سے منع فرمایا،

روزہ کا مقصد عام طور پر صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا ثواب کی بات ہے، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر طرح کی آسانیوں کا حکم دیا، سفر اور بیماری میں روزہ رکھنا فرض نہ تھا،

راتوں کو صبح صادق تک کھانے پینے اور تمام اشغال کی اجازت تھی، سحر کھانے کی فضیلت

---

[1] ابو داؤد کتاب الصلوٰۃ باب کیف الاذان، [2] صحیح بخاری کتاب الصوم

Marfat.com

بیان کی اور یہ بھی فرمایا کہ صبح کے قریب کھائی جائے، تاکہ دن بھر قوت باقی رہے،

روزہ کا مقصد صرف معاصی سے کف نفس تھا، اور روزہ اس کا معین تھا، اسلیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص روزہ میں جھوٹ فریب نہیں چھوڑتا، خدا کو اسکی فاقہ کشی کی کوئی حاجت نہیں"[1]

زکوٰۃ | خیرات اور زکوٰۃ کی ترغیب اور تحریص اسلام میں ابتدا ہی سے معمول بہ تھی، مکہ میں جو سورتیں اتریں ان میں زکوٰۃ کا لفظ تصریحاً مذکور ہے، اور خیرات نہ دینے والوں پر عتاب ہے،

اَرَاَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ فَذٰلِکَ	تم نے اس شخص کو دیکھا جو قیامت کو جھٹلاتا ہے یہی شخص
الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ	وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کے کھانا کھلانے
الۡمِسۡکِیۡنِ ؕ (ماعون)	کی لوگوں کو ترغیب نہیں کرتا،

مدینہ منورہ میں زیادہ تاکیدی آیتیں نازل ہوئیں، ۲ھ میں عید کے دن صدقۂ فطر دینا واجب قرار پایا[2] ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں عام مسلمان اور خصوصاً مہاجرین سخت فقر و فاقہ میں مبتلا تھے، حدیثوں میں صحابہ کے فقر و تنگدستی کے جو واقعات کثرت کے ساتھ مذکور ہیں، اسی زمانہ کے ہیں اس بنا پر یہ حکم ہوا کہ جس شخص کے پاس ضروری مصارف سے جو کچھ بچے سب کو خیرات کر دینا چاہیے ورنہ عذاب ہوگا، چنانچہ خاص آیت نازل ہوئی۔[3]

وَالَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ وَالۡفِضَّةَ	جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں
وَلَا یُنۡفِقُوۡنَهَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ۙ	خیرات نہیں کرتے

اس آیت کا بھی یہی مطلب ہے،

---

[1] ایضاً بحوالۂ بالا [2] طبری مطبوعۂ یورپ صفحہ ۱۲۸۱ [3] صحیح بخاری مقولۂ حضرت عبداللہ بن عمرؓ

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ — لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات دیں کہدو کہ جو کچھ ضرورت سے بچ رہے،

بہت سے لوگ خیرات کرتے تھے لیکن عمدہ مال کو محفوظ رکھتے تھے، بیکار یا ردی چیزیں خیرات میں دیتے تھے، اس پر حکم ہوا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ — مسلمانو! اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے جو ہم نے تمھارے لیے زمین میں پیدا کیا، اچھا حصہ خیرات دو

مزید تاکید کے لیے یہ حکم ہوا کہ جو شخص اپنی محبوب چیز نہ دے گا، اسکو ثواب نہ ملے گا،

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ — تم لوگ ثواب نہیں پا سکتے جبتک کہ وہ چیز خیرات نہ کرو جو تمکو عزیز ہو،

اب صدقہ اور خیرات کی طرف یہ عام رغبت پیدا ہوئی کہ جو لوگ نادار تھے وہ صرف اسلیے بازار میں جا کر مزدوری کرتے اور کندھوں پر بوجھ لاد کر لوگوں کے پاس پہنچاتے تھے کہ مزدوری ملے تو خیرات کریں،[1] باایں ہمہ ۸ھ تک زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی، فتح مکہ کے بعد اسکی فرضیت ہوئی تو اس کے مصارف بیان کیے گئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ممالک مقبوضہ میں زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لیے (محرم ۹ھ میں) محصلین مقرر کیے،[2] زکوٰۃ کے مصارف حسب ذیل تھے،

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (توبہ) — زکوٰۃ ان مصارف کیلیے ہے، فقرا، مساکین، زکوٰۃ کے وصول کرنے والے، مؤلفۃ القلوب، غلام جن کو آزاد کرانا ہے، مقروض، مسافر، اور خدا کی راہ میں، یہ خدا کا فرض ہے، اور خدا علیم و حکیم ہے،

---

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ [2] طبری مطبوعہ یورپ جلد ۴ صفحہ ۲۲، (ابن سعد حصہ مغازی صفحہ ۱۱۵)

زکوٰۃ کی شرح نہایت تفصیل سے فرامین نبویؐ میں منقول ہے فقہ میں کتاب الزکوٰۃ ان ہی فرامین سے ماخوذ ہے،

حج دنیا میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا پرستی کے لیے عبادتگاہ عام بنایا اور تمام دنیا کو وہاں آکر عبادت کرنے کی دعوت دی،

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ	اور جبکہ ہم نے ابراہیم کیلئے کعبہ کی جگہ مقرر کر دی کہ ہمارے
لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْـًٔا وَّطَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىِٕفِیْنَ	ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ہمارے گھر کو طواف کرنے والوں
وَالْقَآىِٕمِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ	اور قیام و رکوع اور سجود کرنے والوں کیلیے پاک و
بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ	صاف رکھ اور حج کی منادی کردے تو لوگ ہر طرف سے
یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ لِّیَشْهَدُوْا	دوڑے آئینگے کچھ پیدل اور کچھ دبلی اونٹنیوں پر سوار
مَنَافِعَ لَهُمْ وَیَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْ	تاکہ فائدہ اٹھائیں، اور تاکہ ایام مقررہ میں
اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ۝ (حج)	خدا کا ذکر کریں،

حضرت ابراہیمؑ کی دعوت عام پر دنیا نے لبیک کہا، اور ہر سال عرب کے دور دراز اطراف سے لوگ حج کو آتے تھے لیکن ایک طرف تو یہ افسوس ناک انقلاب ہوا کہ جو گھر خالص توحید کیلیے تعمیر ہوا تھا، وہ تین سو ساٹھ بتوں کا تماشا گاہ بن گیا، دوسری طرف اس گھر کی تولیت کا سب سے زیادہ جس کو حق تھا، وہ یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوا، اور پورے آٹھ برس تک ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکا، بالآخر ظہور حق کا وقت آیا، مکہ فتح ہوا، اور جانشین ابراہیمؑ اور انکے متبعین کو موقع ملا کہ شعار ابراہیمی کو پھر زندہ کیا جائے، چنانچہ ۹ھ میں حج فرض ہوا، تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال

زاد المعاد جلد اصفحہ ۱۸۰

یہ فرض ادا نہیں کیا کہ عرب ننگے ہو کر طواف کعبہ کرتے تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بے حیائی کا منظر آنکھ سے دیکھنا گوارا نہیں فرما سکتے تھے۔ اسلیے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ ایام حج میں روانہ کیے گئے کہ کعبہ میں جاکر منادی کر دیں کہ آیندہ سے کوئی شخص عریاں ہو کر کعبہ کا طواف نہ کرنے پائے گا۔[1]

ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ نسی کے قاعدہ سے حج کا مہینہ ہٹتے ہٹتے ذوقعدہ میں آگیا تھا، چنانچہ سنہ ۹ھ کا حج اسی مہینہ میں ادا ہوا لیکن حج کا اصلی مہینہ ذوالحجہ تھا، اسلیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سال کا انتظار فرمایا اور اس وقت حج ادا کیا جب وہ اپنے اصلی مرکز پر آگیا۔[2]

حج کے اصلاحات

حج کی رسم اگرچہ کفار نے قائم رکھی تھی لیکن اسکی صورت بالکل بدل دی تھی، اور اس میں اسقدر بدعات اضافہ کر دیے تھے کہ ثواب کے بجائے عذاب کا کام بن گیا تھا، سب سے مقدم یہ کہ حج اور تمام عبادات کا مقصد خدا کا ذکر اور توجہ الی اللہ ہے لیکن اہل عرب جب حج میں جمع ہوتے تھے تو خدا کے بجائے اپنے باپ دادا کے مفاخر اور کارنامے بیان کرتے تھے، اس بنا پر یہ آیت اتری،

فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ	پھر جب حج کے ارکان پورے کر لو تو خدا کا ذکر کرو
كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ)[3]	جس طرح اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے تھے، بلکہ اس سے بڑھکر،

خاص اہل مدینہ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ منات جو بت تھا اس کا طواف کرتے تھے اور اس بنا پر جب کعبہ کا حج کرتے تھے تب بھی صفا و مروہ کا طواف نہیں کرتے تھے، حالانکہ حج کے مقاصد میں سے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الحج باب لا یحج البیت مشرک ولا یطوف بالبیت عریان۔ [2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ الفاظ فرمائے تھے "ان الزمان قد استدار کهیئته یوم خلق اللہ السموات والارض السنة اثنا عشر شهرا منها اربعة حرم ثلث متوالیات ذو القعدة و ذو الحجة والمحرم ورجب مضر الذی بین جمادی و شعبان" اس سے اسی طرف اشارہ تھا۔ [3] اسباب النزول للواحدی،

Marfat.com

ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگاریں قائم رکھی جائیں، اور صفا و مروہ کا طواف اسی عہد کی یادگار ہے، اسی بنا پر یہ آیت اتری

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ	صفا اور مروہ خدا کی یادگاریں ہیں اس لیے جو شخص
فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ	حج یا عمرہ کرے تو اس کو ان دونوں مقاموں کا
عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا (بقرہ - ۱۹	بھی طواف کرنا چاہیئے،[1]

ایک طریقہ یہ جاری ہوگیا تھا کہ اکثر لوگ (آجکل کی طرح) جن کے پاس زاد سفر نہیں ہوتا تھا یوں ہی چل کھڑے ہوتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں، ان لوگوں کو اکثر راہ میں گداگری اور دوستوں کی دستگیری کا محتاج ہونا پڑتا تھا، اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى[2]	اور گھر سے زاد سفر لیکر چلو، کیونکہ اچھا زاد سفر تقویٰ ہی ہے،

احرام حج میں سر کے بالوں کا منڈوانا یا ترشوانا منع ہے لیکن اس میں اہل جاہلیت نے بہت سختی کردی تھی، یہانتک کہ بعض صاحبوں کے بالوں میں اسقدر جوئیں پڑگئیں کہ بینائی جاتے رہنے کا خوف ہوگیا، تاہم وہ بال نہ ترشوا سکے، اسلام میں چونکہ سب سے مقدم یہ امر پیش نظر ہے کہ اسکی عبادات اور احکام تکلیف مالا یطاق نہ بنجائیں، اس لیے حکم ہوا۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ	تو جو شخص بیمار ہو یا اسکے سر میں کچھ عارضہ ہو تو وہ (اگر
فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ	بال منڈائے) تو فدیہ ادا کرے یعنی یا روزہ یا خیرات یا قربانی

[1] قرآن مجید میں جناح کا لفظ ہے، اسکا عام ترجمہ "حرج" یا نقصان ہے، اس بنا پر ترجمہ یہ ہونا چاہیے کہ صفا اور مروہ کے طواف میں کچھ حرج نہیں لیکن لاجناح کا لفظ واجب اور مستحب کے معنوں میں بھی آیا ہے [2] بخاری کتاب الحج باب: تزودوا فان خیر الزاد التقویٰ

قربانی جو کرتے تھے اس کا خون لیکر کعبہ کے درو دیوار پر ملتے تھے، اور اس کو ثواب سمجھتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،[1]

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۤؤُهَا	خدا کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہاری
وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ	پرہیزگاری اس تک پہنچتی ہے،

اس آیت میں صرف اس فعل سے نہیں روکا گیا، بلکہ یہ بھی بتا دیا گیا کہ قربانی کوئی مقصود بالذات چیز نہیں، بلکہ اصل چیز جس کو خدا قبول کرتا ہے وہ تقویٰ اور پرہیزگاری ہے،

رسوم حج میں ایک بڑی چیز جو قریش نے اصولِ اسلام کے خلاف قائم کر دی تھی، یہ تھی کہ وہ عرفات جو حج کا اصلی عبادتگاہ عام تھا، نہیں جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم اہل حرم ہیں، ہم حدودِ حرم سے نہیں جا سکتے، یہ ہمارے خاندان کی توہین ہے، اس لیے وہ صرف مزدلفہ تک جا کر ٹھہر جاتے تھے، باقی تمام عرب عرفات میں جمع ہوتے تھے، اور وہاں سے چل کر مزدلفہ اور منیٰ میں آتے تھے، چونکہ اسلام کا اصولِ اصلی مساواتِ عامہ ہے، اور عبادات میں سب یکساں ہیں، اس لیے حکم آیا کہ[2]

فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ	پھر جب عرفات سے لوٹو تو مشعر حرام (مزدلفہ) کے
عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ	پاس خدا کا ذکر کرو، جس طریقہ سے اس نے تمکو ہدایت کی ہے،
وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّاۤلِّيْنَ، ثُمَّ	اور اس سے پہلے بیشک تم گمراہ تھے، پھر وہیں سے چلو
اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ	جہاں سے اور لوگ چلتے ہیں، اور خدا سے معافی مانگو،

[1] تفسیر بیضاوی (یہ رسم یہودیوں سے آئی تھی، لاویین ۱۷-۶، تاریخ دوم ۲۹-۲۲) [2] صحیح بخاری جلد ا کتاب الحج ص ۲۲۶

Marfat.com

وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔ وہ غفور اور رحیم ہے،

قربانی کے جانور کو چونکہ سمجھتے تھے کہ خدا پر چڑھا دیا گیا ہے، اسلیے اس پر سوار نہیں ہوتے تھے، اور پیدل چلنے کی تکلیف گوارا کرتے تھے، یہ رسم اسلام کے زمانہ تک قائم رہی، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو سفر حج میں دیکھا کہ قربانی کے اونٹ کے ساتھ ہیں، لیکن خود پیدل جا رہے ہیں، آپنے ان سے فرمایا کہ "سوار ہولو" بولے "یہ قربانی کے اونٹ ہیں"، آپ نے دوبارہ فرمایا، انھوں نے دوبارہ وہی عذر کیا، آپنے زجر کے ساتھ حکم دیا کہ "بیٹھ لو"[1]

حج

ایک قسم کا حج ایجاد کر لیا تھا جس کو حج مصمت کہتے تھے یعنی جو شخص حج کرتا تھا وہ آغاز سے اخیر تک منہ سے کچھ بولتا نہ تھا، اسلام نے اس تکلیف مالا یطاق سے منع کیا، صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابو بکرؓ نے احمس کی ایک عورت کو جس کا نام زینب تھا، دیکھا کہ کسی سے بات چیت نہیں کرتی، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ حج مصمت کی نیت کی ہے، حضرت ابو بکرؓ نے اس سے کہا کہ یہ جائز نہیں، یہ زمانۂ جاہلیت کی بات ہے"[2]

(سب سے بڑی بیحیائی کی بات یہ تھی کہ قریش (حمس) کے سوا عام عرب مرد و زن کعبہ کا برہنہ طواف کرتے تھے، حدود حرم میں آکر تمام لوگ اپنے اپنے کپڑے اتار ڈالتے تھے، اور عاریۃً کسی قریشی سے کپڑے مانگ لیتے تھے اگر نہ ملتے تو ننگے کعبہ کے گرد گھومتے تھے، عورتیں بھی اسی طرح ننگی طواف کرتی تھیں، اور یہ شعر گاتی جاتی تھیں،

اَلْیَوْمَ یَبْدُوْ بَعْضُهُ اَوْ كُلُّهٗ ۔ وَمَا بَدَا مِنْهُ فَلَا اُحِلُّهٗ

آج کچھ حصہ اس کا یا پورا کھلے گا ۔ اور جو کھلا ہے اس کو میں حلال نہیں کرتی

[1] بخاری کتاب الحج [2] بخاری جلد ا صفحہ ۵۴۱

اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

یَا بَنِیْ آدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ اے آدم کے بیٹو! مسجدوں میں کپڑے پہن لیا کرو،

(اس بنا پر ۹؁ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بھیجا، انھوں نے عین موسم حج میں اعلان کیا کہ آیندہ کوئی برہنہ حج نہ کرنے پائے گا)[2]

معاملات

شریعت کی تکمیل میں جو تدریج ملحوظ رہی، اس کے لحاظ سے وراثت، نکاح وطلاق، وقصاص وتعزیرات (وغیرہ) کے احکام، بعثت سے بہت بعد آئے (سبب یہ ہے کہ ان احکام کے اجرا کے لیے ایک نافذ الامر قوت کی ضرورت تھی، جو اب تک اسلام کو حاصل نہیں ہوئی تھی، غزوۂ بدر کے بعد سے اسلام کی سیاسی طاقت کا نشو ونما شروع ہوا) ہجرت کے پہلے اور دوسرے سال میں جو احکام نازل ہوئے وہ تحویل قبلہ، فرضیت روزہ، زکوٰۃ فطر، نماز عید اور قربانی تھی، تیسری سال سے جب اسلام کے کاروبار زیادہ پھیلنے شروع ہوئے تو سب سے پہلے توریث کا قانون قرآن مجید میں نازل ہوا،

وراثت مسلمان جب ابتداءً مدینہ آئے ہیں تو اس وقت یہ حالت تھی کہ باپ مسلمان ہے تو بیٹا کافر ہے، ایک بھائی کافر ہے، تو دوسرا بھائی مسلمان ہے، اس حالت میں اقربا اور اعزہ کی وراثت کا قانون کیونکر نافذ ہوسکتا تھا، اسلیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے مہاجرین اور انصار میں مواخاۃ (برادری) قائم کردی جس کے رو سے یہ قاعدہ مقرر ہوگیا کہ کوئی انصار مرتا تو اسکی وراثت مہاجرین

(1) یہ پورا واقعہ اور شان نزول نسائی، کتاب مناسک حج میں ہے (2) صحیح مسلم وصحیح بخاری اور تمام حدیث کی کتابوں میں باب لا یطوف بالبیت عریاں میں مذکور ہے)

Marfat.com

کو ملتی، عرب میں پہلے بھی دستور تھا کہ دو آدمی آپس میں عہد کر لیتے کہ ہم دونوں آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔ ان میں سے جب کوئی مرتا تو دوسرا وارث ہوتا لیکن ۳ھ میں قرآن کی اس آیت نے اس قاعدہ کو منسوخ کر دیا)

وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ (انفال)[ل] قرابت مند ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں،

اس کے رو سے مواخاۃ کی بنا پر وراثت موقوف ہوگئی، اور خاندان اور ذوی الارحام میں وراثت محدود ہوگئی،

(آیت توریث کے نزول سے پہلے قرآن نے وصیت کا قاعدہ جاری کیا تھا یعنی مرنے والا اپنے مال و جائداد کی نسبت یہ وصیت کر جاتا کہ اس میں سے اتنا اس کو دیا جائے اور اتنا اسکو ملے) مرنے کے بعد اسی طریقہ سے اسکی جائداد تقسیم کر دیجاتی، مرنے سے پہلے ہر مسلمان پر اس وصیت کا مکمل کر جانا اس پر فرض تھا۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ	مسلمانو! تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ جب تم میں کسی کو موت آنے
إِن تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ	لگے اور کچھ مال چھوڑنے والا ہو تو ماں باپ، رشتہ داروں
بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (بقرہ)	کے لیے بطریق مناسب وصیت کر جائے، متقی لوگوں پر یہ فرض ہے

جو لوگ حالت مسافرت میں جاتے، ان کیلئے گواہی اور شہادت کا قانون قرآن میں مقرر کیا گیا۔ گواہی کو چھپانا یا بدل دینا قانوناً جرم تھا، چنانچہ سورہ البقرہ اور مائدہ میں اسکی پوری تفصیل ہے، غزوۂ بدر

[ل] یہ مفسرین کا بیان ہے لیکن صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ حکم حسب ذیل آیت کریمہ سے منسوخ ہوا، وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ (نساء) دیکھو صحیح بخاری تفسیر آیت مذکورہ۔

Marfat.com

کے بعد مسلمانوں کی تعداد میں کافی ترقی ہوتی گئی، خاندان کے خاندان مسلمان ہوگئے۔ اس لیے وراثت کے مخصوص قانون کی ضرورت ہوئی، پھر وصیت کے قاعدہ میں بڑی وقت یہ تھی کہ ناگہانی موت کے موقع پر تقسیم جائداد کا کوئی اصول جاری کرنا ممکن نہ تھا، مثلاً جہاد میں سیکڑوں مسلمان شریک ہوئے۔ اب کس کو معلوم ہے کہ کس کو شہادت ہوگی۔ اس حالت میں وصیت نہ کر جانے سے رشتہ داروں میں جس کا قابو چل جاتا تھا وہ جائداد پر قبضہ کرلیتا، چنانچہ غزوۂ اُحد میں یہی موقع پیش آیا، سعد بن الربیعؓ جو بہت دولتمند صحابی تھے (اس جنگ میں شہید ہوئے)، انکی بیوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں کہ سعد آپ کی خدمت میں شہید ہوئے۔ انھوں نے دو لڑکیاں چھوڑی ہیں، لیکن سعد کے بھائی نے سعد کی ساری جائداد پر قبضہ کرلیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خدا فیصلہ کرے گا" پھر (غالباً ۳ھ میں) یہ آیت نازل ہوئی[1] جس میں وراثت کے تمام احکام مذکور ہیں،

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ	خدا تم کو تمھاری اولاد کی نسبت حکم دیتا ہے کہ لڑکے کو
حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ الخ	دو لڑکیوں کے برابر حصہ (آخر تک)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد کے بھائی کو بلا کر فرمایا کہ سعد کے ترکہ میں سے دو تہائی انکی بیٹیوں

---

(1) آیت میراث کے شان نزول میں احادیث میں تین واقعے مروی ہیں، اول یہ کہ حضرت جابرؓ ۸ھ میں بیمار پڑے تو آیت اتری، یہ روایت تمام صحاح ستہ میں ہے لیکن درحقیقت اس روایت میں راویوں سے کسی قدر مسامحت ہوئی ہے، کیونکہ وراثت ۸ھ سے پہلے جاری ہوچکی تھی، اور دوسرے یہ کہ حضرت جابرؓ اسوقت تک لاولد تھے، اسلیے صحیح یہ ہے کہ حضرت جابرؓ کا واقعہ وراثت کی ایک خاص صورت لاولدیت یعنی (کلالہ) سے متعلق ہے، جیسا کہ مسلم کی دوسری روایتوں میں (کتاب الفرائض) اس کی تصریح ہے، دوسرا شان نزول یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت حسانؓ کے بھائی عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد انکی بیوی ام کجہ کی فریاد پر یہ آیت اتری، یہ روایت طبری وغیرہ کی ہے جو گو ضعیف ہے لیکن بالکل ممکن ہے کہ سعد بن ربیع کے علاوہ اور واقعے بھی اس قسم کے پیش آئے ہوں، تیسرا شان نزول یہی سعد بن ربیع کا واقعہ ہے، جو ابوداؤد، ترمذی، حاکم اور مستدرک میں مذکور ہے) "س"

Marfat.com

اور آٹھواں حصہ ان کی بیوی کو دو، اس کے بعد جو بچ رہے وہ تمہارا حق ہے۔

اہل عرب عورتوں کو وراثت سے محروم رکھتے تھے، کہ وراثت اس کا حق ہے جو تلوار چلائے دنیا کی اور اکثر قوموں میں بھی یہی دستور تھا، یہ پہلا دن ہے کہ اس صنف ضعیف کی داد رسی کی گئی،

وصیت | احکام وراثت کے بعد بھی وصیت کی اجازت باقی رہی لیکن چونکہ اس سے مستحقین وراثت کی حق تلفی کا اندیشہ تھا، اسلیے وصیت کی تحدید کی ضرورت تھی ۱۰ھ میں حضرت سعدؓ (عامر کے والد) بیمار ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو گئے، انھوں نے عرض کی کہ میں مر رہا ہوں اور میرے صرف ایک ہی لڑکی ہے، چاہتا ہوں کہ دو تہائی مال خیرات کر دوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی، انھوں نے کہا تو نصف، آپ نے اس کو بھی قبول نہیں کیا، انھوں نے کہا ایک تہائی، آپ نے فرمایا یہ بھی بہت ہے، وارثوں کو غنی چھوڑ کر مرنا اس سے اچھا ہے کہ وہ بھیک مانگتے پھریں[۱]" تاہم یہ مقدار آپ نے جائز رکھی، اس وقت سے وصیت ایک ثلث سے زیادہ ممنوع ہو گئی۔

وقف | وقف شریعت کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، اسلام نے اس مسئلہ کو جس حد تک وسعت دی ہے، اس کا دوسرے مذاہب کے قوانین میں شائبہ تک موجود نہیں، اسی بنا پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں دعویٰ کیا ہے کہ اسلام طریقۂ وقف کا موجد ہے، اسلام میں وقف کی تاریخ نہایت قدیم ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے پہلے ہی سال مدینہ میں مسجد نبوی کی بنیاد جس زمین میں رکھی تھی وہ دو یتیموں کی ملکیت تھی، آپ نے قیمت دینی چاہی لیکن انھوں نے کہا۔

لا واللہ لا نطلب ثمنہ الا الی اللہ — نہیں ہم خدا کی قسم قیمت نہ لینگے، ہم اس کی قیمت خدا ہی سے لینگے

یہ اسلام کا پہلا وقف تھا، اور نہایت سادہ صورت میں تھا، چنانچہ امام بخاری اس حدیث کو

[۱] بخاری جلد ا کتاب الوصایا

Marfat.com

وقف مشاع (مشترکہ جائداد کا وقف) کے ثبوت میں لائے ہیں، اس کے بعد ۴ھ یا ۵ھ

میں جب یہ آیت نازل ہوئی،

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ — تم نیکی اس وقت تک نہیں پاسکتے جب تک وہ خدا کی راہ میں نہ دیدو جو تم کو سب سے محبوب ہے،

تو ابوطلحہؓ صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کی "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بیرحا[1] مجھکو سب سے زیادہ محبوب ہے، میں اس کو خدا کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں، اور اس کا ثواب اور اجر خدا سے چاہتا ہوں، آپ جس مصرف میں چاہیں اس کو رکھیں"۔ چنانچہ آپ کے مشورہ سے انھوں نے اس کا منافع اپنے اعزہ پر وقف کیا،

ابتک وقف کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے تھے وہ صرف یہ تھے کہ وہ ذاتی تصرف سے نکال کر خدا کی ملکیت میں دیا گیا، لیکن ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے بعد اسکی حقیقت بالکل واضح کر دیگئی، خیبر میں حضرت عمرؓ کو ایک زمین ملی تھی حضرت عمرؓ نے اس کو وقف کرنا چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے فرمایا،

ان شئت حبست اصلها وتصدقت بها — اگر چاہو اصل جائداد باقی رکھو اور منافع صدقہ کرو

چنانچہ ان شرائط کے ساتھ وہ جائداد وقف ہوئی،[2]

انه لایباع اصلها ولا یوهب ولا یورث — (اصل جائداد نہ بیچی جائے، نہ ہبہ کیجائے اور نہ وراثت میں بانٹی جائے)

نکاح وطلاق نکاح کے متعلق جو اصلاحی احکام آئے انکی تفصیل اصلاحات کے عنوان کے نیچے

---

[1] ایک زمین کا نام ہے جو مدینہ میں واقع تھی [2] یہ تمام حدیثیں بخاری باب الوقف میں ہیں،

Marfat.com

آئے گی، یہاں اسقدر لکھنا کافی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں کئی قسم کے نکاح کے طریقے جاری تھے، جن میں سے ایک کے سوا سب زنا کے مشابہ تھے، سب سے پہلے اسلام نے ان کو ناجائز ٹھہرایا متعہ[1] جو زمانۂ جاہلیت سے چلا آتا تھا، بار بار حرام اور حلال ہوتا رہا، یہانتک کہ ؁۷ھ غزوۂ خیبر میں قطعاً حرام ہوگیا، اگرچہ اس پر بھی اسکی ضرورت پیش آئی کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں منبر پر کہا کہ میں متعہ کو حرام کرتا ہوں یعنی متعہ کی حرمت جو ابھی طرح اب بھی ملک میں شائع نہ ہوسکی ہیں آج اس کا اعلان کرتا ہوں"

نکاح اور طلاق کے دیگر احکام مثلاً محرمات شرعی کا بیان، منہ بولے بیٹے کی بیوی کا حرام نہ ہونا، کثرت ازدواج کی تحدید، تعداد طلاق کی تعیین، زمانۂ عدت کا بیان، مہر کا ضروری ہونا، ظہار یعنی ایک طریقۂ طلاق جس میں اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دیتے تھے، اور لعان یعنی شوہر کا اپنی بیوی کی عصمت پر شبہہ کرنا، اور باہم اپنی سچائی اور دوسرے کی دروغگوئی کا دعویٰ کرنا، یہ تمام تفصیلیں صلاح کے تحت میں آئیں گی، یہاں صرف اسقدر بتادینا کافی ہے کہ یہ تمام احکام قرآن مجید میں مذکور ہیں اور ان کے نزول کا زمانہ ؁۴ھ اور ؁۵ھ ہے،

حدود و تعزیرات دنیا کے مادی خزانہ میں انسان کی جان سے زیادہ کوئی قیمتی شے نہیں، حدود و تعزیرات کے اکثر قوانین ہجرت کے چند برس بعد نازل ہوئے لیکن انسان کی جان کی حرمت کا حکم مکہ ہی میں آچکا تھا، معراج کے سلسلہ میں جو اخلاقی احکام بارگاہ الٰہی سے عطا ہوئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا،

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ	خدا نے جس جان کو حرام کیا ہے اس کو ناحق نہ مارو، اور جو
وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ	ناحق مارا جائے اسکے وارث کو ہم نے اختیار دیا، چاہیے کہ

[1] محدود الوقت نکاح ۱۲ (اضافہ تا ختم باب حلال وحرام)

سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُوْرًا (بنی اسرائیل) — وہ قصاص میں زیادتی نہ کرے، اس کی مدد کی جائے،

عرب میں اسلام سے پہلے بھی قتل و قصاص کے کچھ قوانین موجود تھے، یہود جو اس ملک میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، تورات کے حدود و تعزیرات کا مجموعہ انکے پاس بھی موجود تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عرب میں چونکہ منتظم حاکمانہ طاقت اور اخلاقی روح نہ تھی، اس لیے وہ ان احکام کا نفاذ نہیں کر سکتے تھے، مدینہ پہنچنے کے ساتھ ہی یہود نے فصل مقدمات کے لیے بارگاہ نبوت کی طرف رجوع کیا، آپ انکے مقدمات عموماً تورات کے احکام کے مطابق فیصل کر دیتے تھے،

عرب میں ایک شخص کا قتل صدہا قبائل کی خانہ جنگی کا سلسلہ چھیڑ دیتا تھا، اسلیے غزوۂ بدر کے بعد جب اسلام کے بازوؤں میں حاکمانہ زور آچلا تھا، قصاص کا حکم نازل ہوا، یادہوگا کہ اطراف مدینہ میں بنو قریظہ اور بنو نضیر دو یہودی قبائل رہتے تھے، ان دونوں میں بنو نضیر معزز سمجھے جاتے تھے، اس لیے کوئی قرظی کسی نضیری کو مار ڈالتا تو اس کو بنو نضیر مار ڈالتے تھے، اور اگر کسی نضیری کے ہاتھ سے کوئی قرظی قتل ہو جاتا تو چھوہاروں کے سو وسق خونبہا دیدیتے، مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، لوگوں نے اس کا مرافعہ آپ کی خدمت میں پیش کیا، اس پر سورۂ مائدہ کی چند آیتیں اتریں، ان میں سے ایک آیت یہ ہے[1]

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ — ہم نے انکو تورات میں حکم دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور زخموں کے بدلے ویسے ہی زخم،

[1] ابوداؤد کتاب الدیات،

یہ حکم گو یہودیوں کے لیے تھا لیکن ایک اور آیت نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الخ — مسلمانو! تم پر مقتولین میں مساوات اور برابری کا حکم دیا جاتا ہے۔

اس حکم نے مساوات اور عدل کے پلے کو دنیا میں ہمیشہ کے لیے برابر کر دیا،

یہودیوں میں خوں بہا (دیت) کا قانون نہ تھا[۱] لیکن عرب میں یہ قانون تھا، اور اسلام نے چند اصلاحات کے ساتھ اس کو باقی رکھا،

فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ (بقرہ) — اسکے بھائی (یعنی اولیائے مقتول) کیطرف سے کچھ معاف کر دیا جائے تو اسکی پابندی خوبی کیساتھ کرنا اور بطور احسن اسکو ادا کر دینا چاہیے۔

ابتک قتل عمد اور قتل شبہ (یعنی غلطی سے قتل) میں کوئی تفریق نہ تھی۔ ۳ھ میں ایک مسلمان غلطی سے ایک مسلمان کے ہاتھ سے مارا گیا، اور ایک مسلمان انصاری کے ہاتھ سے ایک قریشی قتل ہوا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کے بھائی کو خونبہا دیکر راضی کر لیا، اس کے بعد وہ منافقانہ اسلام لایا، اور غداری سے انصاری کو قتل کر کے قریش میں جا کر مل گیا، ان واقعات کی بنا پر قتل شبہ کے متعلق متعدد احکام نازل ہوئے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ إِلَّا — کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ کسی دوسرے مسلمان کو مار ڈالے لیکن غلطی سے، اگر کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کیا تو ایک مسلمان غلام آزاد اور خونبہا اسکے وارثوں

---

[۱] صحیح بخاری کتاب التفسیر آیۃ کتب علیکم القصاص

اَنْ يَّصَّدَّقُوْا فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ	ادا کرنا چاہیے لیکن یہ کہ معاف کریں تو خیر، اگر مقتول خود
لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ	مسلمان ہو، وہ کسی دشمن قوم سے تو صرف ایک غلام
وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ	آزاد کرو، اور اگر ایسی قوم سے ہو جس سے تم سے معاہدہ ہو تو
فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ	خونبہا دینا اور ایک غلام آزاد کرنا چاہیے اگر قاتل کو یہ
مُّؤْمِنَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ	مقدور نہ ہو تو پے درپے دو مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں کہ
مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ	خدا کی طرف رجوع ہو، خدا علم اور حکمت والا ہے، اور جو کسی مومن کو
عَلِيْمًا حَكِيْمًا وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا	جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا دوزخ ہے، ہمیشہ اس
فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ	میں رہے گا، خدا اس پر اپنا غضب اور لعنت بھیجے گا
عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا	اور اس کے لیے بڑا عذاب اس نے مہیا کیا ہے،

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ قصاص و قتل کے متعلق یہ سب سے آخری حکم تھا، حفاظت جان کا اعلان فتح مکہ کے موقع پر ہوا جب آپ نے ارشاد فرمایا کہ "زمانۂ جاہلیت کے تمام خون میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں"۔ اس کے بعد قتل خطا شابہ بہ قتل عمد کے خونبہا کی تحدید فرمائی،[1] قتل خطا کا خونبہا اہل قریہ کے لیے ۴۰۰ دینار مقرر کیا۔[2]

سنہ ۶ھ تک رہزنوں کے لیے کوئی حد مقرر نہ تھی، سنہ ۶ھ میں عکل و عرینہ کے قبیلہ کے کچھ لوگ مدینہ آکر مسلمان ہوئے، یہاں کی آب وہوا ان کو راس نہ آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر سے باہر چراگاہ میں ان کو قیام کی اجازت دی، ایک موقع پر مسلمان چرواہوں کو طرح طرح

---

[1] ابوداؤد کتاب الدیات، باب فی دیۃ الخطا شبہ العمد [2] ابوداؤد دیات الاعضاء

Marfat.com

سے عذاب دے کر بڑی بیرحمی سے مار ڈالا اور مویشی لوٹ کر لے گئے، وہ گرفتار ہو کر آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو اسی طرح عذاب کے ساتھ قتل کا حکم دیا، گو یہ برابر کا انتقام تھا تاہم اس میں کسی قدر بیرحمی تھی، اس لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا، اور ڈاکوؤں کے لیے علیحدہ احکام نازل ہوئے[1]

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ	(ان لوگوں کی سزا جو خدا اور اسکے رسول سے لڑائی
وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ	لڑتے ہیں اور ملک میں فساد مچاتے ہیں یہ ہے کہ قتل کیے
فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ	جائیں یا پھانسی دیے جائیں یا انکے ادھر کے ہاتھ
اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ	اور ادھر کے پانوں کاٹ ڈالے جائیں، یا ملک سے
اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (مائدہ)	الگ کر دیے جائیں (یعنی قید ہوں یا جلا وطن کیے جائیں)

جان کے بعد مال کا درجہ ہے، اسلام سے پہلے عرب میں چوروں کے لیے قطع ید کی سزا جاری تھی، اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا، اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا، ۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت نے اس جرم کا ارتکاب کیا، چونکہ وہ ایک شریف خاندان سے تھی، اس لیے مسلمانوں میں بڑا اضطراب پیدا ہوا، حضرت اسامہ رضؓ بن زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت چہیتے تھے، ان سے سفارش کرائی گئی، آپ بہت برہم ہوئے، اور لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ "تم سے پہلے لوگوں کی ہلاکت کا یہی سبب ہوا کہ وہ نیچے طبقہ کے لوگوں پر تو احکام جاری کرتے لیکن اوپر درجہ کے لوگ جب جرم کا ارتکاب کرتے تو ان سے درگذر کرتے، خدا کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ

[1] ابوداؤد کتاب الحدود باب المحاربہ۔

بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا۔" اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں نے بے چون وچرا اس حکم کی تعمیل کی۔[1]

عربوں میں زنا کی کوئی سزا مقرر نہ تھی، یہودیوں میں توراۃ کی رو سے زانی کی سزا رجم (یعنی سنگسار کرنا) مقرر تھی لیکن اخلاقی کمزوری کی بنا پر اس حکم کو جاری نہیں رکھ سکتے تھے، اطراف مدینہ میں جو یہود آباد تھے، رجم کے بجائے انھوں نے یہ سزا مقرر کی تھی کہ مجرم کے منہ میں کالک لگا کر کوچہ وبازار میں اس کی تشہیر کرتے تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو انھوں نے ایک مجرم کا مقدمہ آپ کی خدمت میں پیش کیا، غالباً یہ ۳ھ کے اندر کا واقعہ ہے، آپ نے استفسار فرمایا کہ تمہاری شریعت میں اس جرم کی کیا سزا ہے، انھوں نے اپنا رواج بتایا، آپ نے توراۃ منگوا کر ان سے پڑھوایا، انھوں نے رجم کی آیت پر انگلی رکھ کر چھپا دی، آخر ایک مسلمان یہودی نے نکال کر وہ آیت سنائی، آپ نے فرمایا "خداوندا! یہ تیرا حکم ہے جس کو ان لوگوں نے مردہ کر دیا ہے میں سب سے پہلا شخص ہوں جو تیرے اس حکم کو زندہ کروں گا۔"[2] چنانچہ آپ نے اس کے سنگسار کرنے کا حکم دیا اور وہ سنگسار کیا گیا۔

۵ھ میں سورۂ نور نازل ہوا جس میں زنا کی سزا سو درّے قرار دی گئی، حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ رجم کی سزا بھی قرآن نے باقی رکھی تھی، اس کی تلاوت منسوخ ہو گئی[3]، بہر حال احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بن بیاہے کے سو درّے اور بیاہوں کے لیے رجم کا حکم ہے[4]، چنانچہ ۵ھ میں ایک مسلمان نے اس جرم کا ارتکاب کیا، اور گو لوگوں کو اس کا علم نہ تھا لیکن دنیا کی سزا کو آخرت کے عذاب پر اس نے ترجیح دی، اور مجمع عام میں آکر بارگاہ نبوت میں عرض پرداز ہوا کہ "یا رسول اللہ میں

---

[1] صحیح بخاری غزوۃ الفتح۔ [2] ابوداؤد باب فی رجم الیہودیین۔ [3] صحیح بخاری رجم المحصن۔ [4] تمام کتب حدیث میں یہ مذکور ہے۔

گنہگار ہوں، مجھے پاک کیجئے" آپ نے تحقیق فرمائی اور اس کے رجم کا حکم دیا۔

شراب سنہ ھ میں حرام ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شرابخوری کی کوئی خاص سزا مقرر نہ تھی، چالیس درے تک لوگوں کو اس جرم میں مارے گئے ہیں، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اسی درے کر دیے تھے، قذف یعنی پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانے کی سزا سنہ ھ میں نازل ہوئی۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا — جو لوگ پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں،

بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ — پھر چار گواہ نہ لاسکیں تو ان کو اسی درے مارو،

جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا (نور) — اور پھر کبھی ان کی گواہی نہ قبول کرو۔

دنیا میں تین چیزیں ہیں، جان، مال اور آبرو، جن حدود و تعزیرات کا اوپر ذکر ہوا، وہ ان ہی تین چیزوں کے تحفظ کے لیے ہیں، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قوانین کے نزول کے بعد سنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر حرم کے اندر ماہ حرام کی تاریخوں میں فرمایا:

"مسلمانو! ہر مسلمان کی جان، مال اور آبرو اسی طرح قابلِ حرمت ہے جس طرح اس محترم شہر میں، اس احاطۂ حرم کے اندر یہ مقدس دن قابل حرمت ہے۔"

حلال و حرام

ماکولات میں حلال وحرام | دعرب میں کھانے پینے میں کسی چیز کا پرہیز نہ تھا، اور نہ کوئی شے حلال یا حرام

له سنہ ھ کی تحدید کہیں بہ تفصیل مذکور نہیں ہے، یہ سنہ اس قیاس سے شارحین حدیث نے اختیار کیا ہے کہ اس وقت حضرت ابوہریرہؓ مدینہ میں موجود تھے، اور یہ ثابت ہے کہ وہ اسی سال بزمانہ فتح خیبر، ہوئے تھے، ابوداؤد و زرقانی تاریخ فی الخمر، واقعہ افک اسی سال ہوا تھا، اور یہ آیت اسی تعلق سے نازل ہوئی ہے، اسلئے اسکے لیے سنہ ھ کا زمانہ متعین کیا گیا۔

Marfat.com

تھی، مردار اور حشرات الارض تک کھاتے تھے۔ البتہ بعض بعض جانور جنکو بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے، ان کا ذبح کرنا گناہ سمجھتے تھے، بعض جانوروں میں یہ نذر مانتے تھے کہ مرد کھا سکتے ہیں، عورتیں نہیں، اگر بچہ مردہ پیدا ہوا تو مرد عورت دونوں کھا سکتے ہیں، اور زندہ ہو تو صرف مرد کھائیں، اسی قسم کے اور بعض بت پرستانہ رسوم تھے، سورہ انعام میں جو مکہ میں نازل ہوا تھا، ان رسوم کا بہ تفصیل ذکر ہے، اسلام کے اکثر احکام گو مدینہ میں اترے لیکن ماکولات کی حلت و حرمت کے احکام مکہ ہی میں اترنے شروع ہو چکے تھے، چنانچہ سورۂ انعام میں مشرکین کے ان رسوم کی تردید کے بعد حکم آیا،

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْمَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى	کہدے کہ مجھپر جو وحی اتری ہے اس میں کسی کھانے والے
طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ	پر کوئی شے حرام نہیں ہے، ہاں اگر حرام ہو تو مردار یا بہتا ہوا
دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ	خون یا سور کا گوشت، کیونکہ یہ چیزیں ناپاک ہیں، یا وہ
اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ	گناہ کا جانور، جو غیر خدا کے نام پر چڑھایا جائے وہ بھی حرام
غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ	ہے لیکن جو مجبور ہے لاچار ہو کر نافرمانی اور گناہ کے ارادے نہیں
رَّحِيْمٌ	اس میں سے کچھ کھالے تو تیرا پروردگار معاف کرنے والا اور رحم والا ہے

مشرکین کو سب سے زیادہ تعجب اس پر ہوا کہ جو آپ سے مرجائے اس کو حرام کہتے ہیں، اور جس کو خود اپنے ہاتھ سے ماریں اس کو حلال جانتے ہیں، حالانکہ دونوں میں کوئی فرق نہیں، اس پر یہ آیت اتری،

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ	جو جانور خدا کا نام لیکر ذبح کیا گیا ہو وہ کھاؤ، جو خدا
بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا	کا نام لیکر ذبح کیا گیا وہ کیوں نہ کھاؤ، خدا نے
مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ	تم پر جو حرام کیا ہے، اس کو تو وہ بیان ہی

مَاحَرَّمَ عَلَيْكُمْ (انعام) کرچکا،

اس کے بعد مکہ معظمہ ہی میں سورۂ نحل کی آیت فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ الخ نازل ہوئی، جس میں اسی حکم سابق کا اعادہ کیا گیا، اور یہی چار چیزیں مردار، خون، سور، اور بتوں پر چڑھائے حرام بیان کی گئیں، مدینہ طیبہ میں آکر پہلے سورۂ بقرہ میں اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ الخ تیسری بار یہ محرماتِ اربعہ بیان کیے گئے، عرب میں حلال وحرام کی تمیز کم تھی، وحشت وجہالت کے علاوہ اس کا ایک سبب عام غربت اور افلاس تھی، اس لیے مسلمانوں کی مالی حالت جیسے جیسے درست ہوتی جاتی تھی، حلال وحرام کی تفریق بڑھتی جاتی تھی، لوگ عموماً مردار اسی کو سمجھتے تھے جو بیمار ہو کر اپنی موت سے مرجائے، اس لیے اگر اور کسی سبب سے جانور مرجاتا تو اس کو حرام نہیں سمجھتے، ہجرت کے چار پانچ سال کے بعد سورۂ مائدہ میں مردار (میتہ) کی تفصیل بیان کی گئی یعنی یہ کہ یا وہ گلا گھٹنے سے مرا ہو، اَلْمُنْخَنِقَةُ یا گردن ٹوٹنے سے مرا ہو وَالْمَوْقُوْذَةُ، یا اوپر سے گر کے مرا ہو، وَالْمُتَرَدِّيَةُ یا کسی جانور کا سینگ لگ کر مرگیا ہو وَالنَّطِيْحَةُ، یا کسی جانور نے اس کو پھاڑ ڈالا ہو وَمَا اَكَلَ السَّبُعُ صرف وہ جانور حلال ہے جس کو تم نے ذبح کیا اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ،

سنہ ۷ھ میں جب مسلمانوں کو خیبر کی فتوحات اور جاگیریں ہاتھ آئیں تو جانوروں میں بھی حلال وحرام کی تفریق کی گئی، اور اعلان کیا گیا کہ آج سے گدھا، درندہ جانور اور پنجہ دار پرند حرام ہیں، سنہ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد طے کے قبیلہ نے جو عیسائی تھا، اسلام قبول کیا، اور شام کے بعض عیسائی مسلمان ہوئے، یہ لوگ شکاری کتے پالتے تھے اور ان سے شکار کرتے تھے، اسلام لانے پر انکو معلوم ہوا کہ مردہ جانور حرام ہیں، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا حال عرض کیا

اس پر یہ آیت اتری

یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ تجھ کو پوچھتے ہیں کہ ان کیلیے کیا حلال کیا گیا کہدے کہ تمام ستھری چیزیں

اس کے بعد یہ تفصیل ہے کہ شکاری جانور اگر سدھے ہوئے ہوں اور خدا کا نام لیکر چھوڑے جائیں تو ان کا شکار کیا ہوا کھانا حلال ہے[1]۔

شراب کی حرمت مخالفین کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے اکثر احکام (مثلاً تعدد ازدواج وغیرہ) نفس پرستی کے مؤید تھے، اسلیے عرب کو اس کے قبول کرنے میں کوئی ایثار درکار نہ تھا، بلکہ اسلام وہی کہتا تھا جو وہ خود چاہتے تھے، اس بحث کی تحقیق آگے آئیگی، یہاں صرف تاریخی حیثیت سے شراب کی حرمت کا واقعہ ذکر کرنا مقصود ہے

عرب کو شراب سے بڑھ کر کوئی چیز محبوب نہ تھی، تمام ملک اس مرض میں مبتلا تھا عرب کی شاعری کا موضوع اعظم شراب ہے مصلحت کے لحاظ سے اسلام کے تمام احکام بتدریج آئے ہیں، اس لیے شراب بھی بتدریج حرام کی گئی،

مدینہ میں شراب خواری کا رواج کسی قدر زیادہ تھا بڑے بڑے شرفا علانیہ شراب پیتے تھے عرب میں ایسے بھی نیک لوگ تھے جنھوں نے شراب پینی چھوڑ دی تھی اور اس کو خلاف اتقا سمجھتے تھے، ابھی تک اسلام نے اس کے متعلق کوئی اپنا فیصلہ نہ سنایا تھا، لوگوں نے پوچھنا شروع کیا کہ شراب کے متعلق کیا حکم ہے، حضرت عمرؓ نے کہا۔

اللّٰھم بین لنا فی الخمر بیانا شفاء اے خدا شراب کے بارے میں ہمارے لیے شافی بیان کر دے

[1] حوالوں کے لیے ان آیتوں کے شان نزول تفسیروں میں دیکھو

اس پر یہ آیت اتری

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (بقرہ - ۲۷)

لوگ تم سے شراب اور جوئے کی بابت دریافت کرتے ہیں، کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدے بھی ہیں لیکن فائدہ سے گناہ بڑھ کر ہے،

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے رہے، ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کی دعوت کی جس میں شراب بھی تھی، کھانے کے بعد مغرب کا وقت آگیا، اور حضرت علیؓ نے نماز پڑھائی، لیکن نشہ کے خمار میں کچھ کا کچھ پڑھ گئے، حضرت عمرؓ نے پھر دعا کی کہ خدایا شراب کے بارے میں صاف صاف بیان کر دے، اس پر یہ آیت اتری،

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نساء)

نشہ کی حالت میں تم نماز نہ پڑھو، یہاں تک کہ جو تم کہو اس کو بھی سمجھ سکو،

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب نماز کا وقت آتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک منادی اعلان کرتا تھا کہ "کوئی مخمور نماز میں نہ شامل ہونے پائے"[1] لیکن چونکہ عام حکم نہ تھا، اسلیے نماز کے سوا باقی اوقات میں لوگ بے تکلف پیتے پلاتے تھے، حضرت عمرؓ نے پھر وہی دعا کی، اسی زمانہ میں کچھ لوگ شراب پی کر اسقدر بدمست ہوئے کہ آپس میں مار پیٹ تک نوبت پہنچ گئی[2]، اس پر یہ آیت اتری[3]

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ

مسلمانو! بے شبہ شراب اور جوا اور بت اور قمار کے تیر ناپاک ہیں اور شیطان کے کام ہیں، تو تم اس سے باز آؤ کہ تم کو

---

[1] یہ پورا واقعہ ابوداؤد کتاب الاشربہ میں مذکور ہے [2] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۲۸ ذکر سعد وقاصؓ [3] ابوداؤد میں پوری آیتیں نہیں مذکور ہیں، بلکہ چند لفظ نقل کر کے پوری آیت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

Marfat.com

لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ، اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطَانُ اَنْ یُّوْقِعَ — فلاح حاصل ہو، شیطان تو صرف یہ چاہتا ہے کہ

بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ — تم لوگوں میں شراب اور جوے کے ذریعہ سے دشمنی

وَیَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ — اور بغض ڈالدے اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز

فَہَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَہُوْنَ (مائدہ) — سے روک دے تو بولو! تم باز آتے ہو؟

(ان آیتوں کے نزول کے بعد شراب قطعاً حرام ہو گئی، اسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی گلی کوچوں میں منادی کرادی کہ آج سے شراب حرام ہے۔ لیکن بایںہمہ شراب کی تجارت اور خرید و فروخت جاری تھی، سـ۸ھ میں یہ بھی حرام ہو گئی، آپ نے مسجد نبوی میں لوگوں کو جمع کرکے اسی وقت اعلان کیا[1]، اس کے بعد اسی سال فتح مکہ کے زمانہ میں آپ نے علی الاعلان ان چیزوں کی تجارت کی ممانعت فرمائی، جن کا کھانا یا رکھنا ناجائز ہے، آپ نے فرمایا

اِنَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ حَرَّمَ بَیْعَ الْخَمْرِ وَالْمَیْتَۃِ وَالْخِنْزِیْرِ وَالْاَصْنَامِ[2] — خدا اور اس کے رسول نے شراب، مردہ، سؤر اور بتوں کی خرید و فروخت حرام کر دی)

غور کرو! شراب کی حرمت کس طرح، اعلان عام کیساتھ عمل میں آئی، بایںہمہ بھی تک یہ نہیں متعین ہوا کہ یہ کس سال کا واقعہ ہے، محدثین اور ارباب روایت اس امر میں نہایت مختلف الآرا ہیں،[3]

---

[1] صحیح بخاری (تفسیر آیت الربوا) وصحیح مسلم باب تحریم بیع الخمر میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اواخر سورہ بقرہ کے نزول کے بعد جس میں حرمت ربوٰ کا حکم ہے، یہ اعلان فرمایا، یہ آیتیں سـ۸ھ میں نازل ہوئی ہیں، "س" [2] صحیح بخاری ومسلم باب تحریم بیع الخمر والمیتۃ والاصنام [3] سیرۃ النبی جلد اول میں حرمت شراب کی دو تاریخیں مختلف مقامات پر لکھی گئی ہیں صفحہ ۲۰۸ میں سـ۳ھ اور صفحہ ۳۹۷ میں سـ۸ھ لکھا گیا ہے، پہلا بیان عام ارباب سیر کا ہے، دوسرا علامہ ابن حجر کی تحقیق ہے لیکن مصنفین سیرۃ النبی کی اصلی تحقیق یہاں مذکور ہوئی ہے، اور وہ اس باب میں عام محدثین کے ساتھ ہیں، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، "س"

Marfat.com

حافظ ابن حجر فتح الباری کتاب التفسیر سورۂ مائدہ باب لیس علی الذین امنوا میں لکھتے ہیں

والذی یظهر ان تحریمها کان عام الفتح	اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی حرمت فتح مکہ
سنة ثمان کما روی احمد من طریق	کے زمانہ ۸ھ میں ہوئی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ
عبدالرحمن بن وعلة قال سالت ابن	امام احمد نے عبدالرحمن بن وعلہ کی سند سے روایت کی ہے کہ
عباس عن بیع الخمر فقال کان لرسول الله	میں نے حضرت عبداللہ بن عباس سے پوچھا کہ شراب کا
صلی الله علیه وسلم صدیق من ثقیف او دوس	بیچنا کیسا ہے تو انھوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
فلقیه یوم الفتح براویة خمر یهدیها	ایک دوست تھے جو ثقیف یا دوس کے قبیلہ سے تھے، وہ
الیه فقال یا فلان اما علمت ان	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ میں ملے اور ایک مشک شراب
الله حرمها . الخ	تحفہ پیش کی، آپ نے فرمایا تمکو معلوم نہیں کہ خدا نے شراب کو حرام کر دیا ہے

ہماری رائے میں حافظ ابن حجر کا خیال اور ان کا استدلال صحیح نہیں، اس روایت سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ان صاحب کو شراب کی حرمت کا حال فتح مکہ تک نہیں معلوم ہوا تھا[1] یہ کہاں

(۱) مصنف کا یہ قیاس بالکل درست ہے۔ جن صاحب کا یہ واقعہ ہے وہ قبیلہ ثقیف یا دوس سے تھے، ثقیف کا قبیلہ ۸ھ میں مسلمان ہوا، اور دوس گو بہت پہلے اسلام لا چکے تھے لیکن وہ مدینہ سے بہت دور آباد تھے، اسکے علاوہ ایک نکتہ بھی ہے جس کی طرف ہمارے محدثین نے توجہ نہیں کی ہے، وہ یہ ہے جیسا کہ ہم متن میں پہلے لکھ آئے ہیں کہ شراب کا پینا گو ۳ھ میں حرام ہو چکا تھا لیکن شراب کی تجارت بند نہیں ہوئی تھی چنانچہ یہ صاحب بھی اسے فروخت کرتے تھے شراب کی خرید و فروخت ممانعت ربا کی حرمت کے ساتھ عمل میں آئی، اور ربا کی حرمت سب سے آخر میں نازل ہوئی، یعنی ۸ھ میں شراب فروشی کی ممانعت مدینہ میں اسی وقت کر دی گئی لیکن اس کا عام اعلان آپ نے فتح مکہ

Marfat.com

ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک حرمت نازل بھی نہیں ہوئی تھی، بہت سے احکام ہیں جنکی خبر دور کے رہنے والوں کو بہت دیر کے بعد ہوئی،

علاوہ اس کے خود بعض روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے شراب کی حرمت نازل ہو چکی تھی، یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ شراب جیسی ناپاک چیز ۸ھ تک حلال رہتی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف دو برس پہلے حرام ہوتی، حقیقت میں شراب ہجرت کے تیسرے یا چوتھے برس حرام ہو چکی تھی،[1]

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۵) کے زمانہ میں فرمایا جیسا کہ احادیث صحیح میں بتصریح مذکور ہے، (دیکھو صحیح بخاری تفسیر آیت ربوا باب بیع المیتۃ والاصنام اور صحیح مسلم باب تحریم بیع الخمر) حافظ ابن حجر جو اس بات کے قائل ہیں کہ شراب کی حرمت ۸ھ میں نازل ہوئی، وہ خود جلد اول صفحہ ۱۴۱ میں قاضی عیاض کے جواب میں لکھتے ہیں قلت ویحتمل ان یکون تحریم التجارۃ فیھا تاخر عن وقت تحریمھا واللہ اعلم یعنی ممکن ہے کہ شراب پینے کی حرمت کے بعد شراب کی تجارت کی حرمت نازل ہوئی ہو" صحیح مسلم میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (باب تحریم بیع الخمر) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب پینے اور اسکی خرید فروخت کی ممانعت ایک ساتھ نازل ہوئی، لیکن اسکے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور جابر بن عبد اللہ سے جو روایتیں ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلی روایت میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ یا ان کے بعد کے راویوں سے کسی قدر تسامح ہوا ہے، وھذا ھو الحق علاوہ ازیں حافظ ابن حجر نے امام احمد کی جس حدیث سے فتح مکہ میں شراب نوشی کی حرمت کے نزول پر استدلال کیا ہے وہ حدیث صحیح مسلم (باب تحریم بیع الخمر) میں بھی ہے، لیکن اس میں فتح مکہ کی تعیین نہیں)

[1] سب سے بڑی دلیل اسکی یہ ہے کہ جب شراب کی حرمت نازل ہوئی تو لوگوں نے کہا کہ ہمارے مسلمان بھائی جو شراب پی کر جنگ میں شریک ہوئے اور اسی حالت میں مارے گئے ان کا کیا حال ہوگا، اس پر یہ آیت لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا نازل ہوئی (باقی ص ۱۴۷ پر)

Marfat.com

سود خواری کی حرمت

(سود[1] خواری بھی ان اخلاق ذمیمہ میں سے ہے جو اہل عرب کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئے تھے، اسی لیے نہایت تدریج کے ساتھ اسکی حرمت کے احکام بھی اترے، قریش عموماً تجارت پیشہ تھے، ان میں جو امیر اور دولتمند سوداگر تھے، وہ غریبوں اور کاشتکاروں کو بھاری شرح سود پر روپیہ قرض دیتے اور جب تک قرض وصول نہ ہو جاتا اصل سرمایہ کو ہر سال بڑھاتے جاتے[2]، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس (اسلام سے پہلے) بہت بڑے سودی کاروبار کے مالک تھے[3]، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہودی تاجروں کے سبب سے یہاں مختلف قسم کے سود کا رواج دیکھا، سب سے پہلے آپ نے چاندی اور سونے کے ادھار خرید و فروخت کو سود قرار دیا[4]،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۶) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی حرمت کا واقعہ جنگ اُحد سے بالکل متصل تھا اور جنگ اُحد کا زمانہ یہی ہے، بخاری تفسیر آیت مذکور میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے

صبح ناس غداۃ احد الخمر فقتلوا من یومھم جمیعا شھداء وذلک من قبل تحریمھا،	غزوہ احد کی صبح کو کچھ لوگوں نے شراب پی اور یہ سب اسی دن شہید ہوئے، یہ شراب کی حرمت سے پہلے ہوا،

اس روایت کے ساتھ حضرت انسؓ کی اس روایت کو ملاؤ، جو اس کے بعد ہی واقع ہے

فقال بعض القوم قتل قوم وھی فی بطونھم قال فانزل اللہ لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ	حرمت شراب کی آیت نازل ہوئی تو بعض لوگوں نے کہا کہ کچھ لوگ اس حال میں مارے گئے ہیں کہ شراب انکے پیٹ میں تھی، اس پر یہ آیت اتری کہ مومنوں پر کچھ حرج نہیں،"

[1] اضافہ ناتمام سود [2] موطا امام مالک باب الربوٰ [3] ابن جریر تفسیر آیت ربوٰ [4] صحیح مسلم باب الصرف

پھر دو گنے اور چوگنے سود لینے کی ممانعت آئی اور یہ آیت اتری

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا	مسلمانو! دُگنا چوگنا سود نہ کھایا کرو، اور خدا سے
مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (آل عمران)	ڈرا کرو تاکہ فلاح پاؤ،

اس کے بعد آپ نے ہم جنس اشیاء کا باہم گھٹ بڑھ کے مبادلہ منع فرمایا،[۱] ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے موقع پر مسلمانوں نے یہودی سوداگروں سے لین دین شروع کیا، اس وقت آپ نے اعلان فرمایا کہ سونے کو اشرفی کے بھاؤ گھٹا بڑھا کر بیچنا بھی سود ہے،[۲] سود کی حرمت کے متعلق تفصیلی احکام ۸ھ میں نازل ہوئے، آل عمران کے بعد سورۂ بقرہ میں سب سے پہلے یہ آیت اتری،

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا	جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ اس طرح کھڑے ہونگے جس طرح
كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ	شیطان کسی کو چھو کر مخبوط بنا دیتا ہے، اسلیے کہ وہ یہ کہتے
مِنَ الْمَسِّ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا	ہیں کہ بیع اور سود کا معاملہ ایک ہی ہے، خدا نے بیع کو تو
الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ	حلال کیا اور سود کو حرام کر دیا، پس جس کے پاس خدا
وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ	کی طرف سے نصیحت کی بات پہنچی اور وہ باز آگیا تو اسکو
مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ	وہی لینا چاہیے جو پہلے دیا،

لوگوں کو یہ اعتراض تھا کہ سود بھی ایک قسم کی تجارت ہے، جب تجارت جائز ہے تو سود کیوں حرام ہے، اس سوال کا جواب تو کتاب کی دوسری جلدوں میں آئے گا، یہاں صرف سود کی تاریخ حرمت سے بحث ہے، اس آیت میں بھی سود کی قطعی حرمت کا فیصلہ نہ ہوا، آخر تھوڑے

---

۱ صحاح کتاب البیوع ۲ صحیح مسلم باب بیع القلادہ فیہا خرز

Marfat.com

ہی دفعہ کے بعد غالباً سنہ ؁ میں یہ آیت نازل ہوئی،

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا	مسلمانو! خدا سے ڈرو اور سود جو باقی رہ گیا ہے اسکو
مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ	چھوڑ دو، اگر تم سچے مومن ہو، اگر یہ نہ کرو تو خدا اور
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ	رسول سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ، اگر باز آجاؤ
وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ	تو تم کو اپنے راس المال کا حق ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو
اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (بقرہ)	اور نہ تم پر کوئی ظلم کرے

یہ آیت جب اتری تو آپ نے مسجد میں تمام مسلمانوں کو جمع کرکے یہ حکم سنایا،[1] سنہ ۹ھ میں اہل نجران سے جو معاہدات صلح ہوئے، ان میں ایک دفعہ یہ بھی تھی، کہ "سود نہ لیں گے"۔[2] ذیحجہ سنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر اس آیت کے نزول سے پہلے تمام ملک عرب میں جس قدر سودی معاملات تھے، آپ نے سب کو کالعدم قرار دیا،

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سود کی حرمت کا حکم اسلام کے سلسلۂ احکام کی سب سے آخری کڑی تھی[3]

---

[1] صحیح بخاری و مسلم باب تحریم بیع الخمر [2] ابوداؤد باب اخذ الجزیۃ [3] صحیح بخاری تفسیر آیت واتقوا یوماً (بقرہ)

Marfat.com

سالِ آخر حجۃ الوداع اختتامِ فرضِ نبوت

ذی حجہ سنہ ۱۰ھ مطابق فروری سنہ ۶۳۲ء

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ	جب خدا کی مدد آگئی اور مکہ فتح ہو چکا اور تو نے دیکھ لیا کہ
یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ	لوگ خدا کے دین میں فوج کی فوج داخل ہو رہے ہیں تو خدا کے
رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا	حمد کی تسبیح پڑھ اور استغفار کر، خدا توبہ قبول کرنے والا ہے

بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ نصرت اور فتح کے مقابلہ میں شکر کی ہدایت ہونی چاہیے تھی، تسبیح اور استغفار کو فتح سے کیا مناسبت ہے؟ اسی بنا پر ایک صحبت میں حضرت عمرؓ نے صحابہ سے اس آیت کے معنی پوچھے، لوگوں نے مختلف معنی بتائے، حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن عباسؓ کی طرف دیکھا، وہ کمسن تھے، اور جواب دیتے جھجکتے تھے، حضرت عمرؓ نے ان کی ڈھارس بندھائی تو انھوں نے کہا کہ "یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قربِ وفات کا اعلان ہے، کہ استغفار موت کے لیے مخصوص ہے"[۱]،

اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد آپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ رحلت کا زمانہ قریب آگیا، اس لیے

---

[۱] صحیح بخاری تفسیر سورہ اذا جاء [۲] واحدی نے اسباب النزول میں لکھا ہے کہ یہ سورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے دو برس پہلے اتری، لیکن ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ سنہ ۱۰ھ میں اور عین ایام تشریق میں اتری، یہ دوسری روایت اصل میں بیہقی کی ہے اور ابن حجر اور زرقانی نے تصریح کی ہے کہ اسکی سند ضعیف ہے" اسلیے واحدی کی روایت صحیح ہے، سیوطی نے بھی اسباب النزول میں مصنف عبدالرزاق کے حوالہ سے یہی روایت نقل کی ہے کہ یہ سورہ فتح مکہ کے بعد ہی فوراً نازل ہوئی، تصریحات ائمہ و اشارات حدیث کے علاوہ خود اس سورہ کا طرز بیان ظاہر کر رہا ہے کہ وہ فتح مکہ کے متصل ہی اتری ہے یعنی حجۃ الوداع سے تقریباً دو پونے دو برس پہلے جن روایتوں میں وفات سے چند روز پہلے اس سورہ کا نازل ہونا بیان ہوا ہے، وہ حدیث و روایت دونوں حیثیتوں سے ضعیف ہیں) "س"

خلیق احمد نظامی: آخری خطبہ کی تاریخی اہمیت، تاریخی مقالات، ندوۃ ۱۹۶۶ء

اب ضرورت تھی کہ تمام دنیا کے سامنے شریعت اور اخلاق کے تمام اصولِ اساسی کا مجمع عام میں اعلان کر دیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد[1] زمانہ سے ابتک فریضۂ حج ادا نہیں فرمایا تھا، ایک مدت تک تو قریش سد راہ رہے، صلح حدیبیہ کے بعد موقع ملا، لیکن مصالح اسکے مقتضی تھے کہ یہ فرض سب سے آخر میں ادا کیا جائے،

بہرحال ذوقعدہ[2] میں اعلان ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حج کے ارادہ سے مکہ تشریف لیجارہے ہیں، یہ خبر دفعۃً پھیل گئی، اور شرف ہمرکابی کے لیے تمام عرب امنڈ آیا، (سنیچر کے دن) ذوقعدہ کی ۲۶ تاریخ کو آپ نے غسل[3] فرمایا، اور چادر اور تہمد باندھی، نماز ظہر کے بعد مدینہ سے باہر نکلے، اور تمام ازواج مطہرات کو ساتھ چلنے کا حکم دیا، مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ذوالحلیفہ ایک مقام ہے جو مدینہ کی میقات ہے، یہاں پہنچکر شب بھر اقامت فرمائی، دوسرے دن دوبارہ غسل فرمایا، (حضرت عائشہؓ نے اپنے ہاتھ سے آپکے جسم مبارک میں عطر ملا[3]) اس کے بعد آپ نے دو رکعت نماز ادا کی، پھر قصواء پر سوار ہو کر احرام باندھا اور بلند آواز سے یہ الفاظ کہے،

لبیک اللھم لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک ۔ اے خدا ہم تیرے سامنے حاضر ہیں، اے خدا تیرا کوئی شریک نہیں

(1) سنن ابن ماجہ میں ہے (باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم) کہ ہجرت سے پہلے آپ نے دو حج فرمائے، بعض حدیثوں میں جو یہ ہے کہ آپ نے ایک ہی حج کیا تھا، (ترمذی باب کم حج النبیؐ و ابو داؤد وقت الاحرام) اس سے مقصود بعد ہجرت ہے۔ (2) ابو داؤد و صحیح مسلم میں حجۃ الوداع کا واقعہ نہایت تفصیل سے مذکور ہے، جسکا شان نزول یہ ہے کہ حضرت امام باقر نے حضرت جابرؓ سے جب وہ نابینا ہوگئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کا حال پوچھا، حضرت جابرؓ نے آل رسول کی محبت سے امام باقر کے گریبان کے تکمے کھولے اور انکے سینہ پر محبت سے ہاتھ رکھکر کہا بھتیجے پوچھو کیا پوچھتے ہو، پھر نہایت تفصیل سے حج نبویؐ کے تمام حالات بیان کیے (اوقات کی تعیین بھی بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباسؓ، انسؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں میں ہے اور امام نسائی نے کتاب المناسک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت و تاریخ کے لیے خاص باب باندھا ہے، باب الوقت الذی خرج فیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (3) صحیح بخاری و صحیح مسلم۔ (4) غسل کا ذکر طبقات ابن سعد ذکر حجۃ الوداع میں ہے، ص ۱۲۴

ان الحمد والنعمۃ لک والملک لک — ہم حاضر ہیں، تعریف اور نعمت سب تیری ہی ہے

لا شریک لک — اور سلطنت میں کوئی تیرا شریک نہیں۔

حضرت جابرؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں، ان کا بیان ہے کہ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو آگے پیچھے، دائیں بائیں، جہاں تک نظر کام کرتی تھی، آدمیوں کا جنگل نظر آتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لبیک فرماتے تھے تو ہر طرف سے اسی صدائے غلغلہ انگیز کی آواز بازگشت آتی تھی، اور تمام دشت و جبل گونج اٹھتے تھے۔

فتح مکہ میں آپ نے جن منازل میں نماز ادا کی تھی، وہاں برکت کے خیال سے لوگوں نے مسجدیں بنائی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان مساجد میں نماز ادا کرتے جاتے تھے، حرم پہنچکر غسل فرمایا، دوسرے دن (اتوار کے روز ذوالحجہ کی چار تاریخ صبح کے وقت) مکہ معظمہ میں داخل ہوئے، مدینہ سے مکہ تک کا یہ سفر نو دن میں طے ہوا، خاندان ہاشم کے لڑکوں نے آمد آمد کی خبر سنی تو خوشی سے باہر نکل آئے، آپ نے فرط محبت سے اونٹ پر کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے بٹھا لیا، کعبہ نظر پڑا تو فرمایا کہ "خدا یا! اس گھر کو اور زیادہ عزت اور شرف دے"۔ پھر کعبہ کا طواف کیا، طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم میں دوگانہ ادا کیا، اور یہ آیت پڑھی

وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى — اور مقام ابراہیم کو سجدہ گاہ بناؤ۔

صفا پر پہنچے تو یہ آیت پڑھی،

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ — صفا اور مروہ خدا کی نشانیاں ہیں

---

(۱) کم وبیش ایک لاکھ مسلمان شریک حج تھے (۲) نسائی باب استقبال الحج

Marfat.com

(یہاں سے) کعبہ نظر آیا تو یہ الفاظ فرمائے،

لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک	خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، اسکا کوئی شریک نہیں، اس کی
ولہ الحمد یحیی ویمیت وھو علی کل شئی قدیر	سلطنت اور ملک اور حمد ہے، وہ مارتا اور جلاتا ہے اور وہ تمام چیزوں
لا الٰہ الا اللہ وحدہ انجز وعدہ ونصر	پر قادر ہے، کوئی خدا نہیں مگر وہ اکیلا خدا، اس نے اپنا وعدہ
عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ ،	پورا کیا اور اپنے بندہ کی مدد کی اور اکیلے تمام قبائل کو شکست دی،

صفا سے اتر کر مروہ پر تشریف لائے، یہاں بھی دعا و تہلیل کی، اہل عرب ایام حج میں عمرہ ناجائز سمجھتے تھے، صفا و مروہ کے طواف و سعی سے فارغ ہو کر آپ نے ان لوگوں کو جن کے ساتھ قربانی کے جانور نہیں تھے، عمرہ تمام کر کے احرام اتارنے کا حکم دیا، بعض صحابہ نے گذشتہ رسوم مالوفہ کی بنا پر اس حکم کی بجا آوری میں معذرت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر میرے ساتھ قربانی کے اونٹ نہ ہوتے تو میں بھی ایسا ہی کرتا" حضرت علی حجۃ الوداع سے کچھ پہلے یمن بھیجے گئے تھے، اسی وقت وہ یمنی حاجیوں کا قافلہ لیکر مکہ میں وارد ہوئے، چونکہ ان کے ساتھ قربانی کے جانور تھے، اسلیے انھوں نے احرام نہیں اتارا، جمعرات کے روز آٹھویں تاریخ کو آپ نے تمام مسلمانوں کے ساتھ منی میں قیام فرمایا، دوسرے دن نویں ذیحجہ کو جمعہ کے روز صبح کی نماز پڑھ کر منی سے روانہ ہوئے۔

قریش کا معمول تھا کہ جب مکہ سے حج کے لیے نکلتے تھے تو عرفات کے بجائے مزدلفہ میں قیام کرتے تھے، جو حرم کے حدود میں تھا، ان کا خیال تھا کہ قریش نے اگر حرم کے سوا کسی اور مقام میں مناسک حج ادا کیے تو انکی شان یکتائی میں فرق آجائیگا، لیکن اسلام کو جو مساوات عام قائم کرنی تھی اس کے لحاظ سے یہ تخصیص روا نہیں رکھی جا سکتی، اس لیے خدا نے حکم دیا ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ

ابوداؤد

(افاضوا من حیث افاض الناس) آپ بھی عام مسلمانوں کے ساتھ عرفات میں آئے[1] اور یہ اعلان کرا دیا[2]،

قفوا علی مشاعرکم فانکم علی ارث من	اپنے مقدس مقامات میں ٹھہرے رہو کر تم اپنے
ارث ابیکم ابراھیم	باپ ابراہیم کی وراثت پر ہو،

یعنی عرفہ میں حاجیوں کا قیام حضرت ابراہیمؑ کی یادگار ہے، اور ان ہی نے اس مقام کو اس غرض خاص کے لیے متعین کیا ہے، عرفات میں ایک مقام نمرہ ہے، وہاں آپ نے ایک کمل کے خیمہ میں قیام فرمایا، دوپہر ڈھل گئی تو ناقہ پر (جس کا نام قصوا تھا) سوار ہو کر میدان میں آئے اور ناقہ کے اوپر ہی سے خطبہ پڑھا،

(آج پہلا دن تھا کہ اسلام اپنے جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوا، اور جاہلیت کے تمام بیہودہ مراسم کو مٹا دیا، اس لیے آپ نے فرمایا،

الا کل شیئ من امر الجاھلیۃ تحت	ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں
قدمی موضوع[3] (صحیح مسلم و ابوداؤد)	پاؤں کے نیچے ہیں)

---

[1] صحیح بخاری باب الوقوف بعرفہ [2] ابوداؤد موضع الوقوف بعرفہ [3] یہ اور اسکے بعد کے تمام عربی جملے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ کے ٹکڑے ہیں (یہ جملے کسی حدیث میں یکجا نہیں ہوئے ہیں، اسلیے انکو مختلف ماخذوں سے جمع کرنا پڑا ہے، صحیح بخاری و صحیح مسلم (باب حجۃ النبیؐ و باب الدیات) اور ابوداؤد (باب الاشہر الحرم و حجۃ النبیؐ) وغیرہ میں یہ خطبہ حضرت ابن عباسؓ حضرت ابن عمرؓ حضرت ابوامامہ باہلیؓ حضرت جابرؓ حضرت ابوبکرہؓ وغیرہ صحابہ کی روایتوں سے مذکور ہے، ان روایتوں میں بعض باتیں مشترک ہیں، مثلاً ان دماءکم واموالکم حرام علیکم کحرمۃ الخ، اور بعض باتیں الگ ہیں، مغازی و سیر کی کتابوں میں کچھ اور باتیں بھی مذکور ہیں، اصل یہ ہے کہ یہ ایک طویل خطبہ تھا، ہر ایک شخص کو جو فقرہ یاد رہ گیا اس نے اس کی روایت کر دی، اس بنا پر مختلف ماخذوں سے ان ٹکڑوں کو جمع کر لیا گیا ہے اور اس کے جا بجا حوالے دیے گئے ہیں، خطبہ کے بعض ضمنی الفاظ مصنف نے چھوڑ دیے ہیں، روایتوں میں ایک اور اختلاف ہے، حضرت جابرؓ اپنی روایت میں، اور ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ خطبہ کا دن یوم عرفہ یعنی ۹ ذی الحجہ اور حضرت ابوبکرہؓ اور حضرت

Marfat.com

تکمیل انسانی کی منزل میں سب سے بڑا سنگ راہ امتیاز مراتب تھا، جو دنیا کی قوموں نے، تمام مذاہب نے، تمام ممالک نے مختلف صورتوں میں قائم رکھا تھا، سلاطین سایۂ یزدانی تھے جنکے آگے کسی کو چون وچرا کی مجال نہ تھی، ائمۂ مذہب کے ساتھ کوئی شخص مسائل مذہبی میں گفتگو کا مجاز نہ تھا، شرفاء رذیلوں سے ایک بالاتر مخلوق تھی، غلام آقا کے ہمسر نہیں ہو سکتے تھے، آج یہ تمام تفرقے، یہ تمام امتیازات، یہ تمام حد بندیاں دفعۃً ٹوٹ گئیں،

ایھا الناس! الا ان ربکم واحد	لوگو! بیشک تمہارا رب ایک ہی اور بیشک تمہارا
ان اباکم واحد الا لا فضل لعربی	باپ ایک ہی ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ
علی عجمی، ولا لعجمی علی عربی، ولا لاحمر	کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں
علی اسود ولا اسود علی احمر الا بالتقوی (مسند احمد)	مگر تقویٰ کے سبب سے)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۴) ابن عباسؓ اور دوسری روایتوں میں یوم النحر یعنی ۱۰ ذی الحجہ بتاتے ہیں بعض ذرا نیں ایام التشریق کے خطبہ کی ہیں" ابن اسحاق نے اس کو مسلسل خطبہ کے طور پر نقل کیا ہے، ابن ماجہ، ترمذی اور مسند احمد میں خطبۂ حجۃ الوداع کے چند فقرے منقول ہیں جنہیں یہ تصریح نہیں کہ کس تاریخ کے خطبہ میں آپ نے یہ فرمایا، بہرحال صحاح ستہ اور مسانید کی تمام روایات کو یکجا کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے اس حج میں تین دفعہ خطبہ دیا، ۹ ذی الحجہ یوم عرفہ کو، ۱۰ ذی الحجہ یوم النحر کو اور تیسرا خطبہ ایام التشریق میں ۱۱ یا ۱۲ ذی الحجہ کو، ان خطبوں میں اصولی طور پر بعض باتیں مشترک ہیں، اور بعض مختلف المقام ہیں، یہ بہت ممکن ہے، جیسا کہ بعض محدثین نے تصریح کی ہے کہ چونکہ مجمع بہت بڑا تھا اور آپ جو پیغام اپنی امت کو پہنچانا چاہتے تھے وہ نہایت اہم تھا، اسلئے آپ نے اپنی تقریر کے بعض بعض فقرے مکرر اعادہ فرمائے)" س"

(۱۵ے) امام احمد نے مسند میں ابو نضرہ تابعی کے واسطہ سے اور تابعی مذکور نے ایک صحابی سے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع کا خطبہ دیتے سنا تھا، یہ فقرہ نقل کیا ہے۔ (دیکھو المنتقیٰ الاخبار ابن تیمیہ مع نیل الاوطار)

Marfat.com

من کل مسلم اخو المسلم وان المسلمین اخوۃ (مستدرک حاکم جلد ا ص ۹۳ و طبری و ابن اسحاق) | ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور مسلمان مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں،

ارقاءکم ارقاءکم اطعموھم مما تاکلون واکسوھم مما تلبسون (ابن سعد) | تمہارے غلام! تمہارے غلام!! جو خود کھاؤ، وہی ان کو کھلاؤ، جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ،

عرب میں کسی خاندان کا کوئی شخص کسی کے ہاتھ سے قتل ہوتا تو اس کا انتقام لینا خاندانی فرض ہو جاتا تھا، یہانتک کہ سیکڑوں برس گزر جانے پر بھی یہ فرض باقی رہتا تھا، اور اسی بنا پر لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا، اور عرب کی زمین ہمیشہ خون سے رنگین رہتی تھی، آج یہ سب سے قدیم رسم، عرب کا سب سے مقدم فخر، خاندان کا پرفخر مشغلہ برباد کر دیا جاتا ہے (اور اس کے لیے نبوت کا منادی سب سے پہلے اپنا نمونہ آپ پیش کرتا ہے۔)

ودماء الجاھلیۃ موضوعۃ وان اول دم اضع من دمائنا دم ابن ربیعۃ ابن الحارث (صحیح مسلم وابوداؤد، بروایت جابرؓ) | جاہلیت کے تمام خون (یعنی انتقام خون) باطل کر دیے گئے اور سب سے پہلے میں (اپنے خاندان کا خون) ربیعہ بن الحارث کے بیٹے[1] کا خون باطل کر دیتا ہوں،

[1] ربیعہ قریش کے خاندان سے تھے، اور ان کے خون کا انتقام لینا میراث کے طور پر ایک فرض خاندانی چلا آتا تھا، ربیعہ بن حارث بن عبد المطلب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے، اور بعض روایتوں میں خود ان کے قتل کا ذکر ہے لیکن یہ صحیح نہیں، ربیعہ خلافت فاروقی تک زندہ تھے، اور ۲۳ھ میں وفات پائی صحیح یہ ہے کہ ربیعہ کا ایاس نام ایک بیٹا تھا، وہ قبیلہ بنو سعد میں پرورش پا رہا تھا، کہ ہذیل نے اسکو قتل کر ڈالا۔ دیکھو ابوداؤد و صحیح مسلم باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور زرقانی جلد ۸ صفحہ ۲۰۱)

Marfat.com

(تمام عرب میں سودی کاروبار کا ایک جال پھیلا ہوا تھا جس سے غربا کا ریشہ ریشہ جکڑا ہوا تھا، اور ہمیشہ کے لیے وہ اپنے قرض خواہوں کے غلام بن گئے تھے، آج وہ دن ہے کہ اس جال کا تار تار الگ ہوتا ہے، اس فرض کی تکمیل کیلیے بھی معلّم حق سب سے پہلے اپنے خاندان کو پیش کرتا ہے،

وربا الجاهلیة موضوع واول ربا اضع ربانا ربا عباس بن عبدالمطلب (صحیح مسلم و ابوداؤد)

جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کردیے گئے اور سب سے پہلے اپنے خاندان کا سود عباس بن عبدالمطلب[1] کا سود باطل کرتا ہوں

آج تک عورتیں ایک جائداد منقولہ تھیں، جو قماربازیوں میں داؤں پر چڑھادی جاسکتی تھیں، آج پہلا دن ہے کہ یہ گروہ مظلوم، یہ صنفِ لطیف، یہ جوہر نازک قدردانی کا تاج پہنتا ہے،

فاتقوا اللہ فی النساء[2] (صحیح مسلم وابوداؤد) (عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو)

ان لکم علی نسائکم حقا و لھن علیکم حقًا (طبری ابن ہشام وغیرہ)

تمھارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔

عرب میں جان و مال کی کچھ قیمت نہ تھی، جو شخص چاہتا تھا قتل کردیتا تھا، اور جس کا مال چاہتا تھا چھین لیتا تھا، (آج امن و سلامتی کا بادشاہ تمام دنیا کو صلح کا پیغام سناتا ہے)

ان دمائکم واموالکم علیکم حرام کحرمة یومکم هذا فی شهرکم هذا فی بلدکم هذا الی یوم تلقون ربکم[3] (صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد وغیرہ)

تمھارا خون اور تمھارا مال تاقیامت اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں حرام ہے،

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباسؓ اسلام سے پہلے سود کا کاروبار کرتے تھے، بہت سے لوگوں کے ذمہ انکا سود باقی تھا، (دیکھو تفسیر آیت ربوٰ) [2] اس کے بعد آپ نے زن وشو کے فرائض کی تفصیل فرمائی [3] صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد وغیرہ۔

Marfat.com

(اسلام سے پہلے بڑے بڑے مذاہب دنیا میں پیدا ہوئے لیکن انکی بنیاد خود صاحب شریعت کے تحریری اصول پر نہ تھی، ان کو خدا کی طرف سے جو ہدایتیں ملی تھیں، بندوں کی ہوس پرستیوں نے ان کی حقیقت گم کردی تھی، ابدی مذہب کا پیغمبر اپنی زندگی کے بعد ہدایاتِ ربانی کا مجموعہ خود اپنے ہاتھ سے اپنی امت کو سپرد کرتا ہے اور تاکید کرتا ہے)

وانی قد ترکت فیکم ما لن تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ کتاب اللہ (صحاح)	میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں، اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہوگے، وہ چیز کیا ہے، کتاب اللہ!

اس کے بعد آپ نے چند اصولی احکام کا اعلان فرمایا[1]

ان اللہ عزوجل قد اعطی کل ذی حق حقہ	خدا نے ہر حق دار کو (از روئے وراثت) اسکا حق دیدیا ہے
فلا وصیۃ لوارث	کسی کو وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں،
الولد للفراش وللعاھر الحجر و	لڑکا اسکا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا زناکار کیلیے پتھر ہے
حسابھم علی اللہ	اور ان کا حساب خدا کے ذمہ ہے؛
من ادعی الی غیر ابیہ وانتمی الی غیر	جو لڑکا اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کے نسب سے ہونے کا دعوی کرے
موالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ	اور جو غلام اپنے مولی کے سوا کسی اور طرف اپنی نسبت کرے اسپر خدا کی لعنت ہے
الا لا یحل لامرءۃ ان تعطی من مال	ہاں عورت کو اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے
زوجھا شیئا الا باذنہ الدین مقضیّ	بغیر کچھ دینا جائز نہیں، قرض ادا کیا جائے، عاریت واپس

[1] سنن ابن ماجہ باب الوصایا و مسند ابوداؤد طیالسی بروایت ابی امامۃ الباہلی، ابوداؤد کتاب الوصایا میں مختصراً ہے۔ ابن سعد اور ابن اسحاق نے بھی اس کی بسند روایت کی ہے کہ یہ عرفہ کے خطبہ میں آپ نے فرمایا)

Marfat.com

والعارية مؤداة والمنحة مردودة — کی جائے، عطیہ لوٹایا جائے، ضامن تاوان کا

والزعيم غارم — ذمہ دار ہے

یہ فرما کر آپ نے مجمع عام کی طرف خطاب کیا،

انتم مسئولون عنی فما انتم قائلون (صحیح مسلم و ابوداؤد) — تم سے خدا کے ہاں میری نسبت پوچھا جائیگا تم کیا جواب دو گے

صحابہؓ نے عرض کی "ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا، اور اپنا فرض ادا کر دیا"

آپ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا،

اللّٰھم اشھد (صحیح مسلم و ابوداؤد) — اے خدا تو گواہ رہنا۔

عین اس وقت جب آپ یہ فرض نبوت ادا کر رہے تھے، یہ آیت اتری،[1]

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ — آج میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت

نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا — تمام کر دی، اور تمہارے لیے مذہب اسلام کو انتخاب کر لیا

نہایت حیرت انگیز اور عبرت خیز منظر یہ تھا کہ شاہنشاہ عالم جس وقت لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں فرمان ربانی کا اعلان کر رہا تھا، اس کے تخت شاہنشاہی کا مسند و بالین (کجاوہ اور عرق گیر) ایک روپیہ سے زیادہ قیمت کا نہ تھا۔[2]

(خطبہ سے فارغ ہو کر آپ نے حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا، اور ظہر اور عصر کی نماز ایک ساتھ ادا کی، پھر ناقہ پر سوار ہو کر موقف تشریف لائے اور وہاں کھڑے ہو کر دیر تک قبلہ رو

(۱؎ صحیح بخاری و صحیح مسلم و ابوداؤد وغیرہ۔ ابن سعد میں تصریح خاص ہے۔ ۲؎ طبقات ابن سعد صفحہ ۱۲۷ و کتاب الشمائل للترمذی و ابن ماجہ)

دعا میں مصروف رہے، جب آفتاب ڈوبنے لگا تو آپ نے وہاں سے چلنے کی تیاری کی حضرت اسامہؓ ابن زیدؓ کو اونٹ پر پیچھے بٹھا لیا، آپ ناقہ کی زمام کھینچے ہوئے تھے یہاں تک کہ اسکی گردن کجاوے سے آ کر لگتی تھی، لوگوں کے ہجوم سے ایک اضطراب سا پیدا ہو گیا تھا، لوگوں کو دست راست سے اور بخاری میں ہے کہ کوڑہ سے آپ اشارہ کرتے جاتے تھے کہ آہستہ! آہستہ! اور زبان مبارک سے ارشاد فرما رہے تھے

السکینة یا ایها الناس السکینة یا ایها الناس لوگو، سکون کے ساتھ، لوگو، سکون کے ساتھ

اثنائے راہ میں ایک جگہ اتر کر طہارت کی، اسامہ نے کہا یا رسول اللہ! نماز کا وقت تنگ ہو گیا ہو رہا ہے، فرمایا نماز کا موقع آگے آتا ہے، تھوڑی دیر کے بعد آپ تمام قافلہ کے ساتھ مزدلفہ پہنچے، یہاں پہلے مغرب کی نماز پڑھی، اسکے بعد لوگوں نے اپنے اپنے پڑاؤ پر جا کر سواریوں کو بٹھایا ابھی سامان کھولنے بھی نہ پائے تھے کہ فوراً ہی نماز عشاء کی تکبیر ہوئی، نماز سے فارغ ہو کر آپ لیٹ گئے اور صبح تک آرام فرمایا، بیچ میں روزانہ دستور کے خلاف عبادت شبانہ کے لیے بیدار نہ ہوئے، محدثین نے لکھا ہے کہ یہی ایک شب ہے جس میں آپ نے نماز تہجد ادا نہیں فرمائی، صبح سویرے اٹھکر باجماعت فجر کی نماز پڑھی، کفار قریش مزدلفہ سے اس وقت کوچ کرتے تھے جب آفتاب پورا نکل آتا تھا، اور آس پاس کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر دھوپ چمکنے لگتی تھی، اس وقت باواز بلند کہتے تھے "کوہ ثبیر! دھوپ سے چمک جا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کے ابطال کیلیے سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے کوچ کیا، یہ ذیحجہ کی دسویں تاریخ اور سنیچر کا دن تھا۔

---

(۱) بخاری و مسلم و ابوداؤد) (۲) صحیح بخاری و ابوداؤد۔

Marfat.com

فضل بن عباسؓ آپ کے برادر عم زاد ناقہ پر ساتھ تھے، اہل حاجت داہنے بائیں حج کے مسائل دریافت کرنے کے لیے آرہے تھے، آپ جواب دیتے تھے، اور نزدو دور سے مناسک حج کی تعلیم دیتے جاتے تھے[1]، وادی محسر کے راستہ سے آپ جمرۃ کے پاس آئے، ابن عباسؓ جو اس وقت کمسن تھے، فرمایا، مجھے کنکریاں چنکر دو، آپ نے کنکریاں پھینکیں اور لوگوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا:

ایاکم والغلو فی الدین فانما اھلک من قبلکم الغلو فی الدین (ابن ماجہ ونسائی)	مذہب میں غلو اور مبالغہ سے بچو، کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی سے برباد ہوئیں،

اسی اثنا میں آپ یہ بھی فرماتے:

لتاخذوا مناسککم فانی لا ادری لعلی لا حج بعد حجتی ھذہ (مسلم و ابوداؤد)	حج کے مسائل سیکھ لو، میں نہیں جانتا، شاید کہ اس کے بعد مجھے دوسرے حج کی نوبت نہ آئے،

یہاں سے فارغ ہو کر منیٰ کے میدان میں تشریف لائے، داہنے بائیں آگے پیچھے تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کا مجمع تھا، مہاجرین قبلہ کے داہنے، انصار بائیں اور بیچ میں عام مسلمانوں کی صفیں تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ناقہ پر سوار تھے، حضرت بلالؓ کے ہاتھ میں ناقہ کی مہار تھی حضرت اسامہ بن زیدؓ پیچھے پیچھے کپڑا تان کر سایہ کیے ہوئے تھے، آپ نے نظر اٹھا کر اس عظیم الشان مجمع کی طرف دیکھا تو فرائض نبوت کے ۲۳ سالہ نتائج نگاہوں کے سامنے تھے، زمین سے آسمان تک قبول و اعتراف حق کا نور ضو فشاں تھا، دیوان قضا میں انبیائے سابقین کے فرائض تبلیغ کے کارناموں پر ختم رسالت کی مہر ثبت ہو رہی تھی، اور دنیا اپنی تخلیق کے لاکھوں برس کے بعد دین فطرت کی تکمیل کا مژدہ کائنات کے ذرہ ذرہ کی زبان سے سن رہی تھی، عین اسی

[1] ابوداؤد [2] نسائی

عالم میں زبان حق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام و دہن میں زمزمہ پرداز ہوئی

اب ایک نئی شریعت، ایک نئے نظام اور ایک نئے عالم کا آغاز تھا۔ اس بنا پر ارشاد فرمایا،

ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق	ابتدا میں جب خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا
اللہ السموات والارض (بروایت ابو بکرہ)	زمانہ پھر پھرا کے آج پھر اسی نقطہ پر آ گیا،

ابراہیم خلیل کے طریق عبادت (حج) کا موسم اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا اس کا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں کسی قسم کی خونریزی جائز نہیں تھی، اس لیے عربوں کے خون آشام جذبات حیلۂ جنگ کے لیے اس کو کبھی گھٹا کبھی بڑھا دیتے تھے، آج وہ دن آیا کہ اس اجتماع عظیم کے اتمام کی تعیین کر دی جائے، آپ نے فرمایا

السنۃ اثنا عشر شہرا منہا اربعۃ حرم	سال کے بارہ مہینے ہیں جن میں چار مہینے قابل احترام
ثلاثۃ متوالیات ذوالقعدۃ وذوالحجۃ	ہیں تین تو متواتر مہینے ہیں، ذوقعدہ، ذوالحجہ اور محرم
والمحرم ورجب شہر مضر الذی بین	اور چوتھا رجب مضر کا مہینہ جو جمادی الثانی اور
جمادی وشعبان (بروایت ابو بکرہ)	شعبان کے بیچ میں ہے،

(لہ حج کے ان مہینوں کے احترام اور بزرگی کا تخیل عرب میں نہایت قدیم زمانہ سے چلا آتا تھا اور عرب کے تمام فرقے خواہ یہودی یا عیسائی یا کسی اور مذہب کے پیرو ہوں سب برابر ان کی عزت کرتے تھے، ان مہینوں میں جنگ و جدال اور لڑائی بھڑائی حرام جانتے تھے، قدیم اشعار عرب میں اس کا بیان نہایت کثرت سے ہے، رومیوں کی تاریخ میں بھی عربوں کے اس عقیدہ کا ذکر ہے، ۵۴۱ء میں رومیوں کو شام اور فلسطین میں کوئی جنگی کارروائی کرنی تھی، اور ساتھ ہی عربوں کے حملہ کا خوف لگا تھا، سپہ سالار روم جو عربوں کے اندرونی حالات سے واقف تھا اس نے جواب دیا کہ اس زمانہ میں عربوں سے کوئی خوف نہیں، کیونکہ عنقریب وہ دو مہینے آ رہے ہیں جن میں اہل عرب عبادتوں میں مشغول رہتے ہیں، اور کسی قسم کا ہتھیار نہیں لگاتے، نتائج الافہام محمود پاشا فلکی صفحہ ۲۵ بحوالہ فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی جرنل اپریل ۱۸۵۳ء) س،

Marfat.com

(دنیا میں عدل و انصاف اور جور و ستم کا محور صرف تین چیزیں ہیں، جان، مال اور آبرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل کے خطبہ میں گو ان کے متعلق ارشاد فرما چکے تھے لیکن عرب کے صدیوں کے زنگ دور کرنے کے لیے مکرر تاکید کی ضرورت تھی، آج آپؐ اس کے لیے عجیب بلیغ انداز اختیار فرمایا، لوگوں سے مخاطب ہو کر پوچھا "کچھ معلوم ہے، آج کون سا دن ہے، لوگوں نے عرض کی کہ خدا اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے، آپ دیر تک چپ رہے، لوگ سمجھے کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھیں گے، دیر تک سکوت کے بعد فرمایا "کیا آج قربانی کا دن نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں بیشک ہے، پھر ارشاد ہوا "یہ کون سا مہینہ ہے؟" لوگوں نے پھر اسی طریقہ سے جواب دیا آپ نے پھر دیر تک سکوت کیا، اور فرمایا "کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا "ہاں بیشک ہے" پھر پوچھا "یہ کون سا شہر ہے؟" لوگوں نے بدستور جواب دیا، آپ نے اسی طرح دیر تک سکوت کے بعد فرمایا "کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے؟" لوگوں نے کہا "ہاں بیشک ہے" جب سامعین کے دل میں یہ خیال پوری طرح جاگزیں ہو چکا کہ آج کا دن بھی، مہینہ بھی اور خود شہر بھی محترم ہے یعنی اس دن، اس مقام میں جنگ اور خونریزی جائز نہیں، تب فرمایا،

فان دماءکم واموالکم واعراضکم علیکم	تو تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری آبرو (تا قیامت)
حرام کحرمۃ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا	اسی طرح محترم ہے جس طرح یہ دن، اس مہینہ میں اور
فی بلدکم ھذا (بروایت ابوبکرہ)	اس شہر میں محترم ہے۔

(قوموں کی بربادی ہمیشہ آپس کے جنگ و جدال اور باہمی خونریزیوں کا نتیجہ رہی ہے، وہ پیغمبر جو ایک لازوال قومیت کا بانی بنکر آیا تھا، اس نے اپنے پیروں سے آ[واز] بلند کہا

الا لا ترجعوا بعدی ضلالا یضرب بعضکم رقاب بعض وستلقون ربکم فیسئلکم عن اعمالکم (بروایت ابوبکرہ)

ہاں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ خود ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو، تم کو خدا کے سامنے حاضر ہونا پڑیگا اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا۔

ظلم وستم کا ایک عالمگیر پہلو یہ تھا کہ اگر خاندان میں کسی ایک شخص سے کوئی گناہ سرزد ہوتا تو اس خاندان کا ہر شخص اس جرم کا قانونی مجرم سمجھا جاتا تھا، اور اکثر اصلی مجرم کے روپوش یا فرار ہو جانے کی صورت میں بادشاہ اس خاندان میں سے جس پر قابو چلتا تھا، اس کو سزا دیتا تھا، باپ کے جرم میں بیٹے کو سولی دیجاتی تھی، اور بیٹے کے جرم کا خمیازہ باپ کو اٹھانا پڑتا تھا، یہ سخت ظالمانہ قانون تھا، جو مدت سے دنیا میں حکمراں تھا، اگرچہ قرآن مجید نے لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِزْرَ اُخْریٰ کے وسیع قانون کے رو سے اس ظلم کی ہمیشہ کے لیے بیخ کنی کر دی تھی لیکن اس وقت جب دنیا کا آخری پیغمبر ایک نیا نظام سیاست ترتیب دے رہا تھا، اس اصول کو فراموش نہیں کر سکتا تھا، آپ نے فرمایا

الا لا یجنی جان الا علی نفسہ الا لا یجنی جان علی ولدہ ولا مولود علی والدہ (ابن ماجہ وترمذی)

ہاں، مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے، ہاں، باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں، اور بیٹے کے جرم کا جواب دہ باپ نہیں،

عرب کی بدامنی اور نظام ملک کی بے ترتیبی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ہر شخص اپنی خداوندی کا آپ مدعی تھا، اور دوسرے کی ماتحتی اور فرمانبرداری کو اپنے لیے ننگ و عار جانتا تھا، ارشاد ہوا،

ان امر علیکم عبد مجدع اسود یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا لہ واطیعوا (صحیح مسلم)

اگر کوئی حبشی نک بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تم کو خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو

Marfat.com

ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ اسوقت اسلام کے نور سے منور ہوچکا تھا، اور خانۂ کعبہ ہمیشہ کیلیے ملت ابراہیم کا مرکز بن چکا تھا، اور فتنہ پردازانہ قوتیں پامال ہوچکی تھیں، اس بنا پر آپنے ارشاد فرمایا

الا ان الشیطان قد ایس ان یعبد فی	ہاں، شیطان اس بات سے مایوس ہوچکا کہ اب تمھارے
بلدکم ھذا ابداً ولکن ستکون لہ طاعۃ	اس شہر میں اس کی پرستش قیامت تک نہ کیجائے گی،
فیما تحترون من اعمالکم فیرضی بہ	لیکن البتہ البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اسکی پیروی
(ابن ماجہ و ترمذی)	کروگے اور وہ اس پر خوش ہوگا،

سب سے آخر میں آپنے اسلام کے فرض اولین یاد دلائے،

اعبدوا ربکم وصلوا خمسکم وصوموا	اپنے پروردگار کو پوجو، پانچوں وقت کی نماز پڑھو، مہینہ
شہرکم واطیعوا اذا امرکم تدخلوا جنۃ ربکم	کا روزہ رکھا کرو، اور میرے احکام کی اطاعت کرو،
(مسند احمد جلد ۵ ص ۲۵۱ و مستدرک حاکم جلد ۱ ص ۹ و ۳۹۸ و ۴۷۳)	خدا کی جنت میں داخل ہوجاؤگے)

یہ فرماکر آپنے مجمع کی طرف اشارہ کیا، اور فرمایا،

الا ھل بلغت	کیوں، میں نے پیام خداوندی سنا دیا،

سب بول اٹھے۔ ہاں؛ فرمایا۔

اللھم اشھد	اے خدا تو گواہ رہنا،

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا

فلیبلغ الشاھد الغائب	جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ ان کو سنا دیں
	جو موجود نہیں

Marfat.com

خطبہ[1] کے اختتام پر آپ نے تمام مسلمانوں کو الوداع[2] کہا

اس کے بعد آپ قربان گاہ کی طرف تشریف لے گئے، اور فرمایا کہ قربانی کے لیے منی کی کچھ تخصیص نہیں ہے، بلکہ منی اور مکہ کی ایک ایک گلی میں قربانی ہو سکتی ہے۔" آپ کے ساتھ قربانی کے سو اونٹ تھے، کچھ تو آپ نے خود اپنے ہاتھ سے ذبح کیے اور باقی حضرت علیؓ کے سپرد کر دیے کہ وہ ذبح کریں، اور حکم دیا کہ گوشت پوست جو کچھ ہو سب خیرات کر دیا جائے، یہانتک کہ قصاب کی مزدوری بھی اس سے ادا نہ کی جائے، الگ سے دی جائے۔

قربانی سے فارغ ہو کر آپ نے معمر بن عبد اللہ کو بلوایا اور سر کے بال منڈوائے، اور فرط محبت سے کچھ بال خود اپنے دست مبارک سے ابو طلحہؓ انصاری اور ان کی بیوی ام سلیم اور بعض ان لوگوں کو جو پاس بیٹھے[3] تھے عنایت فرمائے اور باقی ابو طلحہؓ نے اپنے ہاتھ سے تمام مسلمانوں میں ایک ایک دو دو کر کے تقسیم کر دیے۔ اس کے بعد آپ مکہ معظمہ تشریف لائے، خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ اس سے فارغ ہو کر چاہ زمزم کے پاس آئے۔

چاہ زمزم سے حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت خاندان عبد المطلب سے متعلق تھی، اس وقت اسی خاندان کے لوگ پانی نکال نکال کر لوگوں کو پلا رہے تھے، آپ نے فرمایا "یا بنی عبد المطلب! اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ مجھکو ایسا کرتے دیکھ کر اور لوگ بھی تمہارے ہاتھ سے ڈول چھین کر خود اپنے ہاتھ سے پانی نکال کر پیں گے، تو میں خود اپنے ہاتھ سے پانی نکال کر پیتا۔"

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطبہ بہت بڑا تھا، صحیح مسلم (حج) میں روایت ہے کہ قال قولا کثیرا، آپ نے بہت سی باتیں فرمائیں صحیح بخاری (حجۃ الوداع) میں ہے کہ آپ نے اس میں دجال کا بھی ذکر فرمایا تھا لیکن تعیین نہیں کہ کس دن کے خطبہ میں یہ فرمایا۔ [2] صحیح بخاری باب الخطبۃ ایام منی [3] صحیح مسلم وابوداؤد۔

حضرت عباسؓ نے ڈول میں پانی نکال کر پیش کیا آپ نے نبیذ اور زمزم کھڑے کھڑے پانی پیا

پھر یہاں سے منیٰ واپس تشریف لے گئے اور وہیں نماز ظہر ادا فرمائی،[1]

بقیہ ایام التشریق یعنی ۱۲ ذی الحجہ تک آپ نے مستقل اقامت منیٰ ہی میں فرمائی، ہر روز زوال کے بعد رمی جمار کی غرض سے تشریف لیجاتے، اور پھر واپس آجاتے، ابوداؤد (باب الخطبہ بمنیٰ) میں ایک حدیث ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ۱۲ ذی الحجہ کو بھی منیٰ میں ایک خطبہ دیا تھا جس کے الفاظ مختصراً وہی ہیں جو پہلے خطبوں میں گزر چکے، ۱۳ ذی الحجہ کو سہ شنبہ کے دن زوال کے بعد آپ نے یہاں سے نکل کر وادی محصب[2] میں قیام کیا، اور شب کو اسی مقام پر آرام فرمایا، پچھلے پہر اٹھ کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے، اور خانہ کعبہ کا آخری طواف کر کے وہیں صبح کی نماز ادا کی، اس کے بعد قافلہ اسی وقت اپنے اپنے مقام کو روانہ ہوگیا، اور آپ نے مہاجرین وانصار کے ساتھ مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی، راہ میں ایک مقام خُم پڑا، جو جحفہ سے تین میل پر ہے، یہاں ایک تالاب ہے، عربی میں تالاب کو غدیر کہتے ہیں، اور اس لیے اس مقام کا نام عام [illegible]

---

(۱) حضرت ابن عمرؓ کی حدیث بخاری و مسلم دونوں میں ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز حسب دستور اس دن بھی منیٰ میں پڑھی لیکن حضرت جابرؓ کی جو طویل حدیث قصہ حجۃ الوداع میں ہے اس میں تعیین ہے کہ آپ نے مکہ میں نماز ظہر پڑھی حضرت عائشہؓ کی ایک روایت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے اس بنا پر محدثین میں ان دونوں قولوں کی باہمی ترجیح اور وجہ ترجیح میں اختلاف ہے، علامہ ابن حزم نے دوسری روایت کو ترجیح دی ہے، اور علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں پہلے قول کو مرجح ثابت کیا ہے، فریقین کے موازنۂ دلائل کے بعد ہم نے ابن قیم کا فیصلہ قبول کیا ہے) س

(۲) اسی کا دوسرا نام ابطح اور خیف بنی کنانہ ہے)

Marfat.com

میں خدیر خم آتا ہے، آپ نے یہاں تمام صحابہ کو جمع کر کے ایک مختصر سا خطبہ دیا،

اما بعد الا ایها الناس فانما انا بشر یوشك
ان یاتی رسول ربی فاجیب وانا تارك
فیکم الثقلین اولهما کتاب الله فیه
الهدی والنور فخذوا کتاب الله و
استمسکو به واهل بیتی اذکرکم الله
فی اهل بیتی

حمد و ثنا کے بعد، اے لوگو! میں بھی بشر ہوں ممکن ہے کہ
خدا کا فرشتہ جلد آجائے اور مجھے قبول کرنا پڑے (یعنی موت)
میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں، ایک
خدا کی کتاب جس کے اندر ہدایت اور روشنی ہے خدا کی
کتاب کو مضبوطی سے پکڑو، اور دوسری چیز میرے
اہل بیت ہیں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں خدا

آخری جملہ کو آپ نے تین دفعہ مکرر فرمایا، یہ صحیح مسلم (مناقب حضرت علیؓ) کی روایت ہے، نسائی، مسند امام احمد، ترمذی، طبرانی، طبری، حاکم وغیرہ میں کچھ اور فقرے بھی ہیں جن میں حضرت علیؓ کی منقبت ظاہر کی گئی ہے، ان روایتوں میں ایک فقرہ اکثر مشترک ہے،

من کنت مولاه فعلی مولاه، اللهم
وال من والاه وعاد من عاداه

جسکو میں محبوب ہوں علی بھی اسکو محبوب ہونا چاہئے، الٰہی جو علی سے محبت
رکھے اس سے تو بھی محبت کر اور علی سے عداوت رکھے اس سے تو بھی عداوت

احادیث میں خاص یہ تصریح نہیں کہ ان الفاظ کے کہنے کی ضرورت کیا پیش آئی بخاری میں ہے کہ اسی زمانہ میں حضرت علیؓ یمن بھیجے گئے، جہاں سے واپس آکر وہ حج میں شامل ہوئے تھے یمن میں انھوں نے اپنے اختیار سے ایک ایسا واقعہ کیا تھا جس کو ان کے بعض ہمراہیوں نے پسند نہیں کیا، ان میں سے ایک صاحب نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی آپ نے فرمایا "علی کو اس سے زیادہ کا حق تھا" عجب نہیں کہ اسی قسم کے شکوک

صحیح بخاری بعث علی الی الیمن والترمذی مناقب حضرت علیؓ

دفع کرنے کے لیے اس موقع پر آپ نے یہ الفاظ فرمائے،

مدینہ کے قریب پہنچکر ذوالحلیفہ میں شب بسر کی، صبح کے وقت ایک طرف سے آفتاب نکلا اور دوسری طرف کوکبۂ نبوی مدینہ منورہ میں داخل ہوا، سواد مدینہ پر نظر پڑی تو یہ الفاظ فرمائے[1]،

اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ وحدہ	خدا بزرگ و برتر ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں،
لا شریک لہ لہ الملک ولہ	کوئی اس کا شریک نہیں بس اسی کی سلطنت ہے
الحمد وھو علیٰ کل شیٔ قدیر	اسی کے لیے مدح اور ستائش ہے، وہ ہر بات پر قادر ہے
آئبون تائبون عابدون ساجدون	لوٹے رہے ہیں توبہ کرتے ہوئے فرمانبرداری کرتے
لربنا حامدون صدق اللہ وعدہ	پر پیشانی رکھ کر، اپنے پروردگار کی مدح وستائش
ونصر عبدہ وھزم الاحزاب	میں مصروف ہو کر، خدا نے اپنا وعدہ سچا کیا، اپنے
وحدہٗ[2]	بندہ کی نصرت کی، اور تمام قبائل کو تنہا شکست دی

[1] صحیح بخاری بعث علی الی الیمن و ترمذی مناقب حضرت علیؓ [2] حجۃ الوداع کے تمام واقعات صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد و نسائی سے لیے گئے ہیں، ہر واقعہ کے لیے ان کتابوں میں کتاب الحج کے مختلف ابواب دیکھو،

Marfat.com

وفات

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ (زمر)

ربیع الاول سنہ ۱۱ھ مطابق مئی سنہ ۶۳۲ء

روح قدسی کو عالم جسمانی میں اسی وقت تک رہنے کی ضرورت تھی کہ تکمیل شریعت اور تزکیۂ نفوس کا عظیم الشان کام درجۂ کمال تک پہنچ جائے، حجۃ الوداع میں یہ فرض اہم ادا ہو چکا، توحید کامل اور مکارم اخلاق کے اصول عملاً قائم کر کے عرفات کے مجمع عام میں اعلان کر دیا گیا کہ

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي — آج کے دن میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں پوری کر دیں

سورۂ فتح کا نزول خاص خاص صحابہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب وفات کی اطلاع دے چکا تھا[1][2] اور آپ حکم ربانی فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (فتح) کے مطابق زیادہ تر اوقات تسبیح و تہلیل میں بسر فرماتے تھے۔ آپ عموماً ہر سال رمضان مبارک میں دس دن اعتکاف میں بیٹھتے تھے لیکن رمضان سنہ ۱۰ھ میں بیس دن اعتکاف میں بیٹھے۔ سال میں ایک دفعہ ماہ رمضان[3] میں آپ پورا قرآن ناموس اکبر کی زبانی سنتے تھے لیکن وفات کے سال دو دفعہ یہ شرف حاصل ہوا

(۱) صحیح بخاری تفسیر اذا جاء (۲) اس قسم کی روایتیں گو طبری، ابن خزیمہ اور ابن مردویہ میں ہیں لیکن مختصراً صحیح بخاری تفسیر اذا جاء میں بھی مذکور ہیں (۳) صحیح بخاری باب الاعتکاف و باب تالیف القرآن

حجۃ الوداع کے موقع پر مناسکِ حج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے یہ اعلان بھی فرمایا کہ "مجھے امید نہیں کہ آیندہ سال تم سے مل سکوں" بعض روایتوں میں یہ الفاظ اس طرح وارد ہوئے ہیں، شاید میں اسکے بعد حج نہ کر سکوں۔[1] غدیر خم کے خطبوں میں بھی اسی قسم کے الفاظ ادا ہوئے،

غزوۂ احد کے بیان میں گذر چکا ہے کہ شہدائے احد کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی گئی تھی، تمام غزوات میں صرف غزوۂ احد ایک ایسا غزوہ ہے جس میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ بیکسی کے ساتھ جان دی، اس لیے ان کی یاد آپ کے دل میں اس وقت بھی موجود تھی،

حجۃ الوداع کے موقع پر تمام مسلمانوں کو اپنے فیض دیدار سے مشرف فرمایا، اور انکو حسرت کے ساتھ وداع کیا، شہدائے احد جو بَلْ هُمْ أَحْيَاءٌ کے فردوسِ جانفزا سے فیضیاب تھے، آٹھ برس کے بعد آخری دفعہ آپ نے انکو بھی اپنی زیارت سے مشرف کرنا ضروری سمجھا، چنانچہ اسی زمانہ میں انکی قبر پر تشریف لے گئے، اور ان کیلیے دعائے خیر فرمائی، اور اس رقت انگیز طریقہ سے ان کو وداع کیا کہ "جس طرح ایک مرنے والا اپنے زندہ احبابؓ کو وداع کرتا ہے"۔[2] اسکے بعد ایک خطبہ دیا جسمیں فرمایا "میں تم سے پہلے حوض پر جا رہا ہوں، اسکی وسعت اتنی ہے جتنی ایلہ سے جحفہ تک، مجھکو تمام دنیا کے خزانوں کی کنجی دی گئی ہے، مجھے خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کروگے لیکن اس سے ڈرتا ہوں کہ دنیا میں مبتلا ہو جاؤ، اور اس کیلیے آپس میں کشت و خون نہ کرو، تو پھر اسی طرح ہلاک ہو جاؤ جسطرح تم سے پہلی قومیں ہلاک ہوئیں"۔ راوی کا بیان ہے کہ یہ آخری دفعہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ دیتے ہوئے سنا،[3]

غزوات میں گذر چکا ہے کہ حضرت زید بن حارثہؓ کو عمدۃً شام کے عربوں نے شہید کر ڈالا تھا،

---

(۱) مسلم وابوداؤد و نسائی کتاب الحج (۲) صحیح بخاری کتاب الجنائز (۳) صحیح مسلم باب اثبات الحوض

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس کا قصاص لینا چاہتے تھے، آغاز علالت سے ایک روز پہلے آپ نے
اسامہ بن زید کو مامور کیا کہ وہ فوج لیکر جائیں اور ان شریروں سے اپنے باپ کا انتقام لیں[1] (
(۱۸ یا ۱۹) صفر سنہ ۱۱ھ میں آدھی رات کو آپ جنۃ البقیع میں جو عام مسلمانوں کا قبرستان تھا

(۱) واقدی اور ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اس غزوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بھی جانے کا حکم دیا تھا، لیکن یہ روایتیں بے سند ہیں، اس لیے علامہ ابن تیمیہ نے اس سے شدت کے ساتھ انکار کیا ہے، حضرت عمرؓ کے متعلق تو نہیں کہا جا سکتا لیکن حضرت ابوبکرؓ کو آپ نے ایام علالت میں امام نماز مقرر فرمایا، اور یہ صحیح روایت سے ثابت ہے، اس بنا پر اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ پہلے حضرت ابوبکرؓ کو جانے کا حکم ہوا تھا تو معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو آپ نے ان کو مستثنیٰ کر لیا [2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائے مرض کے دن، مدت علالت اور تاریخ وفات کی تعیین میں روایات مختلف ہیں، امر مختلف فیہ کے پہلے ان امور کو بتا دینا چاہیے جن پر تمام روایات کا اتفاق ہے اور جن پر گویا محدثین اور ارباب سیر کا اجماع عام ہے اور وہ یہ ہیں (۱) سال وفات سنہ ۱۱ھ ہے (۲) مہینہ ربیع الاول کا تھا (۳) یکم سے ۱۲ تک کوئی تاریخ تھی (۴) دوشنبہ کا دن تھا (صحیح بخاری ذکر وفات کتاب الجنائز) زیادہ تر روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کل ۱۳ دن بیمار رہے، اس بنا پر اگر تحقیقی طور سے متعین ہو جائے کہ آپ نے کس تاریخ کو وفات پائی تو تاریخ آغاز مرض بھی متعین کیجا سکتی ہے، حضرت عائشہؓ کے گھر بروایت صحیح ۸ روز (ایک دوشنبہ سے دوسرے دوشنبہ تک) بیمار رہے اور یہیں وفات فرمائی، اسلیے ایام علالت کی مدت ۸ روز تو یقینی ہے، عام روایات میں مدت پانچ دن اور چاہئیں، اور یہ قرائن سے بھی معلوم ہوتا ہے، اس لیے ۱۳ دن مدت علالت صحیح ہے، علالت کے ۵ دن آپ نے دوسری ازواج کے حجروں میں بسر فرمائے، اس حساب سے علالت کا آغاز چہارشنبہ ہوتا ہے۔

تاریخ وفات کی تعیین میں راویوں کا اختلاف ہے، کتب حدیث کا تمام تر دفتر چھان ڈالنے کے بعد بھی تاریخ وفات کی مجھکو کوئی روایت احادیث میں نہیں مل سکی، ارباب سیر کے ہاں تین روایتیں ہیں، یکم ربیع الاول، دوم ربیع الاول اور ۱۲ ربیع الاول ان تینوں روایتوں میں باہم ترجیح دینے کے لیے اصول روایت و درایت دونوں سے کام لینا ہے، روایۃً دوم ربیع الاول کی روایت ہشام بن محمد بن سائب کلبی اور ابو مخنف کے واسطہ سے مروی ہے (طبری صفحہ ۱۸۱۵) اس روایت کو گو اکثر قدیم مورخوں (مثلاً یعقوبی و مسعودی وغیرہ) نے قبول کیا ہے لیکن محدثین کے نزدیک یہ دونوں مشہور دروغ گو اور غیر معتبر ہیں، یہ روایت واقدی سے بھی ابن سعد و طبری نے نقل کی ہے، (جزء وفات) لیکن واقدی کی مشہور ترین روایت جس کو اس نے متعدد اشخاص سے نقل کیا ہے وہ ۱۲ ربیع الاول کی ہے، البتہ بیہقی نے دلائل میں بسند صحیح سلیمان التیمی سے دوم ربیع الاول کی روایت نقل کی ہے (زرقانی بحوالہ ابن سید الناس، وفات) لیکن یکم ربیع الاول کی روایت ثقہ ترین ارباب سیر موسیٰ بن عقبہ سے، اور مشہور محدث امام لیث مصری کی مروی ہے (فتح الباری وفات)

تشریف لے گئے وہاں سے واپس تشریف لائے تو مزاج ناساز ہوا یہ حضرت میمونہؓ کی باری کا دن تھا،[1] اور روز چہار شنبہ تھا، پانچ دن تک آپ اس حالت میں بھی از راہ عدل و کرم باری باری ایک ایک ہی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۲) امام سہیلی نے روض الانف میں اسی روایت کو اقرب الی الحق لکھا ہے (جلد دوم وفات) اور سب سے پہلے امام مذکور ہی نے درایۃً اس نکتہ کو دریافت کیا کہ ۱۲ ربیع الاولیٰ کی روایت قطعاً ناقابل تسلیم ہے، کیونکہ دو باتیں یقینی طور پر ثابت ہیں، روز وفات، دوشنبہ کا دن تھا (صحیح بخاری ذکر وفات وصحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ) اس سے تقریباً تین مہینے پہلے ذیحجہ ۱۰ھ کی نویں تاریخ کو جمعہ کا دن تھا (صحاح قصہ حجۃ الوداع صحیح بخاری تفسیر الیوم اکملت لکم دینکم) ۹ ذیحجہ ۱۰ھ روز جمعہ سے ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ تک حساب لگاؤ، ذیحجہ، محرم، صفر، ان تینوں مہینوں کو خواہ ۲۹، ۲۹ لو خواہ ۳۰، ۳۰، ۳۰ خواہ بعض ۲۹ بعض ۳۰ کسی حالت اور کسی شکل سے ۱۲ ربیع الاول کو دوشنبہ کا دن نہیں پڑ سکتا، اس لیے درایۃً بھی یہ تاریخ قطعاً غلط ہے، دوم ربیع الاول کو حساب سے اس وقت دوشنبہ پڑ سکتا ہے جب تینوں مہینے ۲۹ کے ہوں،

جب دو پہلی صورتیں صحیح نہیں ہیں تو اب صرف تیسری صورت رہ گئی ہے جو کثیر الوقوع ہے یعنی یہ کہ دو مہینے ۲۹ کے اور ایک مہینہ تیس کا لیا جائے، اس حالت میں ۲۹ ربیع الاول کو دوشنبہ کا روز واقع ہوگا اور یہی ثقہ اشخاص کی روایت ہے، ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا کہ ۹ ذیحجہ کو جمعہ ہو تو اوائل ربیع الاول میں اس حساب سے دوشنبہ کس کس دن واقع ہو سکتا ہے

نمبر شمار	صورت مفروضہ	دوشنبہ	دوشنبہ	دوشنبہ
۱	ذیحجہ، محرم اور صفر سب ۳۰ دن کے ہوں	۶	۱۳	
۲	ذیحجہ، محرم اور صفر سب ۲۹ دن کے ہوں	۲	۹	۱۶
۳	ذیحجہ، ۲۹، محرم ۲۹ اور صفر ۳۰ کا ہو	۱	۸	۱۵
۴	ذیحجہ، ۳۰، محرم ۲۹ اور صفر ۲۹ کا ہو	۱	۸	۱۵
۵	ذیحجہ، ۲۹، محرم ۳۰ اور صفر ۲۹ کا ہو	۱	۸	۱۵
۶	ذیحجہ، ۳۰، محرم ۲۹ اور صفر ۳۰ کا ہو	۷	۱۴	
۷	ذیحجہ، ۳۰، محرم ۳۰ اور صفر ۲۹ کا ہو	۷	۱۴	
۸	ذیحجہ، ۲۹ کا اور محرم و صفر ۳۰ کے ہوں	۷	۱۴	

ان مفروضہ تاریخوں میں سے ۶-۷-۸-۱۳-۱۶-۱۴-۱۵ خارج از بحث ہیں کہ علاوہ اور وجوہ کے ان کی تائید میں کوئی روایت نہیں، ہوگئیں یکم اور دوم تاریخیں، دوم تاریخ صرف ایک صورت میں پڑ سکتی ہے (باقی ص ۱۶۴ پر)

[1] ابن سعد و عبد الرزاق بسند صحیح و صحیح مسلم باب الامامۃ

کے حجرہ میں تشریف لیجاتے رہے، (دوشنبہ کے دن) مرض میں شدت ہوئی تو ازواج مطہرات سے اجازت لی کہ حضرت عائشہ رضؓ کے گھر قیام فرمائیں، خلق عظیم کی بنا پر اجازت بھی صاف اور علانیہ نہیں طلب کی، بلکہ پوچھا کہ کل میں کس کے گھر رہوں گا، دوسرا دن (دوشنبہ) حضرت عائشہ رضؓ کے یہاں قیام فرمانے کا تھا، ازواجِ مطہرات نے مرضی اقدس سمجھکر عرض کی کہ آپ جہاں چاہیں قیام فرمائیں[1]۔ ضعف اس قدر ہوگیا تھا کہ چلا نہیں جاتا تھا، حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ دونوں بازو تھام کر بمشکل حضرت عائشہ رضؓ کے حجرے میں لائے۔

(آمد و رفت کی قوت جب تک رہی آپ مسجد میں نماز پڑھانے کی غرض سے تشریف لاتے رہے، سب سے آخری نماز جو آپ نے پڑھائی وہ مغرب کی نماز تھی، سر میں درد تھا، اس لیے سر میں رومال باندھ کر آپ تشریف لائے اور نماز ادا کی جس میں سورۂ وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا قرأت فرمائی[2]۔ عشاء کا وقت آیا تو دریافت فرمایا کہ نماز ہوچکی، لوگوں نے عرض کی کہ سب کو حضور کا انتظار ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۳) جو خلاف اصول ہے، یکم تاریخ تین صورتوں میں واقع ہوسکتی ہے اور تینوں کثیر الوقوع ہیں، اور روایات ثقات ان کی تائید میں ہیں، اس لیے وفات نبوی کی صحیح تاریخ ہمارے نزدیک یکم ربیع الاول سنہ ۱۱ھ ہے، اس حساب میں فقط رویت ہلال کا اعتبار کیا گیا ہے جیسا کہ اسلامی قمری مہینوں کی بنیاد ہے، اصول فلکی سے ممکن ہے کہ اس پر خدشات وارد ہوسکتے ہوں۔

کتب تفسیر میں تحت آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اس آیت کے یوم نزول (۹ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ) سے روز وفات تک کے ۸۱ دن ہیں، (دیکھو ابن جریر و ابن کثیر و بغوی وغیرہ) ہمارے حساب سے ۹ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ سے لیکر یکم ربیع الاول تک (و ۲۹، ۱ ذی ایک مہینہ ۳۰ لیکر جو ہماری مفروضہ صورت ہے پورے ۸۱ دن ہوتے ہیں ابونعیم نے بھی دلائل میں بسند یکم ربیع الاول تک تاریخ وفات نقل کی ہے۔ صفحہ ۱۴۷ - س)

[1] صحیح بخاری ذکر وفات، ابن سعد نے بروایت صحیح نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضرت فاطمہ زہرا نے اجازت طلب کی تھی (ص ۲)

[2] یہ حدیث بخاری و مسلم، ابو داؤد، ترمذی اور نسائی باب القراۃ میں مذکور ہے، آئندہ حضرت عائشہؓ کی روایت آئیگی جس میں مذکور ہوگا کہ آخری نماز مسجد میں ظہر کی آپ نے پڑھائی، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان دونوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ مغرب کا واقعہ اندرون حجرہ نبوی کا واقعہ ہے جیسا کہ نسائی میں ہے (جلد ۲ ص ۱۴۵) (باقی ص ۱۷۵ پر)

لگن میں پانی بھروا کر غسل فرمایا، پھر اٹھنا چاہا کہ غش آگیا، افاقہ کے بعد پھر فرمایا کہ نماز ہو چکی؟ لوگوں نے پھر وہی پہلا جواب دیا، آپ نے پھر غسل فرمایا، اور پھر جب اٹھنا چاہا تو غش آگیا، افاقہ ہوا تو پھر دریافت فرمایا، از لوگوں نے وہی جواب دیا، تیسری مرتبہ جسم مبارک پر پانی ڈالا، پھر اٹھنے کا ارادہ کیا تو پھر غشی طاری ہو گئی جب افاقہ ہوا تو ارشاد فرمایا کہ ابوبکرؓ نماز پڑھائیں (حضرت عائشہؓ نے معذرت کی کہ یا رسول اللہ ابوبکر نہایت رقیق القلب ہیں، آپ کی جگہ ان سے کھڑا ہوا جائے گا، آپ نے پھر بھی حکم دیا کہ ابوبکرؓ نماز پڑھائیں، چنانچہ) کئی دن[1] تک حضرت ابوبکرؓ نے نماز پڑھائی،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۴) لیکن آگے چلکر حافظ موصوف کی نظر ترمذی کی روایت پر پڑی جسمیں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکل کر نماز پڑھائی، اسکی تاویل انکو یہ کرنی پڑی کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ خوابگاہ سے باہر آکر (ج ۲ ص ۲۰۴) لیکن ہمارے نزدیک تاویل صحیح نہیں کہ اول تو حجرۂ نبوی میں اتنی جگہ نہ تھی کہ کوئی بڑی جماعت ہو سکے، دوسرے یہ کہ خوابگاہ کے علاوہ حجرۂ نبوی میں اور جگہ کہاں تھی، علاوہ ازیں احادیث میں صلی بناس کے یہی معنی ہر جگہ آئے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے امام بنکر نماز پڑھائی، گھر کی نماز پر یہ لفظ صادق نہیں آتا، اسلئے صحیح یہ ہے کہ نماز مسجد نبوی میں پڑھی گئی جیسا کہ عام روایات کا منشاء ہے، آخری نماز مغرب تھی یا ظہر، اسکی تطبیق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلسل امامت کا انقطاع مغرب کی نماز مذکورہ پر ہوا جیسا کہ آگے آتا ہے، نماز کے ذکر میں آئیگا ظہر کی نماز جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں آکر ادا فرمائی وہ اتفاقی تھی، اصل میں امام پہلے حضرت ابوبکرؓ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آکر بعد کو شریک ہو گئے تھے، یہ نماز نہیں آپ کی آخری نماز تھی، بعض صحابہ سے یہ مذکور ہے کہ آخری نماز صبح کی تھی، یہ درحقیقت ان کا اپنا واقعہ ہے یعنی آخری بار یہی موقع ملا، س، صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت عائشہؓ یہ تخصیص ہے، دیکھو کتاب الصلوٰۃ اور وفات)

(۱ بخاری باب الامامۃ ج ۱ ص ۹۴) میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ تین دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز نہیں پڑھائی اور حضرت ابوبکرؓ نے آپ کی قائم مقامی کی، اس قائم مقامی کا آغاز شب جمعہ کی نماز عشا سے (بخاری و مسلم کتاب الصلوٰۃ) اور اختتام دو شنبہ کی صبح کی نماز پر ہوا (بخاری باب من رجع القہقری فی الصلوٰۃ ص ۱۰۶) کل یہ تین دن میں ۱۷ وقت کی نمازیں ہوئیں، ابن سعد نے واقدی سے بعینہ یہی روایت کی ہے، ایک میں ہے کہ ۳ دن امامت کی، دوسری میں ہے کہ ۱۷ وقت کی)

وفات سے چار دن پہلے (جمعرات کو) آپ نے فرمایا کہ دوات کاغذ لاؤ، میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہوگے، بعض صحابہ نے لوگوں کو مخاطب کرکے کہا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض کی شدت ہے (غلبہ الوجع) اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے جو ہمارے لیے کافی ہے"، اس پر حاضرین میں اختلاف پیدا ہوا، بعض کہتے تھے کہ تعمیل ارشاد کیجائے، بعض کچھ اور کہتے تھے، اختلاف اور شور و غل زیادہ ہوا تو بعض نے کہا "اہجر استفہموہ" خود آپ سے دریافت کر لو، لوگ جب پوچھنے لگے تو آپ نے فرمایا "مجھے چھوڑ دو، میں جس مقام میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو"

ل یہ روایت صحیح بخاری موقع وفات کی ہے، صحیح بخاری میں یہ حدیث مختلف ابواب میں مذکور ہے اور ہر جگہ الفاظ میں کچھ نہ کچھ اختلاف ہے (صحیح مسلم کتاب الوصیۃ میں یہ روایتیں لکھا ہیں) جن صحابی نے قلم دوات لانے میں گفتگو کی بخاری میں انکا نام نہیں، لیکن حدیث کی اور کتابوں میں (مثلاً صحیح مسلم) بہ تصریح حضرت عمرؓ کا نام ہے، صحیح مسلم میں (ان کے) یہ الفاظ ہیں:

قد غلب علیہ الوجع وعندکم القرآن وحسبنا کتاب اللہ — آپ کو مرض کی شدت ہے ہمارے پاس قرآن موجود ہے، خدا کی کتاب ہمارے لیے کافی ہے

(صحیح مسلم کی دوسری روایتوں کے یہ الفاظ ہیں)

(۱) فقالوا ان رسول اللہ صلعم یہجر — تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجر (یعنی ہذیان) کی باتیں کرتے ہیں

(۲) فقالوا اہجر استفہموہ — تو لوگوں نے کہا کیا آپ ہجر کی باتیں کرتے ہیں، آپ سے خود پوچھو تو

اس بنا پر یہ روایت شیعہ و سنی کا بڑا معرکہ آرا میدان بن گئی ہے، شیعہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے، سنی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعی تکلیف تھی، اور یہ معلوم تھا کہ شریعت کے متعلق کوئی نکتہ باقی نہیں رہا، خود قرآن مجید میں الیوم اکملت لکم نازل ہو چکی تھی، اسلیے حضرت عمرؓ نے آپکو تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا، اگر کوئی ضروری حکم ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے روکنے سے کیونکر رک سکتے تھے، اس واقعہ کے بعد چار دن آپ زندہ رہے، اس وقت نہیں بعد کو لکھوا دیا ہوتا، (اور یہ کیونکر معلوم ہوا کہ آپ کیا لکھنا چاہتے تھے، بخاری میں ہے کہ آپ عبداللہ بن ابی بکر کو بلا کر حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے پھر آپ نے ضروری نہیں سمجھا اور فرمایا کہ خود خدا اور اہل اسلام ابوبکر کے سوا کسی کو پسند نہ کرینگے، اس اختلاف کے بعد آپ نے لوگوں کو زبانی تین وصیتیں فرمائیں، جو ضروری بات آپ کاغذ پر لکھوانا چاہتے تھے ممکن ہے وہ یہی ہوں، یا اگر وہ انکے علاوہ تھی تو آپ اسکو ان عام وصیتوں کیساتھ زبانی بھی فرما سکتے تھے، اسکے بعد مجمع عام میں جو خطبہ دیا اس میں اس کا اظہار فرما سکتے تھے) س (باقی ص ۱۷۷ پر)

(اس کے بعد آپ نے تین) وصیتیں فرمائیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ کوئی مشرک عرب میں رہنے نہ پائے، دوسری یہ کہ سفراء کا اسی طرح احترام کیا جائے جس طرح آپ کے زمانہ میں دستور تھا. تیسری وصیت راوی کو یاد نہیں رہی۔[1]

(اسی دن[2] ظہر کی نماز کے وقت آپ کی طبیعت کچھ سکون پذیر ہوئی، آپ نے حکم دیا کہ پانی کی سات مشکیں آپ پر ڈالی جائیں، غسل فرما چکے تو حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ تھام کر مسجد میں لائے، جماعت کھڑی ہو چکی تھی، اور حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے، آہٹ پاکر حضرت ابوبکرؓ پیچھے ہٹے، آپ نے اشارہ سے روکا، اور ان کے پہلو میں بیٹھکر نماز پڑھائی، یعنی آپکو دیکھکر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ کر اور لوگ ارکان ادا کرتے جاتے تھے،

(نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا جو آپکی زندگی کا سب سے آخری خطبہ تھا، آپ نے فرمایا خدا نے اپنے ایک بندہ کو اختیار عطا فرمایا ہے کہ خواہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے یا خدا کے پاس (آخرت) میں جو کچھ ہے اس کو قبول کرے، لیکن اس نے خدا ہی کے پاس کی چیزیں قبول کیں، یہ سنکر حضرت ابوبکرؓ رو پڑے، لوگوں نے ان کی طرف تعجب سے دیکھا کہ آپؐ ایک شخص کا واقعہ بیان

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۶) مجھ کو احتیاط کرنی چاہیے کہ کتاب تاریخ کی حیثیت سے نکل کر علم کلام کے دائرہ میں نہ آجائے تاہم جو میری ذاتی تحقیق ہے میں الفاروق میں لکھ چکا ہوں،

[1] صحیح بخاری ذکر وفات (و صحیح مسلم کتاب الوصیۃ) [2] ان روایتوں میں بالتصریح یہ مذکور نہیں ہے کہ یہ کس دن کے ظہر کا واقعہ ہے، لیکن صحیح مسلم باب النہی عن بناء المساجد علی القبور، میں حضرت جندبؓ کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی شان میں جو الفاظ آپ نے فرمائے تھے جن کا بیان آگے آتا ہے وہ وفات سے پانچ روز پیشتر فرمائے تھے، اور چونکہ مرض الموت کا خطبہ اسی نماز ظہر کے بعد آپ نے فرمایا تھا، جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے، اس لیے یہ وفات سے پانچ روز پہلے جمعرات کا واقعہ تھا، حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں یہی فیصلہ کیا ہے۔) س

Marfat.com

کرتے ہیں، یہ رونے کی کونسی بات ہے لیکن رازدار نبوت سمجھ چکا تھا کہ وہ بندہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ نے اپنی تقریر کا سلسلہ آگے بڑھایا، اور فرمایا "سب سے زیادہ میں جن کی دولت اور صحبت کا ممنون ہوں وہ ابوبکر ہیں، اگر میں دنیا میں کسی کو اپنی امت میں سے اپنا دوست بنا سکتا تو ابوبکر کو بناتا لیکن اسلام کا رشتہ دوستی کے لیے کافی ہے، مسجد کے رخ کوئی دریچہ ابوبکر کے دریچہ کے سوا باقی نہ رکھا جائے، ہاں تم سے پہلی قوموں نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی قبروں کو عبادتگاہ بنالیا ہے، دیکھو تم ایسا نہ کرنا، میں منع کر جاتا ہوں[1]"

زمانۂ علالت میں انصار آپ کی عنایات اور مہربانیوں کو یاد کرکے روتے تھے، ایک دفعہ اسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عباسؓ کا گذر ہوا، انھوں نے انصار کو روتے دیکھا تو وجہ دریافت کی، انھوں نے بیان کیا کہ "حضور کی صحبتیں یاد آتی ہیں"، ان میں سے ایک صاحب نے جاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا، آج اسکی تلافی کا موقع تھا، اس لیے اس کے بعد آپ نے انصار کی نسبت لوگوں کی طرف خطاب کرکے فرمایا "یا ایھا الناس! میں انصار کے معاملہ میں تم کو وصیت کرتا ہوں، عام مسلمان بڑھتے جائیں گے لیکن انصار اس طرح کم ہو کر رہ جائیں گے جیسے کھانے میں نمک، وہ اپنی طرف سے اپنا فرض ادا کر چکے، اب تمھیں ان کا فرض ادا کرنا ہے، وہ میرے جسم میں بمنزلہ معدہ کے ہیں، جو تمھارے نفع و نقصان کا متولی ہو (یعنی جو خلیفہ ہو) اس کو چاہیے کہ ان میں جو نکوکار ہوں ان کو قبول کرے، اور جن سے خطا ہوئی ہو، ان کو معاف کرے[2]"

اوپر گذر چکا ہے کہ رومیوں کی طرف جس فوج کا بھیجنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز کیا تھا، اسکی سرداری

(۱؎ صحیح بخاری و مسلم مناقب ابی بکرؓ، اخیر ٹکڑا صحیح مسلم باب النہی عن بناء المساجد علی القبور میں ہے ۲؎ صحیح بخاری مناقب انصار)

Marfat.com

اسامہ بن زیدؓ کو تفویض فرمائی تھی، اس پر لوگوں نے (ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ وہ منافقین تھی) نکتہ چینی کی کہ بڑے بوڑھوں کے ہوتے ہوئے نوجوانوں کو یہ منصب کیوں عطا ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ کی نسبت ارشاد فرمایا:

"اگر اسامہ کی سرداری پر تم کو اعتراض ہے تو اسکے باپ (زید) کی سرداری پر بھی تم معترض تھے، خدا کی قسم وہ اس منصب کا مستحق تھا اور وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب تھا، اور اب اسکے بعد یہ سب سے زیادہ محبوب ہے"[1]

اسلام اور دیگر مذاہب میں ایک نہایت دقیق فرق یہ ہے کہ اسلام شریعت کے تمام احکام کا واضع اور حاکم براہ راست خدائے پاک کو قرار دیتا ہے، پیغمبر کا صرف اسی قدر فرض ہے کہ احکام الٰہی کو اپنے قول و عمل کے ذریعہ سے بندوں تک پہنچا دے، چونکہ دوسرے مذاہب میں یہ غلط فہمی شرک و کفر تک منجر ہو چکی تھی، اور اس کے نتائج پیش نظر تھے، اس لیے ارشاد فرمایا،

"حلال و حرام کی نسبت میری طرف نہ کیجائے، میں نے وہی چیز حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے اور وہی چیز حرام کی ہے جو خدا نے حرام کی ہے"[2]

انسان کی جزا و سزا کی بنیاد خود اس کے ذاتی عمل پر ہے۔ آپ نے فرمایا:

"اے پیغمبر خدا کی بیٹی فاطمہ! اور اے پیغمبر خدا کی پھوپھی صفیہ! خدا کے ہاں کے لیے کچھ کر لو، میں تمھیں خدا سے نہیں بچا سکتا"[3]

---

(۱) صحیح بخاری بعث اسامہ و مناقب زید بن حارثہ (۲) یہ اور اسکے اوپر کی حدیث مسند امام شافعی باب ما جاء فی الحکم فی الامام الامام شافعی اور ابن سعد جزء الوفات میں بسند حسن مروی ہے لیکن ان دونوں روایتوں میں مذکور ہے کہ حج کی نماز کے بعد آپ نے یہ فرمایا لیکن بخاری کے حوالہ سے گذر چکا ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز میں مسلمانوں کو نماز پڑھائی تھی اور اسکے بعد خطبہ دیا تھا، دوسری غلطی مسند اور ابن سعد کی روایتوں میں یہ ہے کہ وہ دوشنبہ کی صبح تھی، روز وفات کا واقعہ اسکو بیان کرتے ہیں، حالانکہ روایت صحیحہ ثابت ہے کہ دوشنبہ کی صبح کو آپ نے صرف پردہ اٹھا کر جھانکا تھا، نہ باہر تشریف لائے اور نہ نماز میں شرکت فرمائی۔ (۳) مسلم

خطبہ سے فارغ ہوکر آپ حجرۂ عائشہؓ میں واپس تشریف لائے)

آپ کو حضرت فاطمہ زہراؓ سے بیحد محبت تھی، (اثنائے علالت میں) انکو بلا بھیجا تشریف لائیں تو ان سے کچھ کان میں باتیں کیں، وہ رونے لگیں، پھر بلا کر کچھ کان میں کہا، تو ہنس پڑیں، حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا تو کہا "پہلی دفعہ آپ نے فرمایا کہ میں اسی مرض میں انتقال کروں گا۔ جب میں رونے لگی تو فرمایا کہ میرے خاندان میں سب سے پہلے تمھیں مجھ سے آکر ملوگی تو ہنسنے لگی"۔[1]

یہود و نصاریٰ نے انبیاء کے مزارات اور یادگاروں کی تعظیم میں جو افراط کی تھی وہ بت پرستی کی حد تک پہنچ گئی تھی، اسلام کا فرض اولین بت پرستی کی رگ و ریشہ کا استیصال کرنا تھا، اس لیے حالت مرض میں جو چیز سب سے زیادہ آپ کے پیش نظر تھی یہی تھی، (اتفاق سے بعض ازواج مطہرات[2] جو حبشہ ہو آئی تھیں، اسی حالت میں وہاں کے عیسائی معبدوں[3] کا اور ان کے مجسموں اور تصویروں[4] کا تذکرہ کیا، آپ نے فرمایا کہ ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی[5] مرجاتا ہے تو اسکے مقبرہ کو عبادتگاہ بنالیتے ہیں، اور اس کا بت بناکر اس میں کھڑا کرتے ہیں، قیامت کے روز اللہ عزوجل کی نگاہ میں یہ لوگ بدترین مخلوق ہونگے)[6] عین کرب کی شدت میں جبکہ چادر کبھی منہ پر ڈال لیتے تھے اور کبھی گرمی سے گھبرا کر الٹ دیتے تھے حضرت عائشہؓ نے زبان مبارک سے یہ الفاظ سنے:

لعنۃ اللہ علی الیہود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیائھم مساجد[7]	یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو، انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادتگاہ بنالیا،

(۱؎ صحیح بخاری ذکر وفات ۲؎ کوئی رومن کیتھولک گرجا ہوگا جس میں حضرت عیسیٰ، حضرت مریم اور ولیوں اور شہیدوں کے مجسمے اور تصویریں ہوتی ہیں) ۳؎ جس کو عیسائی سینٹ کہتے ہیں) ۴؎ صحیح بخاری و صحیح مسلم باب النہی عن بناء المساجد علی القبور) ۵؎ صحیح بخاری ذکر وفات و صحیح مسلم باب مذکور سابق)

Marfat.com

(اسی کرب و بےچینی میں یاد آیا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں، دریافت فرمایا کہ "عائشہ! وہ اشرفیاں کہاں ہیں؟ محمد خدا سے بدگمان ہو کر ملیگا؟ جاؤ انکو خدا کی راہ میں خیرات کردو"[۱]

(وفات سے ایک دن پہلے اتوار کو)[۲] لوگوں نے دوا پلانی چاہی، چونکہ گوارا نہ تھی، آپ نے انکار فرمایا اسی حالت میں غشی طاری ہوگئی، لوگوں نے منہ کھول کر دوا پلادی، افاقہ کے بعد آپ کو احساس ہوا، تو فرمایا کہ سب کو دوا پلائی جائے، معلوم ہوا جن لوگوں نے زبردستی دوا پلائی تھی ان میں حضرت عباسؓ شامل نہ تھے، اسلیے وہ اس حکم[۳] سے مستثنیٰ رہے۔ محدثین اس واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ یہ بشریت کا اقتضا تھا، یعنی جس طرح بیماروں میں نازک مزاجی آجاتی ہے، آپ نے بھی اسی طرح یہ حکم دیا تھا۔ لیکن ہمارے نزدیک تو یہ تنک مزاجی نہیں، بلکہ لطف طبع تھا۔

مرض میں اشتداد اور تخفیف ہوتی رہتی تھی جس دن وفات ہوئی (یعنی دوشنبہ کے روز) بظاہر طبیعت کو سکون تھا، حجرۂ مبارک مسجد سے ملا ہوا تھا، آپ نے (صبح کے وقت) پردہ اٹھا کر دیکھا تو لوگ (فجر کی) نماز میں مشغول تھے، دیکھ کر مسرت سے ہنس پڑے، لوگوں نے آہٹ پا کر خیال کیا کہ آپ باہر آنا چاہتے ہیں، فرط مسرت سے تمام لوگ بے قابو ہوگئے، اور قریب تھا کہ نمازیں ٹوٹ جائیں حضرت ابوبکرؓ نے جو امام تھے، چاہا کہ پیچھے ہٹ جائیں، آپ نے اشارہ سے روکا اور حجرۂ شریف میں داخل ہو کر پردے ڈال دیے (صحیح مسلم[۴] میں ہے کہ اس قدر ضعف تھا کہ آپ پردے بھی اچھی طرح نہ ڈال سکے[۵]، یہ سب سے آخری موقع تھا کہ صحابہ نے جمال اقدس کی زیارت کی حضرت انسؓ بن مالک

---

[۱] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۴۹ وابن سعد جزء الوفات بروایت متعددہ [۲] ابن سعد وفات [۳] صحیح بخاری ذکر وفات وصحیح مسلم (التداوی باللدود) [۴] صحیح بخاری ذکر وفات، وکتب صحاح، کتاب الصلوٰۃ [۵] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ ص ۱۶۷)

Marfat.com

کہتے ہیں کہ آپ کا چہرہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مصحف کا کوئی ورق ہے یعنی سپید ہو گیا تھا)

دن جیسے جیسے چڑھتا جاتا تھا، آپ پر بار بار غشی طاری ہوتی تھی، اور پھر افاقہ ہو جاتا تھا۔ حضرت فاطمہ زہرا یہ دیکھ کر بولیں "واکرب اباہ" ہائے میرے باپ کی بےچینی! آپ نے فرمایا تمہارا باپ آج کے بعد بےچین نہ ہوگا۔" حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ آپ جب تندرست تھے تو فرمایا کرتے تھے کہ پیغمبروں کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خواہ موت کو قبول کریں، یا حیاتِ دنیا کو ترجیح دیں، اس حالت میں اکثر آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوتے رہے،

مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ — ان لوگوں کیساتھ جن پر خدا نے انعام کیا

اور کبھی یہ فرماتے

اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى — خداوندا! بڑے رفیق ہیں۔

وہ سمجھ گئیں کہ اب صرف رفاقت الٰہی مطلوب ہے)

وفات سے ذرا پہلے حضرت ابوبکر کے صاحبزادے عبدالرحمٰن، خدمت اقدس میں آئے آپ حضرت عائشہ کے سینہ پر سر ٹیک کر لیٹے تھے، عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں مسواک تھی، مسواک

---

(۱) صحیح مسلم باب الصلوٰۃ، حضرت انس بن مالک کی روایت میں جو صحیح مسلم (کتاب الصلوٰۃ ص ۱۶۷) میں ہے، بیان ہے کہ تین دن کے بعد آپ اس وقت صبح کی نماز کے وقت برآمد ہوئے تھے لیکن جماعت میں شریک نہ ہو سکے، اور واپس گئے، امام شافعی نے کتاب الام میں اور ابن سعد نے جزء الوفات میں ابن ابی سبرہ سے روایت کی ہے کہ آپ اس نماز میں شریک جماعت ہوئے لیکن یہ درحقیقت راوی کا سہو ہے، صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں یہ تصریح مذکور ہے کہ آپ شریک جماعت نہ ہو سکے اور واپس گئے، راوی کو گذشتہ نماز ظہر کا التباس ہوا، تین دن کے بعد سے مراد جمعرات کے روز جس دن آپ نے خطبہ دیا تھا اس کے بعد سے جمعہ، سنیچر اور اتوار کے دن ہیں،

کی طرف نظر جما کر دیکھا، حضرت عائشہؓ سمجھیں کہ آپ مسواک کرنا چاہتے ہیں، عبدالرحمٰن سے مسواک لے کر دانتوں سے نرم کی، اور خدمتِ اقدس میں پیش کی، آپ نے بالکل تندرستوں کی طرح مسواک کی، اب وفات کا وقت قریب آرہا تھا، سہ پہر تھی[1]، سینہ میں سانس کی گھرگھراہٹ محسوس ہوتی تھی، اتنے میں لبِ مبارک ہلے تو لوگوں نے یہ الفاظ سنے[2]،

(الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم) نماز اور غلام

پاس پانی کی لگن تھی، اس میں بار بار ہاتھ ڈالتے اور چہرہ پر ملتے، (چادر کبھی منہ پر ڈال لیتے اور کبھی ہٹا دیتے تھے، اتنے میں) ہاتھ اٹھا کر (انگلی سے اشارہ کیا اور تین دفعہ) فرمایا

بل الرفیق الاعلیٰ — اب اور کوئی نہیں، بلکہ وہ بڑا رفیق درکار ہے

یہی کہتے کہتے ہاتھ لٹک آئے، آنکھیں پھٹ کر چھت سے لگ گئیں[3] اور روحِ پاک عالمِ قدس میں پہنچ گئی،

اللّٰھم صل علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ صلوٰۃً کثیراً کثیراً

تجہیز و تکفین (تجہیز و تکفین کا کام دوسرے دن سہ شنبہ ۱۲ ربیع الاول کو شروع ہوا، اس تاخیر کے متعدد اسباب تھے۔

(۱) عقیدت مندوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ حضورؐ نے اس دنیا کو الوداع کہا، چنانچہ حضرت عمرؓ نے تلوار کھینچ لی کہ جو یہ کہے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی، اس کا سر اڑا دوں گا،

---

(۱) ابن اسحاق نے سیرت میں لکھا ہے کہ وفات دوپہر کو ہوئی لیکن حضرت انس بن مالکؓ بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ آخر یوم یعنی دوشنبہ کے آخر وقت وفات پائی، حافظ ابن حجر نے دو روایتوں میں اسی طرح تطبیق دی ہے کہ دوپہر ڈھل چکی تھی، اور سہ پہر کا وقت تھا) (۲) ادب المفرد امام بخاری صفحہ ۳۰ مصر، سنن ابن ماجہ کتاب الوصایا اور ابن سعد جزء الوفات ابن سعد) (۳) یہ تمام واقعات صحیح بخاری ذکرِ وفات کے مختلف ابواب میں مذکور ہیں۔

Marfat.com

لیکن حضرت ابوبکرؓ آئے اور انھوں نے تمام صحابہ کے سامنے خطبہ دیا کہ حضورؐ کا اس جہاں سے تشریف لے جانا یقینی تھا، اور قرآن مجید کی آیتیں پڑھ کر سنائیں تو لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور اس ناگزیر واقعہ کا یقین آیا،

(۲) اسکے بعد اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ غروب آفتاب سے پہلے تجہیز و تکفین سے فراغت ہو سکے،

(۳) قبر کنی کا کام غسل و کفن کے بعد شروع ہوا، اس لیے دیر تک انتظار کرنا پڑا،

(۴) جس حجرہ میں آپنے وفات پائی تھی، وہیں لوگ علی الترتیب تھوڑے تھوڑے کرکے جاتے اور نماز جنازہ ادا کرتے تھے، اس لئے بھی بڑی دیر لگی اور سہ شنبہ کا دن گذر کر رات کو فراغت ملی[1])

تجہیز و تکفین کی خدمت خاص اعزہ و اقارب نے انجام دی، فضل بنؓ عباس اور اسامہ بنؓ زید نے پردہ کیا اور حضرت علیؓ نے غسل دیا، حضرت عباسؓ بھی موقع پر موجود تھے، اور بعض روایتوں میں ہے کہ ان ہی نے پردہ بھی کیا تھا، چونکہ اس شرف میں ہر شخص شریک ہونا چاہتا تھا، اس لیے حضرت علیؓ نے اندر سے کواڑ بند کر لئے تھے، انصار نے دروازہ پر آواز دی کہ خدا کے لیے ہمارے حقوق کا بھی خیال رکھیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گذاری میں ہمارا بھی حصہ ہے، حضرت ابوبکرؓ نے جیسا کہ واقدی کا بیان ہے، فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کسی کا حق نہیں ہے، اسلیے اگر سب کو اجازت دیدی گئی تو کام رہ جائیگا لیکن (انصار کے اصرار پر) حضرت علیؓ نے اوس بنؓ خولی انصاری کو جو اصحاب بدر میں تھے، اندر بلا لیا، وہ پانی کا گھڑا بھر بھر کر لاتے تھے، حضرت علیؓ

[1] ابن سعد وغیرہ کی بعض روایتوں میں ہے کہ چہارشنبہ کو تدفین ہوئی لیکن یہ تمام تر کذب اور جھوٹ ہے، خود ابن سعد میں صحیح روایتیں یہ ہیں کہ سہ شنبہ کو تدفین ہوئی، البتہ چہارشنبہ کی شام شروع ہو گئی تھی، ابن ماجہ کی روایت ہے (کتاب الجنائز) فلما فرغوا من جهازه یوم الثلثاء "جب سہ شنبہ کے دن تجہیز و تکفین سے فرصت ہوئی"

Marfat.com

نے جسم مبارک کو سینہ سے لگا رکھا تھا، حضرت عباسؓ اور ان کے دونوں صاحبزادے قثمؓ اور فضلؓ جسم مبارک کی کروٹیں بدلتے تھے اور اسامہ بن زیدؓ اوپر سے پانی ڈالتے تھے[1]،

(کفن کے لیے پہلے جو کپڑا انتخاب کیا گیا تھا، وہ حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے عبداللہ کی یمن کی بنی ہوئی ایک چادر تھی، لیکن بعد کو اتار لی گئی[2]) اور تین سوتی سفید کپڑے جو سحول کے بنے ہوئے تھے کفن میں دیے گئے[3]۔ ان میں قمیص اور عمامہ نہ تھا،

(غسل و کفن کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آپ کو دفن کہاں کیا جائے، حضرت ابوبکرؓ نے کہا نبی جس مقام پر وفات پاتا ہے، وہیں دفن بھی ہوتا ہے، چنانچہ نعش مبارک اٹھا کر، اور بستر الٹ کر حجرۂ عائشہؓ میں اسی مقام پر قبر کھودنا تجویز ہوا[4]، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپ کو کسی میدان میں اس لیے دفن نہیں کیا گیا کہ آخری لمحوں میں آپ کو یہ خیال تھا کہ لوگ فرط عقیدہ سے میری قبر کو بھی عبادتگاہ نہ بنالیں، میدان میں اس کی دار و گیر مشکل تھی[5]، اس لیے حجرہ کے اندر دفن کیا گیا)

مدینہ میں دو صاحب قبر کھودنے میں ماہر تھے، حضرت ابوعبیدہ جراحؓ اور ابو طلحہؓ انصاری ابوعبیدہؓ اہل مکہ کے دستور کے مطابق صندوقی قبر کھودتے تھے، اور ابو طلحہؓ مدینہ کے رواج کے مطابق لحدی، لوگوں میں اختلاف پیش آیا کہ کس قسم کی قبر کھودی جائے، حضرت عمرؓ نے

---

[1] طبقات ابن سعد صفحہ ۲۲ و ۲۳، جزء الوفات طبری (مختصراً) ابوداؤد کتاب الجنائز میں بھی ان صاحبوں کے نام ہیں، نیز ابن ماجہ کتاب الجنائز) ([2] صحیح مسلم صفحہ ۳۰ کتاب الجنائز) [3] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد کتاب الجنائز [4] ابن سعد جزء الوفات ۲۱ و صحیح و ابن ماجہ کتاب الجنائز ذکر وفات نبوی [5] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب الوفات

کہا اختلاف مناسب نہیں، دونوں صاحبوں کے پاس آدمی بھیجا جائے، جو پہلے آجائے[۱] لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا، چنانچہ) حضرت عباسؓ نے دونوں صاحبوں کے پاس آدمی بھیجے، اتفاق یہ کہ حضرت ابوعبیدہؓ گھر پر موجود نہ تھے، ابوطلحہؓ آئے اور ان ہی نے مدینہ کے رواج کے مطابق قبر کھودی جو لحدی، یعنی بغلی تھی، چونکہ زمین نم تھی، اس لیے جس بستر پر آپ نے وفات پائی تھی، وہ قبر میں بچھا دیا گیا،

جنازہ تیار ہوگیا تو لوگ نماز کے لیے ٹوٹے (جنازہ حجرہ کے اندر تھا، باری باری سے لوگ تھوڑے تھوڑے کر کے جاتے تھے) پہلے مردوں نے پھر عورتوں نے پھر بچوں نے نماز پڑھی لیکن کوئی امام نہ تھا،[۲]

جسم مبارک کو حضرت علیؓ، فضل بن عباس (اسامہؓ بن زید اور حضرت عبدالرحمانؓ ابن عوف) نے قبر میں اتارا۔[۳]

(۱؎ ابن ماجہ کتاب الجنائز) ۲؎ ابن سعد بروایت صحیح جزء الوفات (۳؎ ابوداؤد کتاب الجنائز، ابن ماجہ اور ابن سعد میں اسامہؓ بن زید اور حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف کے بجائے قثم بن عباس اور شقران (غلام خاص) کے نام ہیں ارباب نظر جانتے ہیں کہ ان دو روایتوں میں ترجیح کس کو ہو سکتی ہے)

Marfat.com

متروکات

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انتقال فرمایا تو اپنے مقبوضات و جائداد میں سے کیا کیا چیزیں ترکہ میں چھوڑیں؟ اس سوال کا اصل جواب تو یہ ہے کہ آپ خود اپنی زندگی میں اپنے پاس کیا رکھتے تھے، جو مرنے کے بعد چھوڑ جاتے! اور اگر کچھ تھا بھی تو اسکے متعلق عام اعلان فرما چکے تھے۔

لا نورث ما ترکنا صدقۃ[1]	ہم (انبیاء) کا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو چھوڑا وہ عام مسلمانوں کا حق ہے

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے وارث اشرفی بانٹ کر نہیں پائیں گے یعنی نہ ہوگی نہ پائیں گے، چنانچہ یہ ہوگا کہ وفات کے وقت چند دینار حضرت عائشہؓ کے پاس امانت تھے، آپ نے اسی وقت نکلوا کر خیرات کرا دیے۔

عمرو بن حویرث سے جو ام المومنین جویریہؓ کے بھائی تھے، بخاری میں روایت ہے

ما ترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتے وقت کچھ نہ چھوڑا، نہ درہم،
عند موتہ درھما ولا دینارا ولا عبدا	نہ دینار، نہ غلام، نہ لونڈی اور نہ کچھ اور صرف
ولا امۃ ولا شیئا الا بغلتہ البیضاء	اپنا سفید خچر اور ہتھیار، اور کچھ زمین جو عام مسلمانوں
وسلاحہ وارضا جعلہا صدقۃ[2]	پر صدقہ کر گئے۔

ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے،

---

[1] یہ فقرہ تمام حدیث کی کتابوں میں ہے، بخاری میں متعدد مقامات میں ہے، کتاب الوصایا، کتاب الفرائض، باب فرض الخمس

[2] صحیح بخاری کتاب الوصایا،

Marfat.com

ماترك رسول الله صلى الله عليه وسلم ديناراً ولا درهماً ولا بعيراً ولا شاة

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ دینار چھوڑا، نہ درہم، نہ اونٹ، نہ بکری

بہرحال متروکات میں اگر تھیں تو یہی تین چیزیں تھی، کچھ زمین، سواری کے جانور اور ہتھیار۔

زمین

(حضرت عمرو بن حویرثؓ نے جس زمین کا ذکر کیا ہے، وہ مدینہ، خیبر اور فدک کے چند باغ تھے، مدینہ کی جائداد سے بنو نضیر کی جائداد مراد ہے یا مخیریق نام ایک یہودی نے ۳ھ میں (غزوہ احد کے موقع پر) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چند باغ وصیۃً ہبہ کیے تھے، وہ مراد ہیں) لیکن صحیح روایتوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باغ اسی وقت مستحقین کو تقسیم کر دیے تھے۔

فدک اور خیبر کی نسبت ابتدا ہی سے شیعہ اور اہلسنت میں اختلاف ہے، شیعہ کہتے ہیں کہ یہ آپ کی ذاتی جائداد تھی، اور وراثت کے طور پر اہلبیت میں تقسیم ہونی چاہیے تھی، اہلسنت کہتے ہیں کہ یہ بطور ولایت اسلامی آپ کے قبضہ میں تھی، اور فرض بھی ہو تو آپ نے خود فرما دیا تھا کہ "ہمارا جو ترکہ ہو، وہ صدقہ ہے۔"

اصل یہ ہے کہ یہ اختلاف خود صحابہ کے وقت میں پیدا ہو چکا تھا، حضرت عباسؓ (آپ کے چچا) حضرت فاطمہؓ (صاحبزادی) اور اکثر ازواج مطہرات[2] مدعی تھیں کہ اس جائداد کو بطور وراثت تقسیم ہونا چاہیے، حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر اکابر صحابہ نے کہا کہ یہ وقف عام ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی زندگی میں جس طرح اور جن مصارف میں انکی آمدنی صرف کرتے تھے، اس میں تغیر نہ ہوگا،[3] آنحضرت

(۱ بخاری باب فرض الخمس میں ہے وصدقتہ بالمدینۃ یہ ان ہی باغوں کے متعلق ہے تفصیل کیلئے فتح الباری ج ۶ صفحہ ۱۴۱ دیکھو، نیز صحیح بخاری میں کتاب المغازی ذکر بنضیر ۲ صحیح بخاری کتاب الفرائض) (۳ یہ مکالمہ بخاری کے متعدد ابواب میں مذکور ہے، دیکھو کتاب الفرائض)

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانۂ حیات میں ان تینوں جائدادوں کی آمدنی مختلف مدوں میں متعین کردی تھی، بنونضیر کی جائداد کی آمدنی ناگہانی ضروریات کے لیے مخصوص تھی، فدک کی آمدنی مسافروں کے لیے وقف تھی، خیبر کی آمدنی کو آپ تین حصوں میں تقسیم فرماتے تھے، دو حصے عام مسلمانوں کے لیے تھے، ایک حصہ ازواج مطہرات کو سالانہ مصارف کے لیے ملتا تھا، اس میں سے بھی جو بچ جاتا وہ غریب مہاجرین کی اعانت میں کام آتا، آخر میں حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے اصرار پر مدینہ کی جائداد ان دونوں کی تولیت میں دیدی تھی، لیکن حضرت علیؓ نے اس پر قبضہ کر لیا تھا، خیبر اور فدک حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے زمانہ تک خلفاء کے ہاتھ میں رہے۔[1]

جانور ارباب سیر نے آپ کے اسپ خاصہ اور مویشی اور دواب کی تفصیل اس طرح لکھی ہے، جس سے ایک والی ملک کے اصطبل اور دواب خانہ کا دھوکا ہوتا ہے،

طبری نے ان تمام جانوروں کے نام اور حالات تفصیل سے لکھے ہیں، اور اگر وہ قابل اعتبار ہوتے تو حقیقت میں نہایت دلچسپ تھے لیکن اسکے متعلق طبری کی جسقدر روایتیں ہیں، سب بلا استثناء واقدی سے ماخوذ ہیں، پچھلے مصنفین جن میں بڑے بڑے محدثین ہیں مثلاً یعمری، مغلطائی، حافظ عراقی وغیرہ نے بھی یہ تفصیل لکھی ہے اور چونکہ یہ مصنفین اکثر سلسلۂ سند نہیں لکھتے، اسلیے اکثر لوگ ان کے مستند ہونے کی بنا پر اس واقعہ کو صحیح خیال کرتے ہیں لیکن جب تفتیش کیجاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تمام روایتوں کا سلسلہ سند واقدی سے آگے نہیں بڑھتا،

---

[1] سنن ابی داؤد، باب صفایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (لے حوالۂ مذکورہ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے باغ فدک سادات کو دیدیا تھا)

حضرت عائشہؓ کی روایت اوپر گذر چکی ہے،

ماترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دینارًا	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ دینار چھوڑا، نہ درہم
ولا درهما ولا بعیرا ولا شاة	نہ اونٹ نہ بکری

صحیح بخاری (کتاب الجہاد) میں عمرو بن حورث (ام المومنین جویریہؓ کے بھائی تھے) سے روایت ہے،

ماترک النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا بغلته البیضاء	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں چھوڑا، بجز اپنے سفید
وسلاحه وارضا ترکھا صدقة	خچر اور ہتیار اور ایک زمین کے جو وقف عام ہوگئی،

ان روایتوں سے معلوم ہوگا کہ متروکات خاصہ میں صرف ایک جانور تھا، ان صحیح اور مسلم روایات کے ہوتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسباب و دواب کی اتنی بڑی فہرست طبری وغیرہ نے درج کی ہو اور جو ایک تاجدار سلطنت کے شایان حال ہو، کیونکر تسلیم کیجا سکتی ہے،

احادیث صحیحہ کے استقراء سے اسقدر ضرور ثابت ہوتا ہو کہ عمرو بن حویرث کی مختصر فہرست سے زائد چیزیں بھی آپکے قبضہ میں آئیں لیکن اس سے عمرو کی روایت پر اثر نہیں پڑ سکتا، کیونکہ عمرو صرف اس بات کے مدعی ہیں کہ وفات کے وقت یہی سرمایہ تھا ممکن ہو کہ یہ چیزیں وفات سے پہلے آپنے حسب عادت ہبہ یا خیرات کردی ہوں، بہرحال (از روے روایات صحیحہ مختلف اوقات میں) حسب ذیل جانور آپکے دائرہ ملک میں آئے،

لحیف، ایک گھوڑا جو ابی بن عباس کے باغ میں بندھا تھا، بخاری نے کتاب الجہاد میں اس کا ذکر کیا ہے،

عُفیر، ایک گدھا تھا حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھکو اپنے ساتھ اسپر بٹھایا تھا،

(بخاری کتاب الجہاد)

عضباء و قصواء، نہایت تیز اونٹنی تھی، قصواء بھی اسی کا نام ہے، (طبری صفحہ ۱۷۸۴ میں ہے کہ اسی کو آپ نے ہجرت کے وقت حضرت ابوبکرؓ سے خریدا تھا، اور اسی پر سوار ہو کر آپ نے ہجرت فرمائی تھی، اور مدینہ پہنچکر حضرت ابو ایوبؓ کے مکان کے پاس جاکر بیٹھ گئی تھی[1]، حجۃ الوداع کا خطبہ بھی آپ نے اسی کی پشت پر دیا تھا[2]) یہ ہر معرکہ میں بازی لیجاتی تھی، ایک دفعہ ایک بدو باہر سے آیا، اسکی سواری میں ایک اونٹ تھا، جو ابھی جوان بھی نہیں ہوا تھا، عضباء کا اس سے مقابلہ ہوا، اور وہ آگے نکل گیا، صحابہ کو ملال ہوا، آپ نے فرمایا کہ "یہ خدا کا فرض ہے کہ دنیا کی کوئی چیز جب سر اٹھائے تو اس کو پست کر دے"، (بخاری باب الجہاد)

تیہ، دُلدل جسکا ذکر اکثر روایتوں میں ہے، اسی خچر کا نام ہے، جسکا ذکر عمرو بن حویرثؓ کی روایت میں ہے، چنانچہ بخاری کے شارحین نے تصریح کی ہے، یہ خچر مقوقس مصری نے آپ کو تحفہ میں بھیجا تھا، صحیح بخاری میں ہے کہ ابن العلما، (رئیس ایلہ) نے بھی آپ کو ایک سفید خچر (غزوہ تبوک کے موقع پر تحفۃً بھیجا تھا[3]) غزوہ حنین میں جس سفید خچر پر آپ سوار تھے، وہ فروہ بن نفاثہ جذامی نے ہدیۃً بھیجا تھا، ارباب سیر نے اس خچر کو دُلدل سمجھا ہے، لیکن یہ غلط ہے، صحیح مسلم میں اس کی تصریح موجود ہے[4])

اسلحہ: اس زہد و قناعت کے ساتھ جہاد کی ضرورت سے توشہ خانۂ مبارک میں حسب ذیل سامان تھا، نو عدد تلواریں تھیں جن کے یہ نام ہیں، ماثور، عضب، ذوالفقار، قلعی، بتار، حتف، مخذم، قضیب،

---

[1] صحیح بخاری ذکر ہجرت [2] صحیح مسلم و ابوداؤد ذکر حجۃ الوداع [3] کتاب الجہاد بغلۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم [4] فتح الباری ذکر غزوہ حنین، جلد ۸ ص ۲۴ [5] باب غزوہ حنین)

ماثور، والد ماجد سے میراث میں ملی تھی، ذوالفقار بدر میں ہاتھ آئی تھی، تلوار کا قبضہ چاندی کا تھا، فتح مکہ میں جو تلوار آپ کے ہاتھ میں تھی اس کا قبضہ زریں تھا، سات زرہیں تھیں، ذات الفضول، ذات الوشاح، ذات الحواشی، سعدیہ، فضہ، تبرا، خرنق، ذات الفضول وہی زرہ تھی جو تیس صاع پر ایک یہودی کے ہاں سال بھر کے لیے آپ نے رہن رکھی تھی،[1] زرہیں سب لوہے کی تھیں، اگرچہ عرب میں چمڑے کی زرہیں بھی ہوتی تھیں،

چھ کمانیں تھیں، زوراء، روحاء، صفراء، بیضاء، کتوم، شداد، کتوم وہ کمان تھی جو غزوۂ احد میں ٹوٹ گئی تھی، اور آپ نے قتادہ کو دیدی تھی، ایک ترکش تھا جس کو کافور کہتے تھے، چمڑے کی ایک پیٹی تھی جس میں چاندی کے تین حلقے تھے، لیکن ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ کسی حدیث سے مجھکو یہ پتہ نہیں لگا کہ آپ نے کبھی پیٹی لگائی بھی تھی، ایک ڈھال تھی جس کا نام زلوق تھا، پانچ برچھیاں تھیں، لوہے کا ایک مغفر تھا جس کا نام موشح تھا، ایک اور مغفر تھا جس کو سبوغ کہتے تھے،

تین جبے تھے، جن کو آپ لڑائی میں پہنتے تھے، کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک دیبائے سبز کا تھا، ایک سیاہ علم تھا جس کا نام عقاب تھا، اور بھی زرد و سفید علم تھے،

آثار متبرکہ

(ان متروکات کے علاوہ بعض یادگاریں بھی تھیں، جو لوگوں نے تبرکاً اپنے پاس رکھ چھوڑی تھیں، حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے عقیدتمندوں کو موے مبارک عطا فرمائے تھے، جو زیادہ تر حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کے ہاتھ آئے تھے،[2] حضرت انسؓ بن مالک کے پاس بھی موے مبارک تھے،[3] انکے پاس دو چیزیں اور تھیں، نعلین مبارک اور ایک لکڑی کا ٹوٹا ہوا پیالہ جو چاندی کے تاروں سے

[1] صحیح بخاری کتاب البیوع وکتاب الرہن [2] صحیح مسلم حجۃ الوداع [3] صحیح بخاری کتاب الطہارۃ

جوڑ دیا گیا تھا، ذوالفقار جو حضرت علیؓ کے پاس تھی، ان کے بعد ان کے خاندان میں یادگار رہی، امام حسینؓ کی شہادت کے بعد وہ حضرت علی بن حسینؓ کے ہاتھ آئی بعض صحابہ نے آکر انکی خدمت میں عرض کی کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ یادگار آپسے نہ چھن جائے، اگر مجھے عنایت ہو تو یہ میری جان کے ساتھ رہے، لیکن انھوں نے یہ ایثار گوارا نہ کیا،

حضرت عائشہؓ کے پاس آپکے وہ کپڑے تھے جن میں آپنے انتقال فرمایا تھا[۱]، استحقاق خلافت کی بنا پر خاتم (مہر) اور عصائے مبارک جن کا احادیث میں ذکر ہے، پہلے حضرت ابوبکرؓ پھر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے قبضہ میں آئے لیکن ان ہی کے عہد میں یہ دونوں چیزیں ضائع گئیں، انگوٹھی تو حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے ایک کنوئیں میں گر گئی، اور عصائے مبارک کو جہجاہ غفاری[۲] نے توڑ ڈالا،

(امام بخاری نے ان آثار مبارکہ کے ذکر کے لیے ایک خاص باب باندھا ہے)

مسکن مبارک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کمسن تھے کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اپنے دادا اور چچا کے گھروں میں پرورش پائی، اور یہیں سن رشد کو پہنچے پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ سے شادی کی، یہ تیقن طور پر نہیں معلوم کہ اسکے بعد آپنے اپنے موروثی مکان میں اقامت فرمائی یا حضرت خدیجہؓ ہی کے گھر رہے لیکن آپکے حصہ کا ایک پدری مکان مکہ میں موجود تھا جس پر عقیل نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد اور حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی تھے، اور اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، قبضہ کر لیا تھا چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر جب آپ مکہ تشریف لائے تو لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ!

---

[۱] (ان تمام آثار مذکورہ بالا کا ذکر صحیح بخاری کتاب الخمس میں ہے۔ خاتم کا ذکر کتاب الخمس کے علاوہ بخاری کتاب اللباس میں ہے، عصائے مبارک کا حال فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۱۴۰ سے ماخوذ ہے) س

Marfat.com

آپ کہاں قیام فرمائیں گے؟ کیا اپنے دولتخانہ پر ٹھہریں گے؟ آپ نے فرمایا عقیل نے ہمارے لیے گھر کہاں چھوڑا ہے؟[1]

مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے بعد چھ مہینے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب انصاری کے گھر قیام فرما رہے، اس اثنا میں آپ تنہا تھے، اہل و عیال مکہ ہی میں تھے جب آپ نے مسجد نبوی کی بنیاد ڈالی تو اسی کے اطراف میں چھوٹے چھوٹے حجرے تیار فرمائے، اور اسوقت آپ نے آدمی بھیجکر مکہ سے اہل و عیال کو بلوایا اور ان ہی حجروں میں اتارا،[2]

آخر ایام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نو بیویاں تھیں، اور الگ الگ حجروں میں رہتی تھیں، جن میں نہ صحن تھا، نہ دالان تھے، نہ ضرورت کے الگ الگ کمرے تھے، ہر حجرہ کی وسعت عموماً چھ سات ہاتھ سے زیادہ نہ تھی، دیواریں مٹی کی تھیں جو اسقدر کمزور تھیں کہ ان میں شگاف پڑ گیا تھا، ان سے اندر دھوپ آتی تھی، چھت کھجور کی شاخوں اور پتیوں سے چھائی تھی، بارش سے بچنے کے لیے بال کے کمبل لپیٹ دیے جاتے تھے، بلندی اتنی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو ہاتھ سے چھو سکتا تھا، گھر کے دروازوں پر پردہ یا ایک پٹ کا کواڑ ہوتا تھا،[3]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ باری باری سے ایک ایک شب ایک ایک حجرہ میں بسر فرماتے تھے، دن کو عموماً اصحاب کی مجلس میں مسجد میں تشریف رکھتے، جو گویا ان حجروں کا صحن یا گھر کی فرو نشستگاہ تھی،

ان حجروں کے علاوہ ایک بالاخانہ بھی تھا جس کو احادیث میں "مشربہ" کہا گیا ہے، ۹ھ میں جب آپ نے ایلاء کیا تھا، اور نیز گھوڑے پر سے گر کے چوٹ کھائی تھی، تو ایک مہینہ اسی پر اقامت فرمائی تھی،[4]

---

(۱) بخاری فتح مکہ (۲) ابن سعد) (۳) یہ پوری تفصیل ادب المفرد بخاری باب التطاول فی البنیان و البناء میں ہے) (۴) ابوداؤد، باب امامۃ القاعد)

Marfat.com

اس بالاخانہ پر سامان آرایش کیا تھا، ایک چٹائی کا بستر، چمڑے کا ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، اور ادھر ادھر چند کھالیں لٹکی ہوئی تھیں[1]،

کاشانۂ نبوت گو انوار الٰہی کا مظہر تھا، تاہم اس میں رات کو چراغ تک نہیں ہوتا تھا[2]، گھر کی دنیاوی اور ظاہری آرایش بھی پسند خاطر نہ تھی، ایک بار حضرت عائشہؓ نے دیواروں پر دھاری دار رنگین کپڑے منڈھے تو آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا ہم کو اینٹ اور پتھر کو لباس پہنانے کے لیے مال نہیں دیا گیا ہے[3]،

یہ حجرہ ہائے مبارک آپ کی وفات کے بعد ازواج مطہراتؓ کے قبضہ میں رہے، ان میں جب کسی کا انتقال ہوجاتا تو وہ حجرہ ان کے اعزہ کی ملکیت میں چلا جاتا، جن سے حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اکثر حجروں کو خرید لیا تھا[4]،

حضرت عمرؓ کے عہد تک یہ تمام حجرے اپنے حال پر قائم رہے، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بعض حجرے توڑ کر مسجد نبوی میں داخل کر لیے گئے، تاہم ولید بن عبدالملک کے زمانہ تک بہت سے حجرے باقی تھے، ۸۸ھ میں جب حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز مدینہ کے والی تھے، تمام حجرے بجز حجرۂ عائشہ کے کہ وہ مدفن نبوی ہے، توڑ کر مسجد نبوی میں ملا دیئے گئے، جس دن یہ حجرے ٹوٹے ہیں تمام مدینہ میں کہرام مچا ہوا تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور یادگار مٹ گئی[5]،

دایہ | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ترکہ والد سے ملا تھا، اس میں ایک حبشیہ کنیز بھی تھیں جنکا نام ام ایمن تھا،

---

(۱) صحیح بخاری ص ۷۳۰ باب ماکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتجوز من اللباس والبسط [2] صحیح بخاری جلد ۱ ص ۳، باب تطوع خلف المراۃ

[3] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۲۱۱ کتاب اللباس باب فی الصور [4] ابن سعد جزء نسا، [5] ابن سعد جزء ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انّا یا دایہ وہی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک زندہ رہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ان کو ماں کہکر پکارتے تھے، اور جب ان کو دیکھتے تو فرمایا کرتے کہ اب یہی میرے خاندان کی یادگار رہ گئی ہیں"۔ جب آپ نے حضرت خدیجہؓ سے عقد کیا تو ان کو آزاد کر کے حضرت زیدؓ سے جو آپ کے متبنّی اور محبوب خاص اور حضرت خدیجہؓ کے غلام تھے، شادی کر دی، اسامہؓ ان ہی کے بطن سے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح کا واقعہ جو کتابوں میں منقول ہے کہ ایک عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک اونٹ مانگا، آپ نے فرمایا میں اونٹ کا بچہ دونگا، بولی کہ بچہ لیکر کیا کرونگی، آپ نے فرمایا کہ "جتنے اونٹ ہیں، اونٹ کے بچے ہی ہوتے ہیں"۔ ان ہی کا واقعہ ہے۔

یہ اکثر غزوات میں شریک رہیں، جنگ احد میں سپاہیوں کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں، جنگ خیبر میں بھی شریک تھیں۔[۲]

خدام خاص | صحابہ میں سے بعض عقیدت مند ایسے تھے، جو دنیا کے سب کام کاج چھوڑ کر ہمہ وقت خدمت اقدس میں حاضر رہتے، اور خاص خاص کام انجام دیتے، ان کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، مشہور صحابی ہیں، فقہ حنفی کے بانی اول گویا وہی ہیں، امام ابوحنیفہ کی فقہ کا سلسلہ ان ہی کی روایات اور استنباطات پر منتہی ہوتا ہے، مکہ معظمہ میں قرآن مجید کی اشاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانہ میں ان ہی نے کی، ستر سورتیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن کر یاد کی تھیں،

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار بھی تھے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں جاتے تو خوابگاہ

---

[۱] صحیح مسلم باب رد المہاجرین الی الانصار منائحہم [۲] یہ تمام حالات طبقات ابن سعد جزء ثامن تذکرہ ام ایمن سے ماخوذ ہیں

Marfat.com

وضو اور مسواک کا اہتمام ان ہی کے متعلق ہوتا جب آپ مجلس سے اٹھتے تو جوتیاں پہناتے، راہ میں آگے آگے عصا لیکر چلتے جب آپ کہیں کسی مجلس میں جا کر بیٹھتے تو نعلین مبارک اتار کر بغل میں رکھ لیتے، پھر اٹھنے کے وقت سامنے لاکر رکھ دیتے، جلوت وخلوت میں ساتھ رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات کا نمونہ بن گئے تھے،[1]

۲۔ حضرت بلالؓ۔ دنیا ان کو مؤذن کے لقب سے جانتی ہے (یہ حبشی نژاد غلام تھے، مکہ میں ایمان لائے تھے، اور جس جوش وخروش سے ایمان لائے تھے، اس کا مختصر ذکر آغاز کتاب میں گذر چکا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے ان کو خرید کر آزاد کرادیا تھا، اس وقت سے برابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے) آپ کا خانگی انتظام ان ہی کے سپرد تھا، بازار سے سودا سلف لانا، قرض وام لینا، پھر ادا کرنا، مہمانوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا، یہ تمام باتیں ان ہی سے متعلق تھیں،[2]

۳۔ حضرت انسؓ بن مالک بھی آپ کے خادم خاص تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو وہ نہایت کمسن تھے، ان کی ماں خدمت اقدس میں ان کو لائیں اور عرض کی کہ "یا رسول اللہ! یہ میرا بیٹا ہے، لائی ہوں کہ خدمت گذاری کرے"[3]

حضرت انسؓ نے دس برس تک آپ کی خدمت کی، لوگوں کے پاس آنا جانا، چھوٹے چھوٹے کام کرنا، وضو کا پانی لانا، ان کے فرائض تھے، چونکہ ابھی کمسن تھے، ان سے کام بن نہیں آتے تھے لیکن آپ نے ان سے کبھی بازپرس نہ فرمائی[4])

---

[1] یہ پوری تفصیل طبقات ابن سعد میں ہے (دیکھو بخاری باب مناقب عبداللہ بن مسعود میں بھی یہ مذکور ہے، [2] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۷۰ باب قبول ہدایا المشرکین [3] صحیح مسلم فضائل انسؓ [4] ابوداؤد کتاب الادب)

شمائل

شکل و لباس و طعام و مذاقِ طبیعت

حلیۂ اقدس آپ میانہ قد اور موزوں اندام تھے، رنگ سفید سرخ تھا، پیشانی چوڑی اور ابرو پیوستہ تھے، بینی مبارک درازی مائل تھی، چہرہ ہلکا یعنی بہت پر گوشت نہ تھا، دہانہ کشادہ تھا، دندانِ مبارک بہت پیوستہ نہ تھے، گردن اونچی، سر بڑا، اور سینہ کشادہ تھا، اور فراخ تھا، سر کے بال نہ بہت پیچیدہ تھے، نہ بالکل سیدھے تھے، ریش مبارک گھنی تھی، چہرا کھڑا کھڑا تھا، آنکھیں سیاہ و سرگیں اور پلکیں بڑی بڑی تھیں، شانے پر گوشت اور مونڈھوں کی ہڈیاں بڑی تھیں، سینۂ مبارک میں ناف تک بالوں کی ہلکی تحریر تھی، شانوں اور کلائیوں پر بال تھے، ہتھیلیاں پر گوشت اور چوڑی، کلائیاں لمبی اور پاؤں کی ایڑیاں نازک اور ہلکی تھیں، پاؤں کے تلوے بیچ سے ذرا خالی تھے، نیچے سے پانی نکل جاتا تھا۔[1]

(صحابہ پر آپ کے حسن و خوبروئی کا بہت اثر پڑتا تھا، حضرت عبداللہ بن سلام جو پہلے یہودی تھے، پہلے پہل جب چہرۂ اقدس پر ان کی نظر پڑی ہے، تو بولے "خدا کی قسم یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں"[2]، جابر بن سمرہ ایک صحابی ہیں، ان سے کسی نے پوچھا آپ کا چہرہ تلوار سا چمکتا تھا؟ بولے "نہیں ماہ و خورشید کی طرح"[3]، یہی صحابی روایت کرتے ہیں کہ ایک شب کو جب

---

(۱) یہ حلیہ بتفصیل شمائل ترمذی و مسند ابن حنبل جلد اص ۱۱۶ و ۱۱۷ میں اور مختصراً بخاری و مسلم باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ہے۔ (۲) ترمذی ابواب الزہد صفحہ ۴۰۹۔ (۳) مشکوٰۃ باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بحوالہ مسلم)

Marfat.com

مطلق ابر نہ تھا اور چاند نکلا تھا، میں کبھی آپ کو دیکھتا، کبھی چاند کو دیکھتا تھا تو آپ مجھے چاند سے زیادہ خوبرو معلوم ہوتے تھے[۱]، حضرت براءؓ صحابی کہتے ہیں کہ میں نے کسی جوڑے والے کو سرخ (خط) کے لباس میں آپ سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھا،[۲]

آپ کے پسینہ میں ایک طرح کی خوشبو تھی[۳]، چہرۂ مبارک پر پسینہ کے قطرے موتی کی طرح ڈھلکتے تھے[۴]، جسم مبارک کی جلد نہایت نرم تھی، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ کا رنگ نہایت کھلتا تھا، آپ کا پسینہ موتی معلوم ہوتا تھا، میں نے دیبا اور حریر بھی آپ کی جلد سے زیادہ نرم نہیں دیکھے، اور مشک و عنبر میں بھی آپ کے بدن سے زیادہ خوشبو نہ تھی،[۵]

(عام طور پر مشہور ہے کہ آپ کے سایہ نہ تھا لیکن اس کی کوئی سند نہیں ہے)

مہر نبوت

شانوں کے بیچ میں کبوتر کے انڈے کے برابر خاتم نبوت تھی، یہ بظاہر سرخ ابھرا ہوا گوشت سا تھا (صحیح مسلم اور) شمائل ترمذی میں حضرت جابرؓ بن سمرہ سے روایت ہے،

رایت الخاتم بین کتفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غدۃ حمراء مثل بیضۃ الحمامۃ	میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں شانوں کے بیچ میں خاتم کو دیکھا جو کبوتر کے انڈے کے برابر سرخ غدہ تھا،

(لیکن ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیں شانہ کے پاس چند مہاسوں کی مجموعی ترکیب سے ایک مستدیر شکل پیدا ہوگئی تھی، اسی کو مہر نبوت کہتے تھے[۶]، تمام صحیح روایات کی تطبیق سے

---

(۱) مشکوٰۃ باب مذکور بحوالہ ترمذی و دارمی (۲) صحیح مسلم باب مذکور (۳) ایضاً (۴) بخاری واقعہ افک (۵) مشکوٰۃ باب مذکور بحوالہ بخاری و مسلم (۶) صحیح مسلم (باب اثبات النبوۃ) مشہور ہے کہ پشت پر جو خاتم نبوت تھی اس میں گویا قدرتی طور پر کلمۂ طیبہ تحریر تھا، یہ بالکل بے سند بات ہے، احادیث سے اس کا کوئی ثبوت نہیں، محدثین نے تصریح کر دی ہے کہ ان میں سے بعض روایتیں باطل اور بہت سی ضعیف ہیں۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں لم یثبت منہا شیٔ (زرقانی بر مواہب جلد اول ص ۱۴۸) البتہ کلمہ اس نقرئی خاتم میں منقوش تھا جو انگشت مبارک میں خطوط پر مہر کرنے کی غرض سے آپ پہنا کرتے تھے، لوگوں نے غلطی سے اس کو خاتم نبوت کی طرف منسوب کر دیا، (س)

Marfat.com

یہ ثابت ہوتا ہے کہ دونوں شانوں کے درمیان ایک ذرا ابھرا ہوا گوشت کا حصہ تھا جس پہ تل تھے، اور بال اُگے ہوئے تھے)

موئے مبارک

سر کے بال اکثر شانے تک لٹکے رہتے تھے، فتح مکہ میں لوگوں نے دیکھا تو شانوں پہ چار گیسو پڑے تھے،

مشرکین عرب بالوں میں مانگ نکالتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ کفار کے مقابلہ میں اہل کتاب کی موافقت پسند کرتے تھے، ابتدا میں آپ بھی اہل کتاب کی طرح بال چھوٹے ہوئے رکھتے تھے، پھر مانگ نکالنے لگے، یہ شمائل ترمذی کی روایت ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جب مشرکین کا وجود نہ رہا تو انکی مشابہت کا احتمال بھی جاتا رہا، اخیر زمانہ میں مانگ نکالنے لگے (بالوں میں اکثر تیل ڈالتے تھے، اور ایک دن بیچ کنگھی کرتے تھے، ریش مبارک میں گنتی کے چند بال سفید ہونے پائے تھے)

رفتار

رفتار بہت تیز تھی، چلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ڈھلوان زمین پر اتر رہے ہیں ضعیف روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ تھا یعنی زمین پر جسم اقدس کا سایہ نہیں پڑتا تھا لیکن محدثین کے نزدیک یہ روایتیں صحت سے خالی اور ناقابل اعتبار ہیں،

گفتگو

گفتگو اور خندہ تبسم

گفتگو نہایت شیریں اور دلآویز تھی، بہت ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے تھے، ایک ایک فقرہ الگ ہوتا کہ سننے والوں کو یاد رہ جاتا معمول تھا کہ ایک ایک بات کو تین تین دفعہ فرماتے جس بات پر زور دینا ہوتا بار بار اس کا اعادہ فرماتے، حالت گفتگو میں اکثر نگاہ آسمان کی طرف ہوتی تھی، آواز بلند تھی، حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

Marfat.com

کعبہ میں قرآن پڑھتے تھے، اور ہم لوگ گھروں میں پلنگوں پر لیٹے لیٹے سنتے تھے،[1]

حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہر سے ایک صاحبزادے تھے، جن کا نام ہند تھا، اور وہ نہایت خوش تقریر تھے جس چیز کا بیان کرتے اس کی تصویر کھینچ دیتے، حضرت امام حسن علیہ السلام نے ان سے پوچھا "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیونکر تقریر فرماتے تھے" انھوں نے کہا "آپ ہمیشہ متفکر رہتے تھے، اکثر چپ رہتے اور بے ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے، ایک ایک فقرہ الگ اور صاف اور واضح ہوتا تھا، ہات سے اشارہ کرتے تو پورا ہاتھ اٹھاتے، کسی بات پر تعجب کرتے تو ہتھیلی کا رخ پلٹ دیتے، تقریر میں کبھی ہات پر ہات مارتے، بات کرتے کرتے جب کبھی مسرت

خندہ تبسم

کی کیفیت طاری ہوتی تو آنکھیں نیچی ہو جاتیں، ہنستے بہت کم تھے، ہنسی آتی تو مسکرا دیتے، اور یہی آپ کی ہنسی تھی[2]، جریرؓ بن عبد اللہ کا بیان ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھکو دیکھا ہو اور مسکرا نہ دیا ہو، روایتوں میں آیا ہے کہ کبھی کبھی جب آپ کو زیادہ ہنسی آتی تو ڈاڑھ کے دانت (نواجذ) نظر آنے لگتے، لیکن ابن القیم وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ طرز ادا کا مبالغہ ہے، ورنہ کبھی آپ اس زور سے نہیں ہنسے کہ نواجذ نظر آئیں،

عام لباس

لباس | لباس کے متعلق کسی قسم کا التزام نہ تھا، عام لباس چادر، قمیص، اور تہمد تھی، پاجامہ کبھی استعمال نہیں فرمایا، لیکن امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے کہ آپ نے

پاجامہ

منا کے بازار میں پاجامہ خریدا تھا، حافظ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ

موزہ

استعمال بھی فرمایا ہوگا، موزوں کی عادت نہ تھی، لیکن نجاشی نے جو سیاہ موزے بھیجے تھے،

---

[1] ابن ماجہ باب ما جاء فی القراۃ فی صلوۃ اللیل [2] شمائل ترمذی

Marfat.com

عمامہ — آپ نے استعمال فرمائے۔ بظاہر روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چرمی تھے، عمامہ کا شملہ کبھی دوش مبارک پر، کبھی دونوں شانوں کے بیچ میں پڑا رہتا تھا۔ کبھی تحت الحنک کے طور پر لپیٹ لیتے تھے۔ عمامہ اکثر سیاہ رنگ کا ہوتا تھا، عمامہ کے نیچے سر سے لپٹی ہوئی ٹوپی ہوتی تھی، اونچی ٹوپی کبھی استعمال نہیں فرمائی، (عمامہ کے نیچے ٹوپی کا التزام تھا، فرماتے تھے کہ

ٹوپی — ہم میں اور مشرکین میں یہی امتیاز ہے کہ ہم ٹوپیوں پر عمامہ باندھتے ہیں[۱])

چادر — لباس میں سب سے زیادہ یمن کی دھاری دار چادریں پسند تھیں جنکو عربی میں حبرہ کہتے ہیں[۲]

عبا — بعض اوقات شامی عبا استعمال کی ہے جس کی آستین اسقدر تنگ تھی کہ وضو کرنا چاہا تو چڑھ نہ سکی، اور ہاتھ کو آستین سے نکالنا پڑا۔ نوشیروانی قبا بھی جس کی جیب اور آستینوں پر دیبا کی سنجاف تھی استعمال کی ہے۔

کمبل — جب انتقال ہوا تو حضرت عائشہؓ نے کمبل جس میں پیوند لگے ہوئے تھے، اور گاڑھے کی ایک تہمد نکال کر دکھائی کہ ان ہی کپڑوں میں آپ نے وفات پائی،

حلہ حمرا — روایتوں میں آیا ہو کہ آپ نے حلہ حمرا بھی استعمال کیا ہو حمرا کے معنی سرخ کے ہیں، اسلیے اکثر محدثین نے وہی عام معنی لیے ہیں، لیکن ابن القیم نے اصرار کیساتھ دعویٰ کیا ہو کہ سرخ لباس آپ نے کبھی نہیں پہنا اور نہ مردوں کیلیے اسکو جائز رکھتے تھے، حلہ حمرا ایک قسم کی یمنی چادر تھی، جسمیں سرخ دھاریاں بھی ہوتی تھیں، اس بنا پر اسکو حمرا کہتے تھے، اور یہی کبھی کبھی استعمال کرتے تھے، عام محدثین کہتے ہیں کہ اس تخصیص کا کوئی ثبوت نہیں، زرقانی میں یہ بحث نہایت تفصیل سے مذکور ہے مختلف روایتوں سے ثابت ہوتا ہو کہ آپ نے سیاہ

[۱] ابوداؤد کتاب اللباس [۲] صحیح بخاری باب اللباس

Marfat.com

سرخ، سبز، زعفرانی، ہر رنگ کے کپڑے پہنے ہیں لیکن سفید رنگ بہت مرغوب تھا[۱] بعض اوقات اس قسم کی چادر بھی استعمال فرمائی ہے جس پر کجاوے کی شکل بنی ہوئی تھی[۲]

نعلین

نعلین مبارک اس طرز کے تھے جس کو اس ملک میں چپل کہتے ہیں، یہ صرف ایک تلا ہوتا تھا جس میں تسمے لگے ہوتے تھے، بچھونا چمڑے کا گدا ہوتا تھا جس میں روئی کے بجائے کھجور کے پتے ہوتے تھے۔ چارپائی بان کی بنی ہوتی تھی جس سے اکثر جسم پر بدھیاں پڑ جاتی تھیں،

انگوٹھی

جب آپ نے نجاشی اور قیصر روم کو خط لکھنا چاہا تو لوگوں نے عرض کی کہ سلاطین مہر کے بغیر کوئی تحریر قبول نہیں کرتے، اس بنا پر چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس میں اوپر تلے تین سطروں میں محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا بعض صحابہ سے روایت ہے کہ آپ صرف مہر لگانے کے وقت اس کا استعمال فرماتے تھے اور دہنے ہاتھ کی انگلی میں پہنتے تھے،

خود و زرہ

لڑائیوں میں زرہ اور مغفر بھی پہنتے تھے۔ اُحد کے معرکہ میں جسم مبارک پر دو زرہیں تھیں، تلوار کا قبضہ کبھی چاندی کا بھی ہوتا تھا۔

عام غذا

غذا اور طریقۂ طعام اگرچہ ایثار اور قناعت کی وجہ سے لذیذ اور پرتکلف کھانے کبھی نصیب نہ ہوتے، یہاں تک کہ (جیسا کہ صحیح بخاری کتاب الاطعمہ میں ہے) تمام عمر آپ نے چپاتی کی صورت تک نہیں دیکھی، تاہم بعض کھانے آپ کو نہایت مرغوب تھے، سرکہ، شہد، حلوا، روغن زیتون، کدو خصوصیت کے ساتھ پسند تھے، سالن میں کدو ہوتا تو پیالہ میں اسکی قاشیں انگلیوں سے ڈھونڈھتے، ایک دفعہ حضرت ام ہانیؓ کے گھر تشریف لے گئے اور پوچھا کہ کچھ کھانے کو ہے،

مرغوبہ کھانے

بولیں کہ سرکہ ہے، فرمایا کہ جس گھر میں سرکہ ہو اسکو نادار نہیں کہہ سکتے، عرب میں ایک کھانا ہوتا ہے جس کو حیس کہتے ہیں، یہ گھی میں پنیر اور کھجور ڈال کر پکایا جاتا ہے، آپ کو یہ بہت مرغوب تھا،

(۱) ابوداؤد جلد ۲ کتاب [illegible] (۲) ابوداؤد جلد ۲ کتاب اللباس [illegible]

ایک دفعہ حضرت امام حسن علیہ السلام اور عبداللہ بن عباسؓ سلمی کے پاس گئے اور کہا کہ آج ہم کو وہ کھانا پکا کر کھلاؤ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت مرغوب تھا، بولیں تم کو وہ کیا پسند آئیگا؟ لوگوں نے اصرار کیا تو انھوں نے جو کا آٹا پیسکر ہانڈی میں چڑھادیا، اوپر سے روغن زیتون اور زیرہ اور کالی مرچیں ڈالدیں، پک گیا تو لوگوں کے سامنے رکھا اور کہا کہ یہ آپ کی محبوب ترین غذا تھی،

گوشت کے اقسام میں سے آپنے دُنبہ، مرغ، بٹیر (حباری) اونٹ، بکری، بھیڑ، گورخر، خرگوش، مچھلی کا گوشت کھایا ہے، دست کا گوشت بہت پسند تھا، شمائل ترمذی میں حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ دست کا گوشت فی نفسہٖ آپ کو چنداں مرغوب نہ تھا، بات یہ تھی کہ کبھی کئی دن تک گوشت نصیب ہی نہیں ہوتا تھا، اسلیے جب کبھی ملجاتا تو آپ چاہتے تھے کہ جلد پک کر تیار ہوجائے، دست کا گوشت جلد گل جاتا ہے، اسلیے آپ اسی کی فرمایش کرتے لیکن متعدد روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یوں بھی آپکو یہ گوشت پسند تھا،

حضرت صفیہؓ کے نکاح میں جب آپنے ولیمہ کا کھانا کھلایا تھا تو صرف کھجور اور ستو تھا، تربوز کو کھجور کے ساتھ ملاکر کھاتے تھے، پتلی لکڑیاں پسند تھیں، ایک دفعہ معوذ بن عفرا کی صاحبزادی نے کھجور اور پتلی لکڑیاں خدمت میں پیش کیں (بعض اوقات روٹی کے ساتھ بھی کھجور تناول فرمائی ہے)

پانی، دودھ، شربت ٹھنڈا پانی نہایت مرغوب تھا، دودھ کبھی خالص نوش فرماتے کبھی اس میں پانی ملادیتے، کشمش، کھجور، انگور پانی میں بھگودیا جاتا، کچھ دیر کے بعد وہ پانی نوش جان فرماتے، کھانے کے ظروف میں ایک لکڑی کا پیالہ تھا جو لوہے کے تاروں سے بندھا ہوا تھا، روایت میں اسی قدر ہے، قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹوٹ گیا ہوگا، اس لیے تاروں سے جوڑدیا ہوگا،

معمولات طعام دسترخوان پر جو کھانا آتا، اگر ناپسند ہوتا تو اس میں ہاتھ نہ ڈالتے لیکن مکروہ نہ کہتے جو سالن سامنے

Marfat.com

ہوتا اسی میں ہاتھ ڈالتے، ادھر ادھر ہاتھ نہ بڑھاتے اور اس سے اوروں کو بھی منع فرماتے، کھانا کبھی مسند یا تکیہ پر ٹیک کر نہ کھاتے اور اسکو ناپسند فرماتے میز یا خوان پر کبھی نہیں کھایا، خوان زمین سے کسی قدر اونچی میز ہوتی تھی عجم اسی پر کھانا رکھ کر کھاتے تھے چونکہ یہ بھی فخر اور امتیاز کی علامت تھی یعنی امراء اور اہل جاہ کے ساتھ مخصوص تھی، اس لیے آپنے اس پر کھانا پسند نہیں فرمایا، کھانا صرف انگلیوں سے کھاتے[۱]. گوشت کو کبھی کبھی چھری سے کاٹ کر بھی کھاتے، صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے[۲]، ابوداؤد میں ایک حدیث ہے کہ گوشت چھری سے نہ کاٹو کیونکہ یہ اہل عجم کا شعار ہے لیکن ابوداؤد[۳] نے خود اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اس حدیث کے راوی ابو معشر نجیح ہیں جنکی نسبت بخاری نے لکھا ہے کہ وہ منکر الحدیث ہیں، اور ان ہی منکرات میں حدیث مذکور بھی ہے[۴].

خوش لباسی

خوش لباسی | گو تکلف اور جاہ پسندی سے آپ کو نفرت تھی لیکن کبھی کبھی آپ نہایت قیمتی اور خوشنما لباس بھی زیب تن فرماتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ جب حروریہ کے پاس سفیر بنا کر گئے تو وہ یمن کے نہایت قیمتی کپڑے پہنکر گئے، حروریہ نے کہا، کیوں ابن عباسؓ! یہ کیا لباس ہے؟ بولے کہ تم اس پر معترض ہو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہتر سے بہتر کپڑوں میں دیکھا ہے[۵].

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نہایت متقشف تھے، ایک دفعہ بازار سے ایک شامی حلہ مول لیا، گھر پر آکر دیکھا تو اسمیں رنگ دھاریاں تھیں، جاکر واپس آئے، کسی نے یہ واقعہ حضرت اسماء (حضرت عائشہؓ کی بہن) سے کہا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ منگوا کر لوگوں کو دکھایا جسکی جیبوں اور آستینوں اور دامن پر دیبا کی سنجاف تھی[۶]،

---

[۱] غذا کے متعلق زیادہ تر واقعات شمائل ترمذی اور زاد المعاد ابن قیم سے ماخوذ ہیں [۲] کتاب الاطعمہ باب القطع بالسکین [۳] قسطلانی شرح صحیح بخاری جلد ۸ ص ۲۵۲ مصر [۴] ابوداؤد کتاب اللباس باب لبس الصوف والشعر [۵] ابوداؤد باب الرخصۃ فی العلم وخط الحریر

(بعض امراء و سلاطین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیش قیمت کپڑے ہدیہ بھیجے، آپ نے قبول فرمایا، اور کبھی زیب تن کیے)

مرغوب رنگ

مرغوب رنگ رنگوں میں زرد رنگ بہت پسند تھا۔ حدیثوں میں آیا ہے کہ کبھی کبھی آپ تمام کپڑے یہاں تک کہ عمامہ بھی اسی رنگ کا رنگوا کر پہنتے تھے[۱]، (سفید رنگ بھی بہت پسند تھا، فرماتے تھے کہ یہ رنگ سب رنگوں میں اچھا ہے)

نا مرغوب رنگ

نا مرغوب رنگ سرخ لباس ناپسند فرماتے تھے، ایک دفعہ عبد اللہ بن عمرؓ سرخ کپڑے پہنکر آئے، تو فرمایا یہ کیا لباس ہے، عبد اللہؓ نے جاکر آگ میں ڈالدیا، آپ نے سنا تو فرمایا کہ جلانے کی ضرورت نہ تھی کسی عورت کو دیدیا ہوتا[۲]،

عرب میں سرخ رنگ کی مٹی ہوتی ہے جس کو مغرہ کہتے ہیں، اس سے کپڑے رنگا کرتے تھے، یہ رنگ آپ کو نہایت ناپسند تھا، ایک دفعہ حضرت زینبؓ اس سے کپڑے رنگ رہی تھیں، آپ گھر میں آئے اور دیکھا تو واپس چلے گئے حضرت زینبؓ سمجھ گئیں کپڑے دھوڈالے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ تشریف لائے اور جب دیکھ لیا کہ اس رنگ کی کوئی چیز نہیں تب گھر میں قدم رکھا، ایک دن ایک شخص سرخ پوشاک پہنکر آیا، تو آپ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا، ایک دفعہ صحابہ نے سواری کے اونٹوں پر سرخ رنگ کی چادریں ڈالدی تھیں، آپ نے فرمایا میں یہ دیکھنا نہیں چاہتا کہ یہ رنگ تم پر چھا جائے، فوراً صحابہ نہایت تیزی سے دوڑے اور چادریں اتار کر پھینکدیں[۳]۔

خوشبو

خوشبو کا استعمال خوشبو آپ کو بہت پسند تھی، کوئی خوشبو کی چیز ہدیۃً بھیجتا تو کبھی رد نہ فرماتے، ایک خاص

---

[۱] ابوداؤد باب فی المصبوغ [۲] ابوداؤد باب فی الحمرۃ [۳] ابوداؤد و یہ تمام روایتیں ابوداؤد کتاب اللباس میں ہیں،

Marfat.com

قسم کی خوشبو یا عطر ہوتا ہے جس کو سکّ کہتے ہیں، یہ ہمیشہ آپ کے استعمال میں رہتا تھا، صحابہ کہتے ہیں کہ جس گلی کوچہ سے آپ نکلجاتے وہ معطّر ہو جاتا، اکثر فرمایا کرتے مردوں کی خوشبو ایسی ہونی چاہیے کہ خوشبو پھیلے اور رنگ نظر نہ آئے، اور عورتوں کی ایسی کہ خوشبو نہ پھیلے اور رنگ نظر آئے[1]،

نظافت پسندی

نفاست پسندی مزاج میں لطافت تھی، ایک شخص کو میلے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوتا کہ کپڑے دھولیا کرے[2]۔

ایک دفعہ ایک شخص خراب کپڑے پہنے ہوئے خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے پوچھا تم کو کچھ مقدور ہے؟ بولا ہاں! ارشاد ہوا کہ خدا نے نعمت دی ہے تو صورت سے بھی اس کا اظہار ہونا چاہیے[3]،

عرب تہذیب و تمدن سے کم آشنا تھے، مسجد میں آتے تو عین نماز میں دیواروں پر یا سامنے[4] زمین پر تھوک دیتے، آپ اس کو نہایت ناپسند فرماتے، دیواروں پر تھوک کے دھبوں کو خود چھڑی کی نوک سے کھرچ کر مٹاتے، ایک دفعہ تھوک کا دھبہ دیوار پر دیکھا تو اس قدر غصہ آیا کہ چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا، ایک انصاری عورت نے دھبہ کو مٹایا، اور اس جگہ خوشبو لاکر ملی آپ نہایت خوش ہوئے اور اس کی تحسین کی[5]،

کبھی کبھی مجلس عالی میں خوشبو کی انگیٹھیاں جلائی جاتیں جن میں اگر اور کبھی کبھی کافور ہوتا[6]،

ایک دفعہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ خضاب لگانا کیسا ہے، بولیں کچھ مضائقہ

---

[1] شمائل ترمذی [2] ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی غسل الثوب [3] ابوداؤد کتاب اللباس [4] نسائی کتاب المساجد [5] نسائی صفحہ ۷۲، مطبوعہ نظامی باب البخور

Marfat.com

نہیں لیکن میں اس لیے ناپسند کرتی ہوں کہ میرے حبیب (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو خاکی بو ناگوار تھی[1]
اکثر مشک اور عنبر کا استعمال فرماتے،

ایک شخص کے بال پریشان دیکھے تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ بالوں کو درست کرلے[2]، ایک دفعہ اون کی چادر اوڑھی، پسینہ آیا تو اتار کر رکھدی،[3]

ایک دن لوگ مسجد نبویؐ میں آئے، چونکہ مسجد تنگ تھی اور کاروباری لوگ میلے کپڑوں میں چلے آئے تھے، پسینہ آیا تو تمام مسجد میں بو پھیل گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نہا کر آتے تو اچھا ہوتا، اسی دن سے غسلِ جمعہ ایک حکم شرعی بن گیا،[4]

مسجد نبویؐ میں جھاڑو دینے کا التزام تھا، ام محجن نام ایک عورت جھاڑو دیا کرتی تھی، ابن ماجہ میں روایت ہے کہ آپ نے حکم دیا کہ مساجد میں بچے اور مجنون نہ جانے پائیں، اور خرید وفروخت نہ ہونے پائے، یہ بھی حکم دیا کہ مساجد میں جمعہ کے دن خوشبو کی انگیٹھیاں جلائی جائیں،

اہل عرب بدویت کے اثر سے نظافت اور صفائی کا نام نہیں جانتے تھے، اس بنا پر اس خاص باب میں آپ کو نہایت اہتمام کرنا پڑا تھا،

عرب کی عادت تھی (اور آج بھی بدویوں میں عموماً پائی جاتی ہے کہ راستہ میں بول و براز کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو نہایت ناپسند فرماتے، اور اس سے منع کرتے تھے، احادیث میں کثرت سے روایتیں موجود ہیں کہ آپ نے ان لوگوں پر لعنت کی ہے جو راستہ میں یا درختوں کے سایہ میں بول و براز کرتے ہیں[5]
عرب کا دستور ہے کہ کاہلی کی وجہ سے کسی برتن میں پیشاب کر لیا کرتے ہیں، اس سے بھی منع فرماتے تھے،

[1] نسائی ص ۹۵، باب کراہیۃ ریح الحناء، [2] ابوداؤد کتاب اللباس [3] ایضاً [4] اس مضمون کی متعدد حدیثیں بخاری (غسل جمعہ) میں باختلاف الفاظ و واقعات مذکور ہیں، [5] ترغیب و ترہیب کتاب الطہارۃ۔

Marfat.com

عرب میں پیشاب کے بعد استنجا کرنے یا پیشاب سے کپڑوں کے بچانے کا مطلق دستور نہ تھا، آپ ایک دفعہ راہ میں جا رہے تھے، دو قبریں نظر آئیں، فرمایا کہ ان میں سے ایک پر اس لیے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ اپنے کپڑوں کو پیشاب سے محفوظ نہیں رکھتا تھا۔[1]

ایک دفعہ مسجد میں تشریف لائے، دیواروں پر جابجا تھوک کے دھبے تھے، آپ کے ہاتھ میں کھجور کی ٹہنی تھی، اس سے کھرچ کھرچ کر تمام دھبے مٹائے، پھر لوگوں کی طرف خطاب کرکے غصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ کیا تم پسند کرتے ہو کہ کوئی شخص تمہارے سامنے آکر تمہارے منہ پر تھوک دے، جب کوئی شخص نماز پڑھتا ہے تو خدا اس کے سامنے اور فرشتے اسکے داہنی جانب ہوتے ہیں، اس لیے انسان کو سامنے یا داہنی جانب تھوکنا نہیں چاہیے۔[2]

ایک صحابی نے عین نماز میں (جبکہ وہ امام نماز تھے) تھوک دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیکھ رہے تھے، فرمایا کہ یہ شخص اب نماز نہ پڑھائے، نماز کے بعد یہ صاحب خدمت اقدس میں آئے اور پوچھا کہ کیا آپ نے یہ حکم دیا ہے؟ فرمایا کہ ہاں تم نے خدا اور پیغمبر کو اذیت دی۔[3]

بودار چیزوں مثلاً پیاز لہسن اور مولی سے نفرت تھی، حکم تھا کہ یہ چیزیں کھا کر لوگ مسجد میں نہ آئیں، بخاری میں حدیث ہے کہ جو شخص پیاز لہسن کھائے وہ ہمارے پاس نہ آئے، اور ہمارے ساتھ نماز نہ پڑھے، زمانہ خلافت میں حضرت عمرؓ نے خطبہ میں کہا کہ تم لوگ پیاز لہسن کھا کر مسجد میں آتے ہو، حالانکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا کہ کوئی شخص یہ چیزیں کھا کر مسجد میں آتا تو آپ حکم دیدیتے کہ مسجد سے نکال کر بقیع میں پہنچا دیا جائے۔[4]

---

[1] صحیح بخاری عذاب القبر [2] ترغیب و ترہیب [3] ایضاً باب البصاق فی المسجد [4] مسلم و نسائی و ابن ماجہ

Marfat.com

سواری

سواری کا شوق | گھوڑے کی سواری آپ کو نہایت مرغوب تھی، (آپ فرمایا کرتے الخیل معقود فی نواصیہا الخیر، گھوڑوں کے علاوہ گدھے، خچر، اونٹ پر آپ نے سواری فرمائی ہے، آپ کے خاص سواری کے گھوڑے کا نام لُحیف تھا، گدھے کا نام عفیر اور خچر کا نام دلدل اور تیہ اور اونٹنیوں کا نام قصوا اور عضباء تھا)

اسپ دوانی

اسپ دوانی | مدینہ سے باہر ایک میدان تھا جس کی سرحد حصباء سے ثنیۃ الوداع تک ۵ میل تھی، یہاں گھوڑ دوڑ کی مشق کرائی جاتی تھی،

گھوڑے جو مشق کے لیے طیار کرائے جاتے تھے، انکی تیاری کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے ان کو خوب دانا گھاس کھلاتے تھے جب موٹے تازے ہو جاتے تو ان کی غذا کم کرنی شروع کرتے اور گھر میں باندھ کر چار جامہ کستے، پسینہ آتا، اور خشک ہوتا، روزانہ یہ عمل جاری رہتا، رفتہ رفتہ جس قدر گوشت چڑھ گیا تھا، خشک ہو کر ہلکا پھلکا چھریرا بدن نکل آتا، یہ مشق چالیس دن میں ختم ہوتی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کا ایک گھوڑا تھا، جس کا نام سبحہ تھا، ایک دفعہ اس کو آپ نے بازی میں دوڑایا، اس نے بازی جیتی تو آپ[1] کو خاص مسرت ہوئی،

گھوڑ دوڑ کا اہتمام حضرت علیؓ کے سپرد تھا، انھوں نے اپنی طرف سے سراقہ بن[2] مالک کو یہ خدمت سپرد کی اور اس کے چند قاعدے مقرر کیے جنکی تفصیل حسب[3] ذیل ہے،

۱۔ گھوڑوں کی صفیں قائم کی جائیں اور تین دفعہ پکار دیا جائے کہ جسکو لگام درست کرنی

---

[1] نسائی ص ۱۰۰، باب حب الخیل [2] دارقطنی جلد ۲ ص ۵۵۲ (کتاب السبق بین الخیل) مسند احمد، اور بیہقی میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے) [3] یہ پوری تفصیل دارقطنی ص ۵۵۳-۵۵۴ (کتاب السبق بین الخیل میں ہے لیکن محدثانہ حیثیت سے یہ روایت ضعیف ہے)

Marfat.com

یا پیچ کو ساتھ رکھنا، یا زین الگ کر دینی ہو الگ کر لے،

۲. جب کوئی آواز نہ آئے تو تین دفعہ تکبیریں کہی جائیں، تیسری تکبیر پر گھوڑے میدان میں ڈال دیے جائیں،

۳. گھوڑے کے کان آگے نکل جائیں تو سمجھ لیا جائیگا کہ وہ آگے نکل گیا،

حضرت علیؓ خود میدان کے انتہائی سرے پر بیٹھ جاتے اور ایک خط کھینچکر دو آدمیوں کو دونوں کناروں پر کھڑا کر دیتے، گھوڑے ان ہی دونوں کے درمیان سے ہو کر نکلتے،

اونٹوں کی دوڑ بھی ہوتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص سواری کا ناقہ عضباء ہمیشہ بازی لیجاتا، ایک دفعہ ایک بدو اونٹ پر سوار آیا، اور مسابقت میں عضباء سے آگے نکل گیا، تمام مسلمانوں کو سخت صدمہ ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا پر حق ہے کہ دنیا کی جو چیز گردن اٹھائے اس کو نیچا دکھائے[1]"

رنگوں میں صندلی، جنگلی اور کمیت بہت پسند تھا[2]، گھوڑوں کی دم کاٹنے سے منع فرمایا کہ مکھی ہانکنے کا مورچھل ہے[3]،

---

[1] (صحیح بخاری و نسائی و دار قطنی و مسند احمد عن انس باب الرہان والسبق) [2] نسائی مطبوعہ نظامی صفحہ ۵۶۷ (باب ما یستحب من شبتہ الخیل [3] کتب سنن کتاب الادب)

معمولات

(ترمذی نے شمائل میں حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوقات کے تین حصے کر دیے تھے، ایک عبادت الٰہی کے لیے، دوسرا عام خلق کیلیے اور تیسرا اپنی ذات کے لیے)

صبح سے شام تک کے معمولات

معمول تھا کہ نماز فجر پڑھ کر (جا نماز پر) آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے، یہاں تک کہ آفتاب اچھی طرح نکل آتا[1] اور یہی وقت دربار نبوت کا ہوتا، لوگ پاس آ آ کر بیٹھتے، اور آپ ان کو مواعظ و نصائح تلقین فرماتے[2])

(اکثر صحابہ سے پوچھتے کہ کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے[3] کسی نے دیکھا ہوتا تو عرض کرتے، آپ اسکی تعبیر بیان فرماتے[3] کبھی خود اپنا خواب بیان فرماتے[4]، اس کے بعد ہر قسم کی گفتگو ہوتی، لوگ جاہلیت کے قصے بیان کرتے، شعر پڑھتے، ہنسی خوشی کی باتیں کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف مسکرا دیتے[5]، اکثر اسی وقت مال غنیمت اور وظائف و خراج وغیرہ کی تقسیم فرماتے[6]،

بعض روایتوں میں ہے کہ جب دن کچھ چڑھ جاتا تو چاشت کی کبھی چار، کبھی آٹھ رکعت نماز ادا فرماتے، گھر جا کر گھر کے دھندے میں مشغول رہتے، پھٹے کپڑوں کو سیتے، جوتا ٹوٹ جاتا تو اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیتے، دودھ دوہتے[7]،

---

[1] صحیح مسلم باب تبسمہ صلعم، و ابوداؤد صفحہ ۱۸۳ [2] جامع ترمذی [3] صحیح مسلم کتاب التعبیر [4] صحیح بخاری کتاب التعبیر
[5] نسائی باب قعود الامام فی مصلاہ [6] بخاری اور حدیث کی کتابوں میں متعدد جزئی واقعات مذکور ہیں،
[7] صحیح بخاری باب مایکون الرجل فی مہنتہ اہلہ و مسند حنبل و مسند عائشہؓ

Marfat.com

نماز عصر پڑھ کر ازواج مطہرات میں سے ایک ایک کے پاس جاتے اور ذرا ذرا دیر ٹھہرتے،
پھر جس کی باری ہوتی، وہیں رات بسر فرماتے، تمام ازواج مطہرات وہیں جمع ہو جاتیں، عشا تک
صحبت رہتی[1]، پھر نماز عشا کے لیے مسجد میں تشریف لیجاتے، اور واپس آکر سو رہتے. ازواج رخصت
ہو جاتیں، نماز عشا کے بعد بات چیت کرنی ناپسند فرماتے[2]۔

خواب | عام معمول یہ تھا کہ آپ اوّل وقت نماز عشا پڑھ کر آرام فرماتے تھے. سوتے وقت التزاماً
قرآن مجید کی کوئی سورہ (بنی اسرائیل، زمر، حدید، حشر، صف، تغابن، جمعہ) پڑھ کر سوتے،
شمائل ترمذی میں ہے کہ آرام فرماتے وقت یہ الفاظ فرماتے.

اللھم باسمک اموت واحیی — خدایا تیرا نام لیکر مرتا ہوں اور زندہ رہتا ہوں

جاگتے تو فرماتے

الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا — اس خدا کا شکر جس نے موت کے بعد زندہ کیا

والیہ النشور — اور اسی کی طرف حشر ہوگا،

آدھی رات یا پہر رات رہے جاگ اٹھتے، مسواک ہمیشہ سرہانے رہتی تھی، اٹھکر پہلے مسواک
فرماتے، پھر وضو کرتے، اور عبادت میں مشغول ہوتے، آپ کی سجدہ گاہ[3] آپ کے سرہانے ہوتی تھی،
ہمیشہ داہنی کروٹ اور دایاں ہاتھ رخسار کے نیچے رکھ کر سوتے لیکن جب کبھی سفر میں
پچھلے پہر منزل پر اتر کر آرام فرماتے تو معمول تھا کہ دایاں ہاتھ اونچا کر کے چہرہ اس پر ٹیک کر سوتے
کہ گہری نیند آجائے، نیند میں کسی قدر خراٹے کی آواز آتی تھی،

نماز

---

[1] صحیح مسلم باب القسم بین الزوجات [2] بخاری صلوٰۃ العشار [3] (یعنی سجدہ کا مقام جہاں بحالت نماز آپ سجدہ کرتے تھے) اس

Marfat.com

بچھونے میں کوئی التزام نہ تھا، کبھی معمولی بستر پر، کبھی کھال پر، کبھی چٹائی پر اور کبھی خالی زمین پر آرام فرماتے[1]،

عبادتِ شبانہ | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خانگی معمولات اور اوراد سے حضرت عائشہؓ کے برابر کوئی واقف نہ تھا، ان سے مروی ہے کہ جب سورۂ مزمل کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں تو آپ نے اسقدر نمازیں پڑھیں کہ پاؤں پر ورم آگیا، بارہ مہینے تک باقی آیتیں رُکی رہیں، سال بھر کے بعد جب بقیہ آیتیں اتریں تو قیام لیل جو ابتک فرض تھا نفل رہ گیا،

شب کو آٹھ رکعت متصل پڑھتے جنمیں صرف آٹھویں رکعت میں قعدہ کرتے، پھر ایک اور رکعت پڑھتے، اور اسمیں بھی جلسہ کرتے، پھر دو رکعت اور ادا کرتے، اس طرح ۱۱ رکعتیں ہوجاتیں لیکن جب عمر زیادہ ہوگئی اور جسم ذرا بھاری ہوگیا تو سات رکعتیں پڑھتے، جن کے بعد دو رکعتیں اور ادا کرتے، کبھی کبھی رات کو اتفاقاً نیند کا غلبہ ہوتا اور اسمیں معمول میں فرق آتا تو دن میں ۱۲ رکعتیں پڑھ لیتے تھے[2]،

ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے ایک اور روایت ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

"عشا کی نماز جماعت سے پڑھ کر گھر میں چلے آتے، اور یہاں چار رکعتیں پڑھ کر خواب راحت فرماتے، وضو کا پانی اور مسواک سرہانے رکھ دیجاتی، سوکر اٹھتے، پہلے مسواک فرماتے پھر وضو کرتے اور جائے نماز پر آکر آٹھ رکعتیں ادا کرتے"

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں اپنی خالہ میمونہؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں تھیں) کے یہاں خاص اس غرض سے رہا کہ دیکھوں آپ رات کو کس طرح نماز پڑھتے ہیں، زمین پر فرش بچھا ہوا تھا، آپ نے اس پر آرام فرمایا، میں سامنے آڑا سویا، قریباً رات ڈھلے آپ آنکھیں

[1] یہ پوری تفصیل زرقانی میں حدیث کی متعدد کتابوں کے حوالے سے مذکور ہے [2] سنن ابوداؤد باب صلوٰۃ اللیل

Marfat.com

ملتے ہوئے اٹھے، آل عمران کی اخیر دس آیتیں پڑھیں، پانی کی مشک لٹکی ہوئی تھی، اس سے وضو کیا، پھر نماز شروع کی، میں بھی وضو کر کے بائیں پہلو میں کھڑا ہو گیا، آپ نے ہاتھ پکڑ کر داہنی جانب پھیر دیا، ۱۳ رکعتیں پڑھ کر آپ سو رہے، یہانتک کہ سانس کی آواز آنے لگی، صبح ہوتے حضرت بلال رضؓ نے اذان دی، آپ اٹھے، فجر کی سنتیں ادا کیں، پھر مسجد میں تشریف لے گئے،

معمولات نماز | ابتدا میں آپ ہر نماز کیلئے نیا وضو کرتے تھے لیکن جب یہ گراں گذرنے لگا تو حضرت پنجوقتہ مسواک کر لیتے، فتح مکہ میں آپ نے سب سے پہلے ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھیں،[۱] تاہم عادۃً آپ اکثر نئے وضو کے ساتھ نماز ادا فرماتے تھے، وضو میں عام معمول یہ تھا کہ پہلے تین بار ہاتھ دھوتے، پھر کلی کرتے اور ناک میں پانی ڈالتے، اسکے بعد تین تین بار منھ ہاتھ دھوتے، سر کا مسح کرتے، اور تین بار پانوں کو دھوتے،[۲] بعض اوقات کسی عضو کو تین بار اور کسی عضو کو دو بار اور کسی عضو کو ایک بار دھوتے،[۳] سنن و نوافل زیادہ تر گھر ہی میں ادا فرماتے، اذان صبح ہی کے ساتھ اٹھتے اور فجر کی دو رکعت سنت نہایت اختصار کیساتھ ادا کرتے، یہانتک کہ حضرت عائشہ رضؓ کا بیان ہے کہ مجھے بعض اوقات یہ خیال ہوتا تھا کہ آپ نے سورۂ فاتحہ پڑھی یا نہیں،[۴] لیکن فرض کی دو رکعتوں میں عموماً طویل سورتیں پڑھتے، حضرت عبداللہ بن سائب سے مروی ہے کہ ایک بار آپ نے مکہ میں نماز فجر میں سورۂ مومنین پڑھی، اسی طرح کبھی واللیل اذا یغشیٰ اور کبھی سورۂ ق پڑھتے، صحابہ کا اندازہ ہے کہ آپ صبح کی نماز میں ساٹھ سے لیکر سو آیتوں تک پڑھتے تھے،

ظہر و عصر میں اگرچہ بہ نسبت فجر کے تخفیف فرماتے تھے، تاہم ابتدائی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ

---

[۱] صحیح مسلم و مسند ج ۵ ص ۲۲۵ [۲] مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۰۰ باب صفۃ الوضوء و کمالہ [۳] مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۱۰ باب آخر فی صفۃ الوضوء [۴] مسلم جلد ۱ صفحہ ۲۷ باب رکعتی سنۃ الفجر و الحث علیہما

Marfat.com

کے ساتھ اتنی بڑی سورہ پڑھتے کہ آدمی بقیع تک جاتا تھا اور وہاں اپنا کام کرتا تھا، پھر پلٹ کر گھر آتا تھا اور وضو کرتا تھا، اور پہلی رکعت میں جا کر شامل ہو جاتا تھا، صحابہ نے اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ ظہر کی اول دو رکعتوں میں آپ اسقدر قیام فرماتے ہیں جسمیں الم تنزیل السجدہ کے برابر سورہ پڑھی جا سکتی ہے اخیر کی دو رکعتوں میں یہ مقدار نصف رہ جاتی تھی، عصر کی دونوں پہلی رکعتوں میں ظہر کی آخری رکعتوں کے برابر قیام فرماتے تھے، اور اخیر کی دو رکعتوں میں پہلی رکعتوں کی نصف مقدار رہ جاتی تھی، حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی پہلی رکعت میں تیس آیتوں کے برابر اور دوسری رکعت میں پندرہ آیتوں کے یا اسکے نصف کے برابر اور عصر میں پندرہ آیتوں کے برابر پڑھا کرتے تھے، جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ ظہر میں آپ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى پڑھتے تھے،

مغرب کی نماز میں وَالْمُرْسَلٰتِ اور سورۂ طور پڑھتے تھے،

عشا کی نماز میں وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ اور اسی کے برابر کی سورتیں پڑھتے تھے۔

تہجد کی نماز میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے تھے، مثلاً سورہ بقرہ، سورۂ آل عمران سورۂ نساء،

جمعہ کی پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ اور دوسری رکعت میں اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ اور کبھی سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى اور هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ

عیدین میں بھی دو پچھلی سورتیں یعنی سبح اسم ربک الاعلیٰ اور ھل اتاک پڑھتے تھے،

اتفاق سے اگر عید اور جمعہ ایک ساتھ پڑ جاتا تو دونوں نمازوں میں یہی دونوں سورتیں پڑھا کرتے تھے،

جمعہ کے دن کی نماز صبح میں الم تنزیل السجدہ اور هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ

---

[1] مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۸۷ باب القراءۃ فی الظہر والعصر وغیرہما ۱۲

مِنَ اللّٰہِ ھٰذِہٖ پڑھنے کا معمول تھا[۱]

معمولات خطبہ | وعظ وپند اور ارشاد وہدایت کے لیے آپ اکثر خطبہ دیا کرتے تھے، بالخصوص جمعہ کے لیے تو خطبہ لازمی تھا، جمعہ کے خطبات میں معمول یہ تھا کہ جب لوگ جمع ہو جاتے تو آپ نہایت سادگی کے ساتھ گھر سے نکلتے، مسجد میں داخل ہوتے تو لوگوں کو سلام کرتے، پھر منبر پر تشریف لیجاتے تو لوگوں کی طرف رخ کر کے سلام کرتے اور اذان کے بعد فوراً خطبہ شروع کر دیتے، پہلے ہاتھ میں ایک عصا ہوتا تھا، لیکن جب منبر بن گیا تو ہاتھ میں عصا لینا چھوڑ دیا، خطبہ ہمیشہ نہایت مختصر اور جامع ہوتا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ نماز کا طول اور خطبہ کا اختصار آدمی کے تفقہ کی دلیل ہے جمعہ کے خطبہ میں عموماً سورۂ "ق" پڑھتے تھے[۲]، اس میں قیامت اور حشر ونشر کا بہ تفصیل ذکر ہے۔

خطبہ ہمیشہ حمد خداوندی کے ساتھ شروع کرتے تھے، اگر اثنائے خطبہ میں کوئی کام پیش آجاتا تو منبر سے اتر کر اس کو کر لیتے، پھر منبر پر جا کر خطبہ کو پورا فرماتے، ایک بار آپ خطبہ دے رہے تھے اسی حالت میں ایک آدمی نے آکر کہا "یا رسول اللہ! میں مسافر آدمی ہوں، اپنے دین کی حقیقت سے ناواقف ہوں، اس کے متعلق پوچھنے آیا ہوں" آپ منبر سے اتر آئے، ایک کرسی رکھ دی گئی، اس پر بیٹھ گئے اور اسکو تعلیم وتلقین کی، پھر جا کر خطبہ کو پورا کیا[۳]، ایک بار آپ خطبہ دے رہے تھے، امام حسین علیہ السلام سرخ کپڑے پہنے ہوئے مسجد میں آگئے، چونکہ بچپن کی وجہ سے لڑکھڑاتے آتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو ضبط نہ ہو سکا منبر سے اتر آئے اور گود میں اٹھا لیا، اور یہ آیت پڑھی[۴] اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ۔

خطبہ کی حالت میں لوگوں کو بیٹھنے اور نماز پڑھنے کا بھی حکم دیتے تھے، چنانچہ عین خطبہ کی حالت

---

[۱] یہ تمام روایتیں صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجمعہ والعیدین میں مذکور ہیں [۲] صحیح مسلم [۳] ادب المفرد مطبوعہ مصر صفحہ ۱۸۰ باب الجلوس علی السریر [۴] جامع ترمذی مناقب حسنین رض

Marfat.com

میں ایک شخص مسجد میں آیا، آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے نماز پڑھی؟ اس نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا "اٹھو اور پڑھو"[۱]

میدان جہاد میں جب خطبہ دیتے تھے تو کمان پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ہاتھ میں تلوار لیکر کھڑے ہوتے تھے، لیکن ابن قیم نے لکھا ہے کہ آپ نے خطبہ کی حالت میں کبھی تلوار ہاتھ میں نہیں لی،[۲]

وعظ و ارشاد کے لیے عموماً ناغہ دیکر خطبہ دیا کرتے تھے، تاکہ لوگ گھبرا نہ جائیں[۳]

معمولات سفر حج، عمرہ اور زیادہ تر جہاد کی وجہ سے آپ کو اکثر سفر کی ضرورت پیش آیا کرتی تھی، سفر میں معمول یہ تھا کہ پہلے ازواج مطہرات پر قرعہ ڈالتے جس کے نام قرعہ پڑتا وہ ہمسفر ہوتیں[۴] جمعرات کے دن سفر کرنا پسند فرماتے تھے، اور صبح کے تڑکے روانہ ہو جاتے تھے،[۵] افواج کو بھی جب کسی مہم پر روانہ فرماتے تو اسی وقت روانہ فرماتے،[۶] جب سواری سامنے آتی اور رکاب میں قدم مبارک رکھتے تو بسم اللہ کہتے، اور جب زین پر سوار ہو جاتے تو تین بار تکبیر کہتے، اسکے بعد یہ آیت پڑھتے،

الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا کُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۙ وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝ (پاک ہے وہ ذات جس نے اس جانور کو ہمارا فرمانبردار بنایا حالانکہ ہم خود اسکو مطیع نہیں کر سکتے تھے اور ہم اپنے خدا کی طرف ...)

---

[۱] بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۲۷ باب اذا رای الامام رجلا جاء وہو یخطب امرہ ان یصلی رکعتین [۲] زاد المعاد جلد اول صفحہ فصل ہدیہ فی خطبہ [۳] بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۶ باب کان النبی صلعم یتخولہم بالموعظۃ [۴] بخاری جلد ۲ باب حدیث الافک وکتاب المغازی [۵] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی ای یوم یستحب السفر و باب فی الابتکار فی السفر [۶] ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ سوار ہو جانے کے بعد تین تین بار تکبیر و تحمید کرتے، پھر یہ دعا پڑھتے، سُبْحَانَكَ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ اِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ (ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یقول الرجل اذا رکب)

Marfat.com

پھر یہ دعا کرتے،

اللھم انا نسئالک فی سفرنا ھذا البر	خداوندا! اس سفر میں ہم تجھ سے نیکی، پرہیزگاری اور
والتقوی ومن العمل ما ترضی اللھم	عمل پسندیدہ کی درخواست کرتے ہیں، خداوندا ہمارے
ھون علینا سفرنا واطو عنا بعدہ اللھم	اس سفر کو آسان اور اس کی مسافت کو طے کر دے
انت الصاحب فی السفر والخلیفۃ فی الاھل	خداوندا سفر میں تو رفیق ہے، بال بچوں کے لیے
اللھم انی اعوذ بک من وعثاء السفر	تو ہمارا قائم مقام ہے، خداوندا میں سفر اور واپسی
وکابۃ المنقلب وسوء المنظر فی	کے آلام و مصائب اور گھر بار کے مناظر قبیحہ سے
الاھل والمال	تیری پناہ مانگتا ہوں،

جب واپس ہوتے تو اس میں اس قدر اضافہ کر دیتے، آئبون، تائبون، عابدون لربنا حامدون، راستے میں جب کسی چوٹی پر چڑھتے تو تکبیر کہتے، اور جب اس سے نیچے اترتے تو زمزمہ ریز تسبیح ہوتے، صحابہ بھی آپ کے ہم آواز ہو کر تکبیر و تسبیح کا غلغلہ بلند کرتے، جب کسی منزل پر اترتے تو یہ دعا فرماتے۔[۱]

یا ارض ربی وربک اللہ اعوذ باللہ	اے زمین میرا اور تیرا پروردگار خدا ہے میں تیری برائی سے
من شرک وشر ما فیک وشر ما خلق	اور اس چیز کی برائی سے جو تیرے اندر ہے اور اس چیز کی
فیک وشر ما یدب علیک واعوذ بک	برائی سے جو تیرے اندر پیدا کی گئی ہے اور اس چیز کی
من اسد واسود ومن الحیۃ والعقرب	برائی سے جو تجھ پر چلتی ہے پناہ مانگتا ہوں، خدا یا تجھ سے شیر

---

[۱] ابو داؤد کتاب الجہاد باب ما یقول الرجل اذا سافر

Marfat.com

ومن ساكني البلد ومن والد وما ولد[1]	سانپ، بچھو اور اس گاؤں کے رہنے والوں اور آدمیوں سے پناہ مانگتا ہوں

جب کسی آبادی میں داخل ہونا چاہتے تو یہ دعا پڑھتے،

اللهم رب السموات السبع وما اظللن و	خداوندا! اے ساتوں آسمان اور ان تمام چیزوں کے پروردگار جن پر
رب الارضين السبع وما اقللن و	وہ سایہ فگن ہیں، اے ساتوں زمینوں اور ان تمام مخلوقات کے پروردگار
رب الشياطين وما اضللن ورب الرياح	جو ان پر موجود ہیں، اے شیاطین اور ان تمام نفوس کے پروردگار
وما ذرين اسألك خير هذه القرية	جن کو وہ گمراہ کرتے ہیں، اے ہوا اور ان تمام اشیاء کے پروردگار
وخير اهلها واعوذ بك من شرها	جنکو وہ اڑاتی ہیں، میں تجھ سے اس گاؤں اور اس گاؤں کے رہنے والوں
وشر اهلها وشر ما فيها.[2]	کی بھلائی کی درخواست کرتا ہوں اور اس گاؤں اور اس گاؤں کے رہنے والوں کی برائی سے پناہ مانگتا ہوں

مدینہ پہنچتے تو پہلے مسجد میں جا کر دو رکعت نماز ادا فرماتے،[3] پھر مکان کے اندر تشریف لیجاتے، تمام لوگوں کو حکم تھا کہ سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر کے اندر نہ چلے جائیں، تاکہ عورتیں اطمینان کے ساتھ سامان درست کرلیں[4])

معمولات جہاد (جہاد میں معمول یہ تھا کہ جب فوج کو کسی مہم پر روانہ فرماتے تو امیر العسکر کو خاص طور پر پرہیزگاری اختیار کرنے اور اپنے رفقاء کیساتھ نیکی کرنے کی ہدایت فرماتے، پھر تمام فوج کی طرف مخاطب ہوکر فرماتے:

اغزوا باسم الله في سبيل الله قاتلوا من	خدا کے نام پر خدا کی راہ میں کفار سے لڑو، خیانت اور
كفر بالله اغزوا ولا تغلوا ولا تغدروا	بدعہدی نہ کرنا، مردوں کے ناک کان نہ کاٹنا،
ولا تمثلوا ولا تقتلوا وليدا	بچوں کو قتل نہ کرنا،

[1] زاد المعاد فصل فی ہدیہ فی السفر [2] ابوداؤد کتاب الجہاد، باب ما یقول الرجل اذا نزل المنزل [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی اعطاء البشیر [4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الطروق ۔

اس کے بعد شرائط جہاد کی تلقین کرتے۔[۱]

جب فوج کو رخصت کرتے تو یہ الفاظ فرماتے۔

استودع اللہ دینکم و امانتکم و خواتیم اعمالکم[۲] — میں تمہارے قرض کو، امانت کو، اور تمہارے اعمال کے نتائج کو خدا کے حوالے کرتا ہوں۔

جب خود شریک جہاد ہوتے اور حملہ کے مقام پر شب کو پہنچتے تو صبح کا انتظار کرتے، صبح ہو جاتی تو حملہ کرتے[۳] اگر صبح کے وقت حملہ کرنے کا اتفاق نہ ہوتا تو دوپہر ڈھلے حملہ کرتے[۴]، جب کوئی مقام فتح ہو جاتا تو اقامت عدل و انصاف کے لیے وہاں تین دن تک قیام فرماتے[۵]، جب فتح و ظفر کی خبر آتی تو سجدۂ شکرانہ بجا لاتے[۶]، جب میدان جہاد میں شریک کارزار ہوتے تو یہ دعا فرماتے،

اللھم انت عضدی و نصیری بک احول و بک اصول و بک اقاتل[۷] — خداوندا تو میرا دست و بازو ہے، تو میرا مددگار ہے، تیرے سہارے پر میں مدافعت کرتا ہوں، حملہ کرتا ہوں اور لڑتا ہوں۔

معمولات عیادت و عزا بیماروں کی عیادت و غمخواری آپ ضرور فرماتے تھے اور صحابہ کو ارشاد ہوتا تھا کہ عیادت بھی ایک مسلمان کا فرض ہے[۸]، ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں معمول شریف یہ تھا کہ جب کسی شخص کی موت کا وقت قریب آ جاتا تو صحابہ آپ کو اس کی اطلاع دیتے، آپ اسکے مرنے سے پہلے تشریف لاتے، اس کے لیے دعائے مغفرت فرماتے، اور آخیر دم تک اسکے پاس بیٹھے رہتے، یہاں تک کہ دم واپسیں

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الجہاد باب تامیر الامام الامراء علی البعوث و وصیتہ ایاہم باداب الغزو وغیرہا [۲] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الدعاء عند الوداع [۳] بخاری کتاب المغازی ذکر غزوۂ خیبر [۴] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی ای وقت یستحب اللقاء [۵] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الامام یقیم عند الظہور علی العدو بارضہم [۶] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سجود الشکر، [۷] ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یدعی عند اللقاء [۸] صحیح بخاری باب وجوب عیادۃ المریض،

Marfat.com

کے انتظار میں آپ کو اس قدر دیر ہو جاتی کہ آپ کو تکلیف ہونے لگتی صحابہ نے تکلیف کا احساس کیا۔ اور اب ان کا یہ معمول ہو گیا کہ جب کوئی شخص مر چکتا تو آپ کو اسکی موت کی خبر دیتے آپ اسکے مکان پر تشریف لیجاتے، اس کے لیے استغفار فرماتے، جنازہ کی نماز پڑھتے، اس کے بعد اگر مٹی دینا چاہتے، تو ٹھہر جاتے، ورنہ واپس چلے آتے لیکن صحابہ کو آخر آپ کی یہ تکلیف بھی گوارا نہ ہوئی اس لیے خود جنازہ آپ کے مکان تک لانے لگے اور یہی عام معمول ہو گیا،[۱]

عیادت کے لیے جب کسی بیمار کے پاس تشریف لیجاتے تو اسکو تسکین دیتے پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے، اسکی صحت کے لیے دعا فرماتے،[۲] اور کہتے انشاء اللہ طہور، خدا نے چاہا تو خیریت ہے، کوئی بدفالی کے فقرے کہتا تو ناپسند فرماتے، ایک بار ایک اعرابی مدینہ میں آکر بیمار پڑ گیا آپ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے اور کلمات تسکین ادا فرمائے، اس نے کہا "تم نے خیریت کہا، شدید تپ ہے، جو قبر ہی میں ملا کر چھوڑے گی۔" آپ نے فرمایا "ہاں اب یہی ہو"[۳]

معمولات ملاقات معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام اور مصافحہ کرتے کوئی شخص اگر جھک کر آپ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اسکی طرف سے رخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منہ نہ ہٹا لے، مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا یعنی کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک کہ وہ خود نہ چھوڑ دے اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے مجلس میں بیٹھتے تو آپ کے زانو کبھی ہمنشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے۔[۴]

---

[۱] (مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۶۶ [۲] صحیح بخاری باب وضع الید علی المریض [۳] باب دعاء العائد للمریض

[۴] باب عیادت الاعراب) [۵] ابو داؤد و ترمذی

جو شخص حاضر ہونا چاہتا دروازے پر کھڑے ہو کر پہلے "السلام علیکم" کہتا پھر پوچھتا کہ کیا میں اندر آسکتا ہوں؟ (خود بھی آپ کسی سے ملنے جاتے تو اسی طرح اجازت مانگتے) کوئی شخص اس طریقہ کے خلاف کرتا تو آپ اس کو واپس کر دیتے، ایک دفعہ بنو عامر کا ایک شخص آیا، اور دروازہ پر کھڑا ہو کر پکارا کہ اندر آسکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا کہ "جا کر ان کو اجازت طلبی کا طریقہ سکھا دو" یعنی پہلے سلام کرلے، تب اجازت مانگے۔

ایک دفعہ صفوان بن امیہ نے جو قریش کے رئیس اعظم تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے بھائی کلدہ کے ہاتھ دودھ، ہرن کا بچہ اور ککڑیاں بھیجیں، کلدہ یوں ہی بے اجازت چلے آئے، آپ نے فرمایا کہ "واپس جاؤ اور سلام کر کے اندر آؤ"۔[1]

ایک دفعہ حضرت جابرؓ زیارت کو آئے۔ اور دروازہ پر دستک دی، آپ نے پوچھا کون ہے؟ بولے "میں" آپ نے فرمایا "میں میں" یعنی یہ کیا طریقہ ہے، نام بتانا چاہیے۔

جب آپ خود کسی کے گھر پر جاتے تو دروازہ کے دائیں یا بائیں جانب کھڑے ہوتے اور السلام علیکم کہہ کر اذن طلب فرماتے۔ (راوی کا بیان ہے کہ آپ عین دروازہ کے سامنے اس وجہ سے نہ کھڑے ہوتے کہ اس وقت تک دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا) اگر صاحب خانہ اذن نہ دیتا تو پلٹ آتے چنانچہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سعد بن عبادہؓ کے گھر تشریف لائے، اور باہر کھڑے ہو کر اذن طلبی کیلئے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہا، سعدؓ نے اس طرح آہستہ سلام کا جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں سنا حضرت سعدؓ کے فرزند قیس بن سعدؓ نے کہا کہ آپ رسول اللہ کو اندر آنے

---

[1] یہ دونوں روایتیں ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱۵۶ میں ہیں۔

کی اجازت کیوں نہیں دیتے، حضرت سعدؓ نے کہا چپ رہو، رسول اللہ بار بار سلام کریں گے جو ہمارے لیے برکت کا سبب ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ السلام علیکم کہا، اور سعدؓ نے پھر اسی طرح جواب دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری دفعہ پھر اسی طریقہ سے اذن طلب کیا اور جب کوئی جواب نہ ملا تو آپ واپس چلے، حضرت سعدؓ نے جب آپ کو جاتے دیکھا تو دوڑ کر گئے، اور عرض کی کہ میں آپ کا سلام سن رہا تھا، لیکن آہستہ جواب دیتا تھا، (کہ آپ بار بار سلام فرمائیں)[1]

(کسی کے گھر تشریف لیجاتے تو ممتاز مقام پر بیٹھنے سے پرہیز فرماتے، ایک بار آپ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مکان پر تشریف لے گئے، انھوں نے آپ کے بیٹھنے کے لیے چمڑے کا ایک گدا ڈال دیا، لیکن آپ زمین پر بیٹھ گئے، اور گدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کے درمیان آگیا)[2]

معمولات عامہ (تیمن یعنی داہنی طرف سے یا داہنے ہاتھ سے کام کرنا آپ کو محبوب تھا، جوتا پہلے داہنے پانوں میں پہنتے، مسجد میں پہلے داہنا پانوں رکھتے، مجلس میں کوئی چیز تقسیم فرماتے تو داہنی طرف سے، اسی طرح کسی کام کو شروع کرنا چاہتے تو پہلے بسم اللہ کہہ لیتے)

[1] ابوداؤد کتاب الادب [2] ادب المفرد صفحہ ۲۱۹)

Marfat.com

مجالسِ نبوی

دربارِ نبوت | شہنشاہ کونین کا دربار نقیب و چاؤش اور خیل و حشم کا دربار نہ تھا، دروازہ پر دربان بھی نہیں ہوتے تھے، تاہم نبوت کے جلال سے ہر شخص پیکر تصویر نظر آتا تھا، حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں لوگ بیٹھتے تو یہ معلوم ہوتا کہ ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں، یعنی کوئی شخص ذرا بھی جنبش نہیں کرتا تھا، گفتگو کی اجازت میں ترتیب کا لحاظ رہتا تھا لیکن یہ امتیاز مراتب نسب و نام یا دولت و مال کی بنا پر نہیں تھا، بلکہ فضل و استحقاق کی بنا پر ہوتا تھا سب سے پہلے آپ اہل حاجت کیطرف متوجہ ہوتے، اور انکے معروضات سنکر انکی حاجت برآری فرماتے، تمام حاضرین ادب سے سر جھکائے رہتے، خود بھی آپ مؤدب ہو کر بیٹھتے، جب کچھ فرماتے تو تمام مجلس پر سناٹا چھا جاتا، کوئی شخص بولتا تو جب تک وہ چپ ہو جائے دوسرا شخص بول نہیں سکتا تھا، اہل حاجت عرض مدعا میں ادب کی حد سے بڑھ جاتے تو آپ کمال حلم کیساتھ برداشت فرماتے، آپ کسی کی بات کاٹ کر گفتگو نہ فرماتے، جو بات ناپسند ہوتی، اس سے تغافل فرماتے اور ٹال جاتے، کوئی شخص شکریہ ادا کرتا تو اگر آپ نے واقعی اس کا کوئی کام انجام دیا ہو تو شکریہ قبول فرماتے مجلس میں جس قسم کا ذکر چھڑ جاتا، آپ بھی اس میں شامل ہو جاتے ہنسی اور مذہب ظرافت میں بھی شریک ہوتے خود بھی مذاقیہ باتیں فرماتے کبھی کسی قبیلہ کا کوئی معزز شخص آجاتا تو حسب مرتبہ اس کی تعظیم فرماتے، اور فرماتے اکرموا کریم کل قوم، مزاج پرسی کے ساتھ ہر شخص سے دریافت فرماتے کہ کوئی ضرورت اور حاجت تو نہیں ہے، یہ بھی فرماتے کہ جو لوگ اپنے مطالب مجھ تک

Marfat.com

نہیں پہنچا سکتے مجکو ان کے حالات اور ضروریات کی خبر دو،

ایران میں معمول تھا کہ جب مجلس میں کوئی معزز شخص آجاتا تھا تو سب تعظیم کو کھڑے ہوجاتے یہ بھی قاعدہ تھا کہ روسا اور امرا جب دربار جاتے تو لوگ سینوں پر ہاتھ رکھکر کھڑے رہتے، آپنے ان باتوں سے منع فرمایا اور ارشاد کیا کہ جس کو یہ پسند آتا ہو کہ لوگ اس کے سامنے تعظیم سے کھڑے رہیں، اس کو اپنی جگہ دوزخ میں ڈھونڈھنی چاہیے"[1] البتہ جوش محبت میں آپ کسی کسی کے لئے کھڑے ہوجاتے، چنانچہ حضرت فاطمہ زہرا جب کبھی آجاتیں تو اکثر کھڑے ہوجاتے اور فرط محبت سے ان کی پیشانی چومتے (حضرت حلیمہ سعدیہ کے لیے بھی آپنے اٹھکر چادر بچھادی تھی، اسی طرح ایک دفعہ آپکے رضاعی بھائی آئے تو ان کے لیے بھی محبت سے کھڑے ہوگئے، اور ان کو اپنے سامنے بٹھایا)[2]

ہر شخص کو اس کے رتبہ کے مناسب جگہ ملتی کسی شخص کے دل میں یہ خیال نہیں آنے پاتا کہ دوسرا شخص اس سے زیادہ عزت یاب ہے، جب کوئی شخص اچھی بات کہتا تو آپ تحسین فرماتے، ادنا مناسب بات گفتگو کرتا تو اس کو مطلع فرما دیتے،[3]

ایکدفعہ دو شخص مجلس اقدس میں حاضر تھے، ان میں ایک معزز اور دوسرا کم رتبہ تھا، معزز صاحب کو چھینک آئی لیکن انھوں نے اسلامی شعار کے موافق الحمد للہ نہیں کہا، دوسرے صاحب کو بھی چھینک آئی، انھوں نے الحمد للہ کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب معمول یرحمک اللہ کہا، معزز صاحب نے شکایت کی آپنے فرمایا کہ انھوں نے خدا کو یاد کیا تو میں نے بھی کیا، تم نے خدا

---

[1] ابو داؤد کتاب الادب باب قیام الرجل للرجل [2] ابو داؤد، کتاب الادب بر الوالدین [3] یہ تمام تفصیل شمائل ترمذی کی دو مفصل روایتوں سے ماخوذ ہے جنمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عام اخلاق کا ذکر ہے

کو بھلا دیا تو میں نے بھی تم کو بھلا دیا۔[1]

صحابہ کو اس بات کی سخت تاکید تھی کہ کسی کی شکایت یا عیوب آپ تک نہ پہنچائیں، آپ فرماتے تھے کہ "میں چاہتا ہوں کہ دنیا سے جاؤں تو سب کی طرف سے صاف جاؤں"۔[2]

مجالس ارشاد | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تلقین کا فیض اگرچہ سفر، حضر، جلوت، خلوت، نشست و برخاست غرض ہر وقت جاری رہتا تھا، تاہم اس سے وہی لوگ مستفیض ہو سکتے تھے جو اتفاق سے موقع پر ہوتے تھے، اس بنا پر آپ نے تعلیم و ارشاد کے لیے بعض اوقات خاص کر دیے تھے کہ لوگ پہلے سے مطلع رہیں اور جن کو استفادہ منظور ہو وہ آسکیں۔

یہ صحبتیں عموماً مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھیں، مسجد نبوی میں ایک چھوٹا سا صحن تھا، کبھی آپ وہاں نشست فرماتے، ابتداءً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست کے لیے کوئی ممتاز جگہ نہ تھی، باہر سے اجنبی لوگ آتے تو آپ کے پہچاننے میں دقت ہوتی، صحابہ نے ایک چھوٹا سا مٹی کا چبوترہ بنا دیا، آپ اس پر تشریف رکھتے، باقی دونوں طرف صحابہ حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے۔[3]

آداب مجلس | ان مجالس میں آنے والوں کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی، عموماً بدو اپنے اسی وحشت نما طریقہ سے آتے اور بے باکانہ سوال و جواب کرتے۔

خلق نبوی کا منظر ان مجالس میں زیادہ حیرت انگیز بنجاتا ہے، آپ پیغمبر خاتم کی حیثیت سے رونق افروز ہیں، صحابہ عقیدت کیش غلاموں کی طرح خدمت اقدس میں حاضر ہیں، ایک شخص آتا ہے، اور اسکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں، اور حاشیہ نشینوں میں کوئی ظاہری امتیاز نظر نہیں آتا، لوگوں سے

---

[1] ادب المفرد امام بخاری۔ [2] ابوداؤد کتاب الادب۔ [3] نسائی تا صفحہ ۲۰۳ [4] ابوداؤد باب القدر۔

پوچھتا ہے "محمد کون ہے" ؟ صحابہ بتاتے ہیں کہ "یہی گورے سے آدمی جو ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہیں" وہ کہتا ہے "اے ابن عبد المطلب! میں تم سے نہایت سختی سے سوال کروں گا، خفا نہ ہونا"۔ آپ بخوشی سوال کی اجازت دیتے ہیں۔[1]

باایں ہمہ سادگی و تواضع، یہ مجالس رعب و وقار اور ادب نبوت کے اثر سے لبریز ہوتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و تلقینات کا دائرہ، اخلاق، مذہب اور تزکیۂ نفوس تک محدود تھا۔ اس کے علاوہ اور باتیں منصب نبوت سے خارج تھیں لیکن بعض لوگ نہایت معمولی اور خفیف باتیں پوچھتے تھے، مثلاً یا رسول اللہ میرے باپ کا نام کیا ہے؟ میرا اونٹ کھو گیا ہے، وہ کہاں ہے؟ آپ اس قسم کے سوالات کو ناپسند فرماتے تھے۔

ایک بار اسی قسم کے لغو سوالات کیے گئے، تو آپ نے برہم ہو کر فرمایا کہ "جو پوچھنا ہو پوچھو، میں سب کا جواب دوں گا"۔ حضرت عمرؓ نے آپ کے چہرے کا رنگ دیکھا تو نہایت الحاح کے ساتھ کہا رضینا الخ۔[2] کوئی شخص کھڑے کھڑے سوال نہیں کرتا تھا، ایک شخص نے اس طرح سوال کیا تو آپ نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا، اسی طرح یہ بھی معمول تھا کہ جب ایک مسئلہ طے ہو جاتا تو دوسرا مسئلہ پیش کیا جاتا، بعض اوقات آپ گفتگو کرتے ہوتے، کوئی صحرانشین بدو جو آداب مجلس سے ناواقف ہوتا، دفعۃً آتا اور عین سلسلۂ تقریر میں کوئی بات پوچھ بیٹھتا، آپ سلسلۂ تقریر قائم رکھتے، اور فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوتے اور جواب دیتے، ایک دفعہ آپ تقریر فرما رہے تھے، ایک بدو آیا اور آنے کے ساتھ اس نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ تقریر کرتے رہے، حاضرین سمجھے کہ آپ نے نہیں سنا، کسی کسی نے

---

[1] بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۵ کتاب الایمان [2] بخاری کتاب العلم

Marfat.com

کہا سنا" لیکن آپ کو ناگوار ہوا، آپ گفتگو سے فارغ ہو چکے تو دریافت فرمایا کہ پوچھنے والا کہاں ہے؟" بدو نے کہا "میں یہ حاضر ہوں" آپ نے فرمایا جب لوگ امانت کو ضائع کرنے لگیں گے" بولا کہ امانت کیونکر ضائع ہوگی؟ فرمایا جب نا اہلوں کے ہاتھ میں کام آئے گا[1]

اوقات مجلس: اس قسم کی مجالس کے لیے جو خاص وقت مقرر تھا وہ صبح کا تھا، نماز فجر کے بعد آپ بیٹھ جاتے اور فیوض روحانی کا چشمہ جاری ہو جاتا بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کے بعد آپ ٹھہر جاتے اور مجلس قائم ہو جاتی، چنانچہ کعب بن مالکؓ جب غزوۂ تبوک کی غیر حاضری کی وجہ سے عتاب نازل ہوا تو وہ ان ہی مجالس میں آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی مزاج کا پتہ لگاتے خود انکے الفاظ یہ ہیں:

وانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاسلم علیہ	میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تھا اور سلام کرتا تھا
وھو فی مجلسہ بعد الصلوۃ فاقول	اور آپ بعد نماز کے اپنی مجلس میں ہوتے تھے تو میں اپنے جی میں
فی نفسی ھل حرک شفتیہ برد السلام ام لا[2]	کہتا تھا کہ آپ نے جواب سلام میں اپنے لب ہلائے یا نہیں،

صبح کی مجلسوں میں کبھی کبھی آپ وعظ فرماتے، ترمذی اور ابوداؤد میں عرباض بن ساریہ سے روایت ہے،

وعظنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوما بعد صلوۃ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن صبح کی نماز کے
الغداۃ موعظۃ بلیغۃ ذرفت منھا العیون	بعد ایک بلیغ وعظ کہا جس سے آنکھیں اشک ریز
ووجلت منھا القلوب[3]	ہوگئیں اور دل کانپ اٹھے۔

نماز کے بعد جو مجلس منعقد ہوتی، اسمیں وعظ و نصیحت اور اس قسم کی جزئی باتوں پر گفتگو ہوتی تھی،

---

[1] صحیح بخاری کتاب العلم صفحہ ۱۴ [2] بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۳۳ حدیث کعب بن مالک [3] ترمذی صفحہ ۴۴

Marfat.com

لیکن ان اوقات کے علاوہ آپ خاص طور پر حقائق و معارف کے اظہار کے لیے مجالس منعقد فرماتے تھے یہی مجالس ہیں جنکی نسبت احادیث میں یہ الفاظ آئے ہیں،

کان یوماً بارزاً للناس[1] — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن عام طور پر لوگوں کیلیے باہر نکلے تھے۔

چونکہ افادۂ عام ہوتا تھا اس لیے آپ چاہتے تھے کہ کوئی شخص فیض سے محروم نہ رہنے پائے، اس بنا پر جو لوگ ان مجالس میں آکر واپس چلے جاتے، ان پر آپ نہایت ناراض ہوتے تھے، آپ ایک مرتبہ صحابہ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ تین شخص آئے، ایک صاحب نے حلقہ میں تھوڑی سی جگہ خالی پائی وہیں بیٹھ گئے، دوسرے صاحب کو درمیان میں موقع نہیں ملا، اس لیے سب کے پیچھے بیٹھے لیکن تیسرے صاحب واپس چلے گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب فارغ ہوئے تو فرمایا کہ ان میں سے ایک نے خدا کی طرف پناہ لی، خدا نے اس کو بھی پناہ دی، ایک نے حیا کی، خدا بھی اس سے شرمایا، ایک نے خدا سے منھ پھیرا، خدا نے اس سے بھی منھ پھیر لیا،[2]

پند و نصائح کتنے ہی مؤثر طریقہ سے بیان کیے جائیں لیکن ہمیشہ سنتے سنتے آدمی اکتا جاتا ہے، اور نصائح بے اثر ہو جاتے ہیں، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وعظ و نصائح کی مجالس ناغہ دیکر منعقد فرماتے تھے، بخاری میں ابن مسعودؓ سے روایت ہے

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتخولنا بالموعظة فی الایام کراهة السآمة علینا — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کو ناغہ دیکر نصیحت فرماتے تھے کہ ہم لوگ اکتا نہ جائیں۔

عورتوں کے لیے مخصوص مجالس | ان مجالس کا فیض زیادہ تر مردوں تک محدود تھا، اور عورتوں کو موقع

---

[1] سنن ابن ماجہ صفحہ ۲۲ [2] بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۰ کتاب العلم

کم ملتا تھا۔ اس بناپر عورتوں نے درخواست کی کہ ہمارے لیے خاص دن مقرر فرمایا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ درخواست منظور کی اور ان کے وعظ و ارشاد کے لیے ایک خاص دن مقرر ہو گیا۔[1]

اگرمسائل شرعیہ کے متعلق ہر قسم کے سوالات کی اجازت تھی، اور خاتونانِ حرم وہ مسائل دریافت کرتی تھیں، جو خاص پردہ نشینوں سے تعلق رکھتے تھے، تاہم جب کوئی پردہ کا واقعہ مجلس عام میں سوال کی غرض سے پیش کیا جاتا تو فرطِ حیا سے آپ کو ناگوار ہوتا۔

اس قسم کی پردے کی بات مرد بھی مجمع عام میں پوچھتے تو آپ کو تکدر ہوتا، ایک دفعہ ایک صحابی نے (جن کا نام عاصم تھا) مجلس عام میں پوچھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو غیر کے ساتھ دیکھ لے تو کیا حکم ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار ہوا، اور آپ نے ان کو ملامت کی۔[2]

طریقۂ ارشاد | کبھی کبھی آپ خود امتحان کے طور پر حاضرین سے کوئی سوال کرتے، اس سے لوگوں کی جودتِ فکر اور اصابتِ رائے کا اندازہ ہوتا حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آپ نے پوچھا "وہ کون سا درخت ہے جس کے پتے جھڑتے نہیں، اور جو مسلمانوں سے مشابہت رکھتا ہے؟" لوگوں کا خیال جنگلی درختوں کی طرف گیا، میرے ذہن میں آیا کہ کھجور کا درخت ہوگا، لیکن میں کمسن تھا اس لیے جرأت نہ کر سکا، بالآخر لوگوں نے عرض کی کہ حضور بتائیں، ارشاد فرمایا "کھجور" عبد اللہؓ ابن عمر کو تمام عمر حسرت رہی کہ کاش میں نے جرأت کر کے اپنا خیال ظاہر کر دیا ہوتا۔[3]

ایک روز آپ مسجد میں تشریف لائے، صحابہ کے دو حلقے قائم تھے، ایک قرآن خوانی اور ذکر و دعا میں مشغول تھا، اور دوسرے حلقہ میں علمی باتیں ہو رہی تھیں، آپ نے فرمایا دونوں عمل خیر کر رہے ہیں،

[1] بخاری کتاب العلم [2] ایضاً [3] سنن ابن ماجہ صفحہ ۲۱ باب فضل العلماء

لیکن خدا نے مجکو صرف معلم بنا کر مبعوث کیا ہے، یہ کہکر علمی حلقہ میں بیٹھ گئے،[1]

ان مجالس میں دقیق مباحث کو جنکی تہ تک عوام نہیں پہنچ سکتے، ناپسند فرماتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ صحابہ کی مجلس میں مسئلہ تقدیر پر گفتگو ہو رہی تھی، آپنے سنا تو حجرے سے نکل آئے، آپ کا چہرہ اسقدر سرخ ہو گیا تھا گویا عارضِ مبارک پر کسی نے انار کے دانے نچوڑ دیے ہیں، آپنے صحابہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کیا تم اسی لیے پیدا کیے گئے ہو؟ قرآن کو باہم ٹکرا رہے ہو، گذشتہ امتیں ان ہی باتوں سے برباد ہوئیں،[2]

ان مجالس کا مقصد یہ بھی تھا کہ صحابہ جن مسائل میں باہم اختلاف کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کا صحیح فیصلہ کر دیتے، مثلاً شہرت طلبی اور جاہ پرستی خلوص عمل کے منافی سمجھی جاتی ہے، اور خود صحابہ کے زمانہ میں بھی سمجھی جاتی تھی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں دو شخصوں نے اس مسئلہ میں گفتگو کی، ایک نے نے کہا اگر ہم نے دشمن سے مقابلہ کیا، اور ایک شخص نے فخریہ یہ کہکر نیزہ مارا کہ "میرا وار لینا میں غفاری جوان ہوں" تو اس میں تمہاری کیا رائے ہے؟ مخاطب نے جواب دیا، میری رائے میں کچھ ثواب نہ ملے گا، تیسرے آدمی نے یہ گفتگو سن کر کہا میرے نزدیک اس میں کوئی ہرج نہیں، اس پر دونوں میں اختلاف ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی گفتگو سنی تو فرمایا، ثواب اور شہرت دونوں میں کوئی مخالفت نہیں،[3]

عام خیال یہ تھا کہ قوائے عملیہ کے بیکار کر دینے کا نام تقدیر ہے، تقدیر میں جو کچھ لکھا ہو گا اسکو کوئی عملی طاقت مٹا نہیں سکتی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں جو اتفاقاً منعقد ہو گئی تھی، اس خیال کی تردید کی، اور فرمایا کہ اعمال تو خود تقدیر ہیں، انسان کو خدا جن اعمال کی توفیق دیتا ہے وہی اسکا نوشتہ ہیں، اسلیے توکل قوت عمل کے بیکار کر دینے کا نام نہیں، چنانچہ صحابہ ایک جنازہ میں شریک تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

۱ سنن ابن ماجہ صفحہ ۹ باب القدر ۲ ایضاً ۳ ابو داؤد جلد ۲ صفحہ ۱۱۳

Marfat.com

تشریف لائے اور صحابہ جمع ہو گئے، آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، اس سے زمین کریدنے لگے، پھر فرمایا، تم میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کی جگہ جنت یا دوزخ میں نہ لکھی جا چکی ہو، ایک شخص نے کہا تو ہم اپنی تقدیر پر توکل کر کے عمل کیوں نہ چھوڑ دیں، جو شخص سعادت مند ہوگا، وہ خود بخود سعادتمندوں میں داخل ہو جائیگا، اور جو شخص بدبخت ہوگا وہ بدبختوں سے جا ملے گا، آپ نے فرمایا سعادتمند وہ لوگ ہیں جن کو سعادتمندوں کے عمل کی توفیق دیجاتی ہے، اور بدبخت وہ ہیں جن کے لیے شقاوت کے کام کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں[۱]،

مجالس میں شگفتہ مزاجی | باوجود اس کے کہ ان مجالس میں صرف ہدایت، ارشاد، اخلاق اور تزکیہ نفوس کی باتیں ہوتی تھیں اور صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس طرح بیٹھتے تھے، کان الطیر فوق رؤسھم تاہم یہ مجلسیں شگفتہ مزاجی کے اثر سے خالی نہ تھیں، ایک دن آپ نے ایک مجلس میں بیان فرمایا کہ جنت میں خدا سے ایک شخص نے کھیتی کرنے کی خواہش کی، خدا نے کہا کیا تمھاری خواہش پوری نہیں ہوئی، اس نے کہا ہاں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ فوراً بوؤں اور ساتھ ہی طیار ہو جائے چنانچہ اس نے بیج ڈالے، فوراً دانہ اگا، بڑھا اور کاٹنے کے قابل ہوگیا، ایک بدو بیٹھا ہوا تھا، اس نے کہا یہ سعادت صرف قریشی یا انصاری کو نصیب ہوگی جو زراعت پیشہ ہیں لیکن ہم لوگ تو کاشتکار نہیں، آپ ہنس پڑے[۲]،

ایک دفعہ ایک صاحب خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میں تباہ ہوگیا، ارشاد ہوا کیوں؟ بولے میں نے رمضان میں بیوی سے ہمبستری کی، آپ نے فرمایا ایک غلام آزاد کرد،

---

[۱] بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۳۸ تفسیر وکذب بالحسنیٰ [۲] بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۱۲۱ باب کلام الرب مع اہل الجنۃ

Marfat.com

بولے غریب ہوں، غلام کہاں سے لاؤں، ارشاد ہوا، دو مہینے کے روزے رکھو، بولے یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا، فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، بولے اتنا مقدور نہیں، اتفاق سے کہیں سے زنبیل بھر کھجوریں آگئیں، آپ نے فرمایا لو غریبوں کو خیرات کرآؤ، عرض کی اس خدا کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنایا، سارے مدینہ میں مجھ سے بڑھ کر کوئی غریب نہیں، آپ بے ساختہ ہنس پڑے، اور فرمایا اچھا تم خود ہی کھالو[1]

فیض صحبت ایک دفعہ حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کی کہ ہم جب خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے ہیں تو دنیا ہیچ معلوم ہوتی ہے لیکن جب گھر میں بال بچوں میں بیٹھتے ہیں تو حالت بدل جاتی ہے، آپ نے فرمایا کہ اگر ایک سا حال رہتا تو فرشتے تمھاری زیارت کو آتے۔[2]

ایک دفعہ حضرت حنظلہؓ خدمت اقدس میں آئے، اور کہا یا رسول اللہ! میں منافق ہوگیا، میں جب خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتا ہوں اور آپ دوزخ وجنت کا ذکر فرماتے ہیں تو یہ چیزیں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں لیکن بال بچوں میں آکر سب بھول جاتا ہوں، ارشاد ہوا کہ اگر باہر نکل کر بھی وہی حالت رہتی تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے۔[3]

[1] بخاری صفحہ ۸۰۰ باب نفقۃ المعسر علی اہلہ [2] ترمذی شریف باب ما جاء فی صفۃ الجنۃ ونعیمہا، امام ترمذی کے نزدیک یہ حدیث قوی نہیں [3] ترمذی ابواب الزہد وصحیح مسلم کتاب التوبہ

خطابت نبویؐ

خطابت[1] اور تقریر، نبوت کا نہایت ضروری عنصر ہے، اسی بنا پر جب خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس پیغمبر بنا کر بھیجا تو ان کو یہ دعا مانگنا پڑی،

وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ — خداوندا میری زبان کی گرہ کھول کر لوگ میری بات سمجھیں،

لیکن سید الانبیاءؐ کو خود بارگاہ الٰہی سے یہ وصف کامل عطا کیا گیا تھا، چنانچہ آپ نے تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا،

انا افصح العرب — میں فصیح ترین عرب ہوں،

بعثت بجوامع الکلم — میں کلمات جامعہ لیکر مبعوث ہوا ہوں،

عرب میں اگرچہ ہر قبیلہ فصاحت و بلاغت کا مدعی تھا، تاہم تمام عرب میں دو قبیلے اس وصف میں نمایاں امتیاز رکھتے تھے، قریش اور بنو ہوازن، قریش خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ تھا، اور بنو ہوازن کے قبیلہ میں آپ نے پرورش پائی تھی اس لیے آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔

انا اعربکم انا من قریش ولسانی لسان بنی سعد بن بکر[2] — میں تم میں فصیح تر ہوں، قریشی ہوں اور میری زبان بنو سعد[3] کی زبان ہے،

طرز بیان | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت سادہ طریقہ پر خطبہ دیتے تھے، آپ جب اپنے حجرے سے خطبہ

---

[1] اضافہ تاختم باب [2] طبقات ابن سعد ج ۱ صفحہ ۱، [3] بنو سعد قبیلہ ہوازن کی ایک شاخ ہے،

کے لیے نکلتے تھے تو سلاطین کی طرح نہ آپکے ساتھ چاؤش ہوتے تھے، نہ آپ خطبا کا لباس پہنتے تھے ہاتھ میں صرف ایک عصا ہوتا تھا، اور کبھی کبھی کمان پر ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے[1]، ابن ماجہ میں ہے کہ مسجد میں جب آپ خطبہ دیتے تو دستِ مبارک میں عصا ہوتا تھا، اور میدانِ جنگ میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو کمان پر ٹیک لگاتے تھے،

جمعہ اور عید کا خطبہ تو متعین تھا لیکن اس کے علاوہ خطبہ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا جب ضرورت پیش آتی، آپ فی البدیہ خطبہ کے لیے تیار ہو جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ آپنے زمین پر، منبر پر، اونٹ پر جس جگہ جیسا موقع پیش آیا ہے خطبہ دیا ہے، ضرورت کے لحاظ سے اگرچہ آپ کو کبھی کبھی طویل خطبہ بھی دینا پڑتا تھا، تاہم آپکے خطبے عموماً مختصر ہوتے تھے،

عام نصائح اور پند کی باتیں گو آپ اخباری فقروں میں بیان فرماتے لیکن جب کلام کو خاص طور پر مؤثر بنانا ہوتا تھا، تو خطبہ کو عموماً سوال کی صورت میں شروع فرماتے تھے، غزوہ حنین میں آپنے انصار کے سامنے جو خطبہ دیا وہ اول سے آخر تک سوال و جواب ہی خطبۂ حجۃ الوداع وغیرہ اور تمام خطبات میں جیسا کہ آگے آتا ہے، یہ خصوصیت نمایاں ہی جوشِ بیان کا یہ حال تھا کہ آنکھیں سرخ اور آواز نہایت بلند ہو جاتی تھی، غصہ بڑھ جاتا تھا، انگلیاں اٹھتی جاتی تھیں، گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کسی فوج کو جنگ کے لیے ابھار رہے ہیں[2]، جوشِ بیان میں جسد مبارک جھوم جھوم جاتا تھا، ہاتھوں کو حرکت دینے سے پٹھوں کے کھنچنے کی آواز آتی تھی[3]، کبھی مٹھی بند کر لیتے تھے، کبھی کھول دیتے تھے، حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ نے اس قسم کی پرجوش حالت کی نہایت صحیح تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے،

---

[1] ابوداؤد جلد اکتاب الصلوٰۃ ابواب الجمعۃ والخطبۃ علی قوس [2] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبۃ صفحہ ۳۱۹ جلد ۱
[3] ابن ماجہ ذکر المبعث [4] مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۷۲

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی المنبر	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر خطبہ دیتے سنا، فرما رہے تھے کہ خداوند
یقول یأخذ الجبار سمٰوٰته وارضه بیده	صاحب جبروت آسمان و زمین کو اپنے ہاتھ میں لے لیگا،
وقبض یده فجعل یقبضها ویبسطها......	یہ بیان کرتے ہوئے آپ مٹھی بند کر لیتے تھے اور پھر کھول دیتے تھے...
قال ویتمایل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	......آپ کا جسم مبارک کبھی داہنے کبھی بائیں جھکتا جاتا تھا
عن یمینه وعن شماله حتی نظرت الی المنبر	یہاں تک کہ میں نے منبر کو دیکھا تو اس کا سب سے نچلا
یتحرک من اسفل شیء منه حتی انی لاقول	حصہ بھی اسقدر ہل رہا تھا کہ میں نے خیال کیا کہ آپ
اساقط هو برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابن ماجہ ذکر البعث)	لے کر گر تو نہیں پڑے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات کی نوعیت

احادیث کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات اور ان کے جستہ جستہ فقرے بغیر کسی خاص ترکیب کے جمع کر دیے گئے ہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف حیثیتیں تھیں، اور اس کا اثر آپ کے طرز بیان پر پڑتا تھا، آپ داعی مذہب تھے، فاتح تھے، واعظ تھے، امیر الجیش تھے، قاضی تھے، پیغمبر تھے، اس اختلاف حیثیت نے آپ کے خطابت اور زور بیان میں نہایت اختلاف پیدا کر دیا ہے، اور بلاغت کا اقتضا بھی یہی ہے، آپ بحیثیت داعیِ مذہب ہونے کے جو خطبہ دیتے تھے اس میں نہایت زور اور جوش پیدا ہو جاتا تھا، اور اس وقت آپ کی حیثیت بالکل ایک امیر الجیش کی ہوتی تھی، چنانچہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی،

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ	اپنے اقربا کو ڈراؤ۔

آپ نے تمام قریش کو جمع کر کے ایک خطبہ دینا چاہا، ابولہب کی شقاوت نے اگرچہ اس خطبہ کو پورا نہیں ہونے دیا، تاہم آپ کی زبان سے اس واقعہ پر جو چند جملے نکل گئے اس سے

Marfat.com

آپ کے زور بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ آپ نے صفا پر چڑھ کر پہلے پکارا "یا صباحاہ" یہ وہ لفظ ہے جو عرب میں اس وقت بولا جاتا ہے جب صبح کے وقت کوئی قبیلہ کسی قبیلہ پر دفعۃً غارت گری کے لیے ٹوٹ پڑتا ہے، تمام لوگ یہ لفظ سنکر چونک اٹھے، اور آپ کے گرد جمع ہو گئے، آپ نے فرمایا

أرأيتم ان أخبرتكم ان خيلا تخرج من سفح هذا الجبل أكنتم مصدقي

بتاؤ اگر میں تمھیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے دامن سے ایک فوج نکلا چاہتی ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے

سب نے جواب دیا، ابتک آپ کی نسبت ہم کو کسی قسم کی دروغ گوئی کا تجربہ نہیں ہوا ہے،

جب آپ نے یہ اقرار لے لیا تو فرمایا،

اني نذير لكم بين يدي عذاب شديد

میں تمھیں ایک بڑے سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو تمھارے سامنے ہے

ابولہب نے نہایت استخفاف کے ساتھ کہا، کیا ہم سبھوں کو اسی لیے جمع کیا تھا، یہ کہہ کر چل کھڑا ہوا۔[1]

غزوۂ حنین میں آپ نے تمام مال غنیمت مؤلفۃ القلوب کو دیدیا، اور انصار بالکل محروم رہ گئے، تو چند نوجوانوں کو یہ نہایت ناگوار ہوا، اور انھوں نے کہا خدا پیغمبر کی مغفرت کرے، قریش کو دیتا ہے اور ہم کو چھوڑ دیتا ہے، حالانکہ ہماری تلواروں سے خون ٹپک رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو تمام انصار کو ایک خیمہ میں جمع کرکے اصل حقیقت دریافت فرمائی، لوگوں نے کہا چند نوجوانوں نے یہ کہا ہے لیکن ہم میں جو صاحب الرائے اور سردار ہیں، انھوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا، اب آپ نے اس

[1] بخاری جلد ۲ ص ۷۴۳ تفسیر سورہ تبت

موقع پر کھڑے ہو کر ایک خطبہ دیا:

یا معشر الانصار الم اجدکم ضلالاً	اے گروہ انصار! کیا میں نے تم کو گمراہ نہیں پایا پس خدا نے
فہداکم اللہ بی وکنتم متفرقین فالفکم	میری وجہ سے تمھیں ہدایت دی، تم متفرق تھے، خدا نے میری وجہ سے
اللہ بی وعالۃ فاغناکم اللہ بی	تمکو مجتمع کر دیا، تم محتاج تھے، خدا نے میری وجہ سے تم کو غنی کر دیا،

انصار ہر بات پر کہتے جاتے تھے "خدا اور اس کا رسول بہت امین ہے" آپ نے فرمایا "یہ کیوں نہیں کہتے کہ اے محمد! تم اس حالت میں آئے تھے کہ لوگ تمھاری تکذیب کرتے تھے، ہم نے تمھاری تصدیق کی، تمھارا کوئی مددگار نہ تھا، ہم نے تمھاری مدد کی، تم گھر سے نکالے ہوئے تھے، ہم نے تم کو گھر دیا، تم محتاج تھے ہم نے تمھاری غمخواری کی" اس کے بعد آپ نے اصل اعتراض کا جواب دیا۔

اترضون ان یذہب الناس بالشاۃ و	کیا تم یہ نہیں پسند کرتے کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لیکے جائیں
البعیر وتذہبون بالنبی الی رحالکم فواللہ	اور تم اپنے گھروں میں خود پیغمبر کو لیکے جاؤ، خدا کی قسم تم لوگ جو لیکر
لما تنقلبون بہ خیر مما ینقلبون	واپس جاتے ہو وہ اس سے بہتر ہے جسکو تمام لوگ لیکر جاتے ہیں۔

اس پر تمام انصار پکار اٹھے "رضینا" یعنی ہم سب راضی ہیں[1]،

اس خطبہ کے وجوہ بلاغت پر اگر غور کیا جائے تو ایک مختصر سا رسالہ تیار ہو سکتا ہے،

فاتحانہ حیثیت سے آپ نے صرف فتح مکہ کے موقع پر ایک تقریر کی تھی جس کے جستہ جستہ فقرے احادیث کی کتابوں میں مذکور ہیں، مکہ عرب کے نزدیک نہایت مقدس شہر تھا، حرم ایک دار الامان تھا، جس میں کبھی خونریزی نہیں ہو سکتی تھی، فتح مکہ میں سب سے پہلے اسکے دامن عظمت پر خون کا دھبہ لگایا گیا،

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ حنین،

اور چونکہ مذہب کے ہاتھ سے لگایا گیا تھا، اس لیے خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ ہمیشہ کے لیے اس کا یہ احترام نہ مٹ جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہی دونوں پہلوؤں پر اپنی تقریر میں زور دینا تھا، چنانچہ آپ نے بہ ترتیب ان ہی کی طرف توجہ کی، سب سے پہلے آپ نے صحابہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا،

ان اللہ حرم مکۃ یوم خلق السموات والارض	خدا نے جس دن آسمان اور زمین کو پیدا کیا، اسی دن مکہ کو حرام
فھی حرام بحرام اللہ الی یوم القیمۃ لم تحل لاحد	کر دیا پس وہ بحرمت خدا حرام ہے، وہ مجھ سے پہلے نہ کسی پر حلال ہوا
قبلی ولا تحل لاحد بعدی ولم تحل لی	اور نہ میرے بعد حلال ہوگا، اور میرے لیے بھی بجز چند گھنٹوں کے
قط الا ساعۃ من الدھر لا ینفر صیدھا	ہرگز حلال نہیں ہوا، نہ اس کے شکاروں کو بھڑکایا جا سکتا، نہ
ولا یعضد شوکھا ولا یختلی خلاھا ولا	اس کا کانٹا کاٹا جا سکتا، نہ اس کی گھاس کاٹی جا سکتی، نہ اس کی گمشدہ
تحل لقطتھا الا لمنشد	چیز حلال ہو سکتی ہے بجز اس شخص کے جو اس کو ڈھونڈ رہا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے مہتم بالشان خطبہ وہ ہے جو آپ نے حجۃ الوداع میں دیا تھا، یہ خطبہ صرف احکام کا ایک سادہ مجموعہ ہے جس کو قدرۃً خشک اور روکھا پھیکا ہونا چاہیے، تاہم سلاست، روانی اور شستگیِ الفاظ کے لحاظ سے یہ خطبہ بھی اور خطبوں سے کم نہیں، آپ نے حمد و نعت کے بعد اس خطبہ کی اہمیت اس طرح ظاہر کی۔

ایھا الناس اسمعوا فانی لا ادری لعلی لا القاکم	لوگو! سنو! کیونکہ شاید میں اس سال کے بعد اس جگہ
بعد عامی ھذا فی موقفی ھذا فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا	اس مہینہ میں، اس شہر میں تم سے نہ مل سکوں۔

سادہ سا جملہ یہ تھا کہ غالباً یہ میری عمر کا آخری سال ہے لیکن اس تفصیل اور اس پیرایۂ بیان نے اس مفہوم کو اور بھی زوردار بنا دیا ہے، آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی عزت، آبرو، جان، مال سب مسلمانوں پر حرام ہے، اس مطلب کو اس بلیغ طریقہ سے ادا کیا ہے،

اتدرون ای یوم ھذا قالوا اللہ ورسولہ	کیا جانتے ہو کہ یہ کون سا دن ہے؟ لوگوں نے کہا خدا اور رسول
اعلم قال فان ھذا یوم حرام افتدرون	کو اس کا علم ہے، آپ نے فرمایا یہ یوم الحرام ہے، کیا جانتے ہو کہ
ای بلد ھذا، قالوا اللہ ورسولہ اعلم قال	یہ کونسا شہر ہے؟ لوگوں نے کہا خدا اور رسول کو اسکا علم ہے،
بلد حرام قال اتدرون ای شھر ھذا	آپ نے فرمایا بلد الحرام ہے، کیا جانتے ہو یہ کونسا مہینہ ہے؟ لوگوں
قالوا اللہ ورسولہ اعلم قال شھر حرام	نے کہا خدا اور رسول کو اسکا علم ہے، آپ نے فرمایا شہر حرام ہے،

اس طرح جب لوگوں کے دل میں اس دن، اس مہینہ اور اس شہر کی حرمت کا خیال تازہ ہوگیا تو آپ نے اصل مقصود کو بیان فرمایا،

ان اللہ حرم علیکم دماءکم واموالکم	خدا نے تمہارا خون، تمہارا مال، تمہاری آبرو تم پر
اعراضکم کحرمۃ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا	اس مہینہ میں، اس شہر میں، اس دن کی حرمت کی
فی بلدکم ھذا، لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب	طرح حرام کیا ہے، میرے بعد کافر ہو جانا کہ تم میں
بعضکم رقاب بعض	ہر ایک دوسرے کی گردن مارے،

آپ نے ان الفاظ میں مساوات کی تعلیم دی ہے:

ان ربکم واحد وان اباءکم واحد کلکم	تمہارا خدا ایک، تمہارا باپ ایک، تم سب آدم کی
من آدم وآدم من تراب ان اکرمکم	اولاد ہو، اور آدم مٹی کے تھے، خدا کے نزدیک تم میں
عِندَ اللہِ اَتقَاکُم	شریف تر وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے،

عرب کا عام ذریعہ معاش غارتگری تھی لیکن شہر حرم کے چار مہینے تک وہ لوگ بیکار نہیں رہ سکتے تھے، اس لیے ان مہینوں کو ادل بدل کیا کرتے تھے جسکو نسی کہتے ہیں، قرآن مجید نے اسکی ممانعت کی

Marfat.com

اِنَّمَا النَّسِیُّ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ	نسئی کفر میں اضافہ کرتی ہے۔

آپ نے اپنے خطبہ میں اس کا اعلان ان الفاظ میں فرمایا:

ان الزمان قد استدار کھیئۃ یوم خلق	زمانہ ہر پھر کے پھر اسی مرکز پر آگیا جیسا کہ اس دن تھا
اللہ السموات والارض	جب خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا۔

ان حیثیتوں کے علاوہ آپ کی حیثیت ایک معلم اور واعظ کی تھی، آپ نے اس حیثیت سے جو خطبے دیے ہیں وہ اگرچہ نہایت سادہ ہیں تاہم ان میں بھی بلاغت کا اسلوب موجود ہے، ایک اخلاقی وعظ کے لیے پیچدار ترکیب، شاندار الفاظ اور تشبیہ و استعارہ کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کو صرف سادہ الفاظ، واضح جملے اور مختصر ترکیبوں سے مطالب کو ذہن نشین کرنا پڑتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حیثیت سے جو خطبے دیے ہیں، وہ تمام تر اسی قسم کے ہیں، مدینہ آکر سب سے پہلا فقرہ جو زبان مبارک سے نکلا یہ تھا۔

یاایھا الناس، افشوا السلام، واطعموا	لوگو! اسلام پھیلاؤ، کھانا کھلایا کرو، نماز پڑھا کرو، جب
الطعام، وصلوا والناس نیام، تدخلوا الجنۃ بسلام	لوگ سوتے ہوں جنت میں سلامتی کیساتھ داخل ہو جاؤ گے

مدینہ میں جو سب سے پہلا جمعہ آپ نے پڑھا ہے، ابن اسحاق کی روایت کے مطابق حمد و ثنا کے بعد اس میں آپ نے یہ خطبہ دیا تھا،

امابعد ایھا الناس فقدموا لانفسکم تعلمن	حمد و ثنا کے بعد اے لوگو! اپنے لیے پہلے سے سامان کر لو، تم کو
واللہ لیصعقن احدکم ثم لیدعن غنمہ لیس	معلوم ہو جائیگا کہ خدا کی قسم تم میں سے ایک جب بے ہوش
لھا راع ثم لیقولن لہ ربہ لیس بینہ ترجمان	ہو کر گرے گا اور اپنی بکریوں (مال و دولت) کو چھوڑ جائیگا

حاجب يحجبه دونه الم يأتك رسولی فبلغك
وآتيتك مالا وافضلت عليك فما قدمت
لنفسك فلينظرن يمينا وشمالا فلا يری
شيئا ثم لينظرن قدامه فلا يری غير جهنم
فمن استطاع ان يتقی بوجهه من النار ولو
بشق من تمرة فليفعل ومن لم يجد فبكلمة
طيبة فانها تجزی الحسنة بعشر امثالها
الی سبع مائة ضعف والسلام عليكم
ورحمة الله وبركاته ۔

جسکا کوئی نگہبان نہ ہوگا، پھر خدا اس کے لیے بیچ میں کوئی ترجمان ہے
نہ دربان ہو جو روکے گا اس سے کہے گا کہ کیا تیرے پاس میرا فرستادہ
نہیں آیا، اور میرا پیغام نہیں پہنچایا اور میں نے تم کو دولت نہیں دی
اور حاجت سے زیادہ نہیں عطا کیا، تو، تونے اپنے لیے پہلے سے کیا سامان
کیا، اسوقت وہ بندہ داہنے بائیں دیکھے گا تو اسکو کچھ نظر نہیں آئیگا۔ اپنے
سامنے دیکھے گا تو جہنم کے سوا اسکو کوئی چیز نظر نہیں آئیگی بس جسکو قدرت
ہو وہ اپنے کو اس آگ سے بچائے گو چھوہارے کے ایک ٹکڑے ہی سے کیوں نہو
کسی کے پاس یہ بھی نہو تو ایک اچھی اور خوش اخلاقی کی بات ہی سہی کیونکہ
ایک نیکی کا بدلہ دس گونہ بلکہ ہفتصد گونہ دیا جائیگا تم پر خدا کی سلامتی اور

اس کے بعد دوسری دفعہ آپ نے فرمایا۔

الحمد لله احمده واستعينه ونعوذ بالله من
شرور انفسنا ومن سيآت اعمالنا من يهدی الله
فلا مضل له ومن يضلل فلا هادی له و
اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له
ان احسن الحديث كتاب الله قد افلح من زينه
الله فی قلبه وادخله فی الاسلام بعد
الكفر فاختاره علی ما سواه من احاديث

خدا کی حمد ہو، میں خدا کی حمد کرتا ہوں اور اسکے دامن میں اپنے نفس کی
برائیوں اور اپنے اعمال کی خرابیوں سے پناہ چاہتے ہیں جسکو خدا ہدایت دے
اسکو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسکو وہ ہدایت نکرے اسکی کوئی رہنمائی
کرنیوالا نہیں میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں
وہی تنہا ہے کوئی اسکا شریک نہیں، بہترین کلام خدا کی کتاب ہے کامیاب
ہوا وہ جسکے دلکو خدا نے اس سے آراستہ کیا اور اسکو کفر کے بعد
اسلام میں داخل کیا، اور انسانوں کی باتوں کو چھوڑ کر خدا کے کلام کو

Marfat.com

الناس انه احسن الحدیث وابلغه
احبّوا ما احب الله احبوا الله من کل
قلوبکم، ولا تملوا کلام الله وذکره
ولا تقس عنه قلوبکم فاعبدوا الله
ولا تشرکوا به شیئا واتقوه حق تقاته
وصدقوا الله صالح ما تقولون بافواهکم
وتحابوا بروح الله بینکم ان الله یغضب
ان ینکث عهده، والسلام علیکم
ورحمة الله وبرکاته

پسند کیا، کیونکہ خدا کا کلام سب سے زیادہ بہتر اور سب سے زیادہ پراثر ہے
جسکو خدا دوست رکھتا ہے تم بھی دوست رکھو اور خدا کو دل سے
پیار کرو اور اسکے کلام اور ذکر سے کبھی نہ تھکو اور تمھارے دل
اس کی طرف سے سخت نہ ہوں، پس خدا ہی کو پوجو اور کسی کو
اس کا ساجھی نہ بناؤ، اور اس سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا
حق ہے، اور خدا سے سچی بات کہو اور آپس میں ایک دوسرے
کو ذات الٰہی کے واسطہ سے پیار کرو، خدا اس سے ناراض
ہوتا ہے کہ کوئی اپنے عہد کو پورا نہ کرے۔ تم پر خدا کی
سلامتی اور رحمت اور برکت نازل ہو۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا جس میں صرف پانچ باتیں بیان کیں،

الله لا ینام ولا ینبغی له ان ینام یخفض
القسط ویرفعه یرفع الیه عمل اللیل قبل عمل
النهار، وعمل النهار قبل عمل اللیل
حجابه النور (صحیح مسلم روایة الله تعالیٰ)

ہاں خدا سوتا نہیں، اور نہ سونا اسکی ذات کے شایان شان
ہے، وہی قسمت کو پست و بلند کرتا ہے، رات کے اعمال
اس کو دن سے پہلے پہنچ جاتے ہیں، اور دن کے اعمال رات
سے پہلے، خدا کا پردہ نور ہے۔

جمعہ کے خطبہ میں عموماً زہد و رقاق، حسن اخلاق، خوف قیامت، عذاب قبر، توحید، صفات الٰہی بیان کرتے تھے، ہفتہ میں کوئی عظیم الشان واقعہ پیش آتا تھا تو اس کے متعلق ہدایت فرماتے تھے اکثر ایسا بھی کرتے کہ خطبہ کے بجائے قرآن مجید کی انہی مضامین کی کوئی موثر سورت ق وغیرہ

Marfat.com

دیا کرتے یہ ہوہ آپ جمعہ کے خطبہ میں اکثر و بیشتر پڑھا کرتے تھے، عید کے خطبہ میں ان مضامین کے علاوہ صدقہ پر خاص طور پر زور دیتے تھے، اتفاقی خطبے ضرورت کے موقع پر دیا کرتے تھے اور ان میں مقتضائے وقت کے مناسب مطالب بیان فرماتے تھے، ایک دفعہ آفتاب میں گہن لگا اتفاق سے اسی دن آپکے کمسن فرزند حضرت ابراہیمؑ نے وفات پائی تھی، مزعومات عرب کے مطابق لوگوں نے کہا کہ یہ گہن اسی لیے لگا ہے۔ آپنے اس موقع پر حسب ذیل خطبہ دیا،

اما بعد یا ایها الناس انما الشمس و القمر	حمد و ثنا کے بعد، لوگو! آفتاب و ماہتاب خدا کی
آیتان من آیات الله و انهما لا ینکسفان	دو نشانیاں ہیں، وہ کسی کے مرنے سے تاریک
لموت احد من الناس	نہیں ہوتے،
ما من شیء لم اکن رأیته الا وقد رأیته	جس چیز کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا، اسکو میں
من مقامی هذا حتی الجنة و النار و انه	دیکھ لیا، یہانتک کہ جنت دوزخ کو بھی، اور یہاں مجھے
قد اوحی الی انکم تفتنون فی القبور مثل	وحی کیگئی ہو کہ تم قبروں میں آزمائے جاؤ گے جس طرح
فتنة الدجال فیوتی احدکم فیقال	دجال سے آزمائے جاؤ گے، تم میں سے ہر ایک شخص کے
ما علمك بهذا الرجل فاما المؤمن فیقول	پاس ایک آنے والا آئیگا اور پوچھے گا کہ اس شخص
هو محمد هو رسول الله جاء بالبینات	(یعنی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی نسبت کیا جانتے ہو، یقین
والهدی فاجبنا و اطعنا، اما المرتاب	والے کہیں گے کہ یہ محمدؐ ہیں، یہ خدا کے رسول ہیں، جو نشانیاں
فیقول لا ادری سمعت الناس یقولون	اور ہدایتیں لیکر آئے تو ہم نے انکو قبول کیا اور انکی پیروی کی
شیئا فقلت	اور شک کرنے والے کہیں گے ہیں نہیں جانتا لوگوں کو جو کہتے سنا وہ کہدیا

انہ عرض علی کل شیٔ تولجونہ فعرضت
علی الجنۃ حتی لوتنارلت منہا قطفا اخذتہ
فقصرت یدی عنہ وعرضت علی النار فرأیت
فیہا امرأۃ تعذب فی ھرۃ لہا ربطتہا فلم
تطعمہا ولم تدعہا تاکل من حشاش الارض
ورأیت اباثمامۃ عمرو بن مالک یجر قصبہ
فی النار وانہم کانوا یقولون ان الشمس والقمر
لا ینخسفان الا لموت عظیم وانہ ایتان
من ایات اللہ یریکموھما فاذا اخسفا
فصلوا حتی تنجلی[۱]

میرے سامنے وہ تمام مقامات پیش ہوئے جن میں تم
داخل ہوگے تا آنکہ اگر میں چاہتا تو اسکا پھل توڑلیتا، لیکن
میرے ہاتھ رک گئے، دوزخ میری سامنے دکھائی گئی، میں نے
اس میں ایک عورت کو دیکھا جسکو صرف اسلیے سزا دیجا رہی
تھی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا، اسکو خود کچھ کھانے
کو دیتی تھی اور نہ چھوڑتی تھی کہ وہ زمین کی گری پڑی
کوئی چیز کھائے، میں نے دوزخ میں ابوثمامہ عمرو بن مالک
کو دیکھا، تو یہ وہ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ آفتاب ماہتاب میں
کسی بڑے آدمی کی موت سے گہن لگتا ہے، حالانکہ وہ تو خدا
کی دو نشانیاں ہیں، جب تم گہن دیکھو تو نماز کیلیے کھڑے ہو

[۱] لہ [illegible]

رد بدعت اور اعتصام بالسنۃ میں آپ کا یہ مختصر خطبہ بتغیر الفاظ حدیث کی اکثر کتابوں میں منقول ہے:

انما ھما اثنتان الکلام والھدی فاحسن
الکلام کلام اللہ فاحسن الھدی ھدی
محمد الا وایاکم محدثات الامور فان شر
الامور محدثاتہا وکل محدثۃ بدعۃ وکل
بدعۃ ضلالۃ الا لایطولن علیکم الامد فتقسوا قلوبکم الا ان ما ھو آت

صرف دو باتیں ہیں، قول اور عملی طریقہ، تو عمدہ کلام خدا کا
کلام ہے اور عمدہ طریقہ محمد کا طریقہ ہے، خبردار (مذہب میں)
نئی باتوں سے بچو، نئی باتیں بدترین چیزیں ہیں، ہر نئی بات
بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے، تمکو درازی عمر کا خیال
پیدا ہو کہ تمہارے دل سخت ہو جائیں، اور جو چیز
آنے والی ہے وہ قریب ہے، دور وہ چیز ہے جو آنیوالی نہیں ہے

لہ صحیح مسلم بروایت مشکوٰۃ

قریب وان البعید ما لیس بآت الا انما الشقی	بدبخت وہی ہے جو ماں کے پیٹ میں بدبخت ہوتا ہے، خوش نصیب
من شقی فی بطن امہ والسعید من وعظ	وہ ہے جو غیر سے موعظت حاصل کرے، خبردار!
بغیرہ الا ان قتال المومن کفر وسبابہ	مسلمان سے لڑنا کفر اور اس کو گالی گلوچ کرنا فسق ہے
فسوق ولا یحل لمسلم ان یھجر اخاہ	مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ
فوق ثلاث الا وایاکم والکذب	اپنے بھائی سے رنجیدہ رہے، ہاں خبردار جھوٹ
(ابن ماجہ) باب اجتناب البدع	سے پرہیز کرنا

اثرانگیزی خطبات نبوی تاثیر اور رقت انگیزی میں درحقیقت معجزہ الٰہی تھے، پتھر سے پتھر دل بھی ان کو سنکر چند لمحوں میں موم ہو جاتے تھے، مکہ میں ایک دفعہ آپ نے سورۂ والنجم کی آیتیں تلاوت کرکے سنائیں تو یہ اثر ہوا کہ آپ کے ساتھ مسلمان تو مسلمان، بڑے بڑے کفار بھی سجدہ میں گر پڑے[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ جاہلیت کے ایک دوست جو جھاڑ پھونک کرنا جانتے تھے، یہ سن کر کہ نعوذ باللہ آپ کو جنون ہے، بغرض علاج آئے، آپ نے ان کے سامنے مختصر سی تقریر کی، انھوں نے کہا کہ محمد ذرا اس کو پھر تو دہرانا، غرض آپ نے کئی دفعہ تقریر دہرائی تو انھوں نے کہا "میں نے شاعروں کے قصیدے اور کاہنوں کے کلام سنے ہیں لیکن یہ تو چیز ہی اور ہے"[۲]

ایک دفعہ ایک نومسلم قبیلہ ہجرت کرکے مدینہ آیا، آپ نے ان کی امداد کی ضرورت سمجھی، مسجدِ نبوی میں تمام مسلمان جمع ہوئے تو آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی کہ تمام انسان ایک ہی نسل سے ہیں، یعنی

۱؎ صحیح بخاری سورۂ والنجم ۲؎ صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ وقصر الخطبہ

Marfat.com

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ اے لوگو! اس خدا سے ڈرو جس نے ایک ذات سے تم سب کو پیدا کیا،

پھر سورۂ حشر کی یہ آیت تلاوت کی، وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ۔

اس کے بعد فرمایا "درہم، کپڑا، غلہ بلکہ چھوہارہ کا ایک ٹکڑا جو ہو، راہ خدا میں دو" مدینہ کے مسلمانوں کی مالی حالت جیسی تھی وہ سیرت کے ہر صفحہ سے ظاہر ہے، لیکن باینہمہ آپکی رقت انگیز اور مؤثر تقریر سے یہ عالم پیدا ہو گیا کہ ہر صحابی کے پاس جو کچھ تھا، اس نے سامنے رکھدیا بعضوں نے اپنے کپڑے اتار دیئے، کسی نے گھر کا غلہ لا کر دیدیا، ایک انصاری گئے اور گھر سے اشرفیوں کا ایک توڑا اٹھا لائے جو اسقدر بھاری تھا کہ بمشکل ان سے اٹھ سکتا تھا، راوی کا بیان ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد آپ کے سامنے غلہ اور کپڑے کے دو بڑے بڑے ڈھیر لگ گئے، اور خوشی سے آپ کا چہرہ کندن کی طرح دمکنے لگا،[1]

سخت سے سخت اشتعال انگیز اوقات میں آپ کے چند فقرے معاملہ کو رفع دفع کر کے جوش محبت کا دریا بہا دیتے تھے، اوس و خزرج کی سالہا سال کی عداوتیں اسی اعجاز کی بدولت مبدل بہ محبت ہو گئیں، غزوہ بدر سے پہلے آپ ... پ سوار ہو کر نکلے مسلمان اور منافقین یکجا بیٹھے ہوئے تھے، مسلمانوں نے تو ادب سے سلام کیا لیکن منافقین نے ایک گستاخانہ فقرہ استعمال کیا، یہ چنگاری تھی جس نے خرمن میں آگ لگا دی، قریب تھا کہ جنگ و جدل برپا ہو جائے لیکن آپ کے چند فقروں نے آگ پر پانی ڈالدیا،[2]

---

[1] صحیح مسلم باب الصدقات [2] صحیح بخاری السلام علی جماعۃ فیہا المسلم والکافر۔

غزوۂ مصطلق سے واپسی میں ایک واقعہ پر منافقین نے اشتعال پیدا کیا اور بہت ممکن تھا کہ مہاجرین و انصار باہم دست و گریبان ہو جائیں کہ عین وقت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی، آپ تشریف لائے تو اس طرح تقریر فرمائی کہ چند لمحوں میں مہاجرین و انصار پھر شیر و شکر تھے۔ واقعۂ افک میں اوس و خزرج میں اسقدر اختلاف پیدا ہوا کہ خاص مسجد نبوی میں شاید تلواریں نیام سے نکل پڑیں آپ منبر پر تشریف فرما تھے، آپ نے سلسلۂ تقریر جاری رکھا اور یہ اثر تھا کہ برادرانہ محبت کی لہریں پھر جاری ہو گئیں

غزوۂ حنین میں مال غنیمت کی تقسیم پر جب انصار میں آزردگی پیدا ہو گئی تھی، اس وقت آپ نے جس بلیغانہ انداز میں تقریر فرمائی ہے، اس کا مختصر سا ذکر اوپر گذر چکا ہے، اس تقریر کا کیا اثر ہوا؟ یہ ہوا کہ وہی انصار جو چند لمحے پہلے کبیدہ خاطر ہو رہے تھے، اسقدر روئے کہ انکی داڑھیاں تر ہو گئیں اور دل کا سارا غبار آب کوثر کے ان قطروں سے دفعۃً دھل گیا،

فتح مکہ کے موقع پر انصار کی توقع کے خلاف جب آپ نے رؤسائے قریش کی جان بخشی فرمائی تو ان میں سے وہ لوگ جنکی آنکھوں میں خلق نبوی کا جلوہ نہ تھا معترض ہوئے کہ آخر آپ کو اپنے وطن و خاندان کی محبت آہی گئی" آپ کو یہ معلوم ہوا تو تمام انصار کو جمع کر کے دریافت کیا کہ کیا یہ سچ ہے کہ تم نے ایسا کہا ہے، عرض کی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا" وطن و خاندان کی پاسداری میرے پیش نظر نہ تھی، میں خدا کا بندہ اور اس کا فرستادہ ہوں میں نے اللہ کیطرف ہجرت کی اور تمہاری طرف اب میرا جینا تمہارا جینا ہے، اور میرا مرنا تمہارا مرنا ہے" یہ سنکر انصار پر رقت طاری ہو گئی اور رونے لگے،

وعظ و نصیحت میں جو خطبات آپ ارشاد فرماتے تھے، وہ بھی اسی قدر مؤثر ہوتے تھے۔

---

[1] صحیح بخاری تفسیر منافقین و باب سعد غزوۂ مذکور [2] صحیح بخاری قصۂ افک [3] صحیح مسلم فتح مکہ

Marfat.com

ایک صحابی موقع کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں،

وعظنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوماً بعد الصلوٰۃ	صبح کی نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ایسا
الغداۃ موعظۃ بلیغۃ ذرفت منہا العیون و	مؤثر وعظ کہا کہ آنکھیں اشک ریز ہوگئیں، اور دل
وجلت منہا القلوب، (ترمذی وابوداؤد)	کانپ اٹھا

ایک اور مجلس وعظ کے تاثر کی کیفیت حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ بیان کرتی ہیں،

قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطیبا فذکر فتنۃ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کو کھڑے ہوئے اور اس میں
القبر التی یفتتن بہا المرء فلما ذکر ذلک	فتنۂ قبر کو بیان کیا جس میں انسان کی آزمائش کی جائے گی،
ضج المسلمون ضجۃ[1]	جب یہ بیان کیا تو مسلمان چیخ اٹھے۔

حضرت ابوہریرہؓ اور ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے کہ آپکی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ، قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے" یہ الفاظ آپنے تین دفعہ فرمائے اور پھر جھک گئے، لوگوں پر یہ اثر ہوا کہ جو جہاں تھا وہیں سر جھکا کر رونے لگا، راوی کہتے ہیں کہ ہم کو بھی ہوش نہ رہا کہ آپ قسم کس بات پر کھا رہے ہیں[2]۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن آپنے خطبہ دیا، یہ خطبہ اسقدر مؤثر تھا کہ میں نے ایسا خطبہ نہیں سنا، اثنائے تقریر میں آپنے فرمایا "اے لوگو! جو میں جانتا ہوں اگر تم وہ جانتے تو ہنستے کم اور روتے زیادہ" اس فقرہ کا ادا ہونا تھا کہ لوگوں کی یہ حالت ہوگئی کہ منہ پر کپڑے ڈال کر بے اختیار رونے لگے[3]۔

---

[1] صحیح بخاری ج ا. فی عذاب القبر [2] سنن نسائی کتاب الزکوٰۃ [3] صحیح بخاری تفسیر سورہ مائدہ

عباداتِ نبوی

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ؕ

اے محمد جب تجھے فرصت ملے عبادت کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور اپنے رب سے دل لگاؤ

(۱) دنیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا، اور کوئی ایسا پیغمبر نہیں گذرا جس کے متعلق صحیح طور پر معلوم ہو سکے کہ اسکا طریقۂ عبادت کیا تھا؟ اسکے کون کون سے اوقات اس کیلئے مخصوص تھے؟ اور انکی عبادتوں کی نوعیت کیا تھی؟ گذشتہ انبیاء میں حضرت نوحؑ، بلکہ آدمؑ سے لیکر حضرت موسیٰؑ تک جنکے حالات تورات میں مذکور ہیں، انکی زندگی کا یہ باب صحائفِ بنی اسرائیل سے قطعاً مفقود ہے، انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہیں کہیں صرف اسقدر ملتا ہے کہ وہ کبھی کبھی دعائیں مانگا کرتے تھے لیکن چونکہ ان مذاہب کے پیرووں نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ اسقدر بے اعتنائی برتی ہے کہ یہ ضروری امور بھی جن پر دین و شریعت کا دارومدار ہے وہ محفوظ نہیں رکھ سکے، پیروانِ اسلام کو یہ فخر ہے کہ انھوں نے اول سے آخر تک اپنے پیغمبر کی ادائے عبادات، اسکے طریقے، اسکے انواع، اسکی کیفیات، غرض اسکی ایک ایک جزئیات کو محفوظ رکھا ہے۔

دعا اور نماز | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے بھی عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے، اور غار حرا میں جا کر[۲] مہینوں قیام اور مراقبہ کرتے تھے، نبوت کے ساتھ ساتھ آپ کو نماز کا طریقہ بھی بتایا گیا لیکن چونکہ کفار قریش کا ڈر تھا، اسلیے چھپ کر نماز ادا کرتے تھے، نماز کا وقت جب آتا، کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور وہاں نماز پڑھ لیتے، ایک دفعہ آپ حضرت علیؓ کے ساتھ کسی درہ میں نماز پڑھ رہے تھے، اتفاق سے ابوطالب آ نکلے، انھوں نے

[۱] اضافہ تا ختم باب [۲] صحیح بخاری باب بدء الوحی

دیکھا تو پوچھا "بھتیجے! یہ تم کیا کر رہے ہو؟" آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی[1]،

چاشت کی نماز آپ سب کے سامنے حرم ہی میں ادا کرتے تھے، کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب[2] میں بھی جائز تھی، صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دن آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، اور رؤسائے قریش بیٹھے تمسخر کر رہے تھے، ابو جہل نے کہا "کاش اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھا لاتا، اور محمد جب سجدہ میں جاتے تو وہ ان کی گردن پر ڈال دیتا"۔ چنانچہ اس تجویز کے مطابق یہ فرض عقبہ نے انجام دیا[3]۔ نمازیں جب آپ جہر سے قرأت فرماتے تو کفار برا بھلا کہتے[4]۔

ایک دفعہ آپ حرم میں نماز ادا کر رہے تھے بعض اشقیا نے چاہا کہ آپ کے ساتھ گستاخی سے پیش آئیں[5]، ایک دفعہ ایک شقی نے گلے میں پھانسی ڈال دی[6]۔ لیکن با ایں ہمہ مزاحمت، لذت شناس یاد الٰہی اپنے فرض سے باز نہیں آتا تھا،

راتوں کو اٹھ اٹھ کر آپ نمازیں پڑھا کرتے تھے[7]۔ اس عبادت شبانہ کے متعلق مختلف صحابہ سے مختلف روایتیں ہیں، ایک راوی کا بیان ہے کہ آپ رات بھر نمازیں کھڑے رہے، ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ آپ کچھ دیر سوتے، پھر کچھ دیر اٹھ کر نماز میں مصروف ہوتے، پھر سو جاتے پھر اٹھ بیٹھتے اور نماز ادا کرتے بغرض صبح تک یہی حالت قائم رہتی، ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آدھی رات کے بعد آپ اٹھتے تھے اور ۱۳ رکعتیں ادا کرتے تھے، حضرت عائشہؓ کی روایت ۹ رکعت کی ہے، محدثین نے ان سب میں یہ تطبیق دی ہے کہ آپ ان طریقوں میں سے ہر ایک طریقہ سے نماز ادا کرتے تھے، ہر راوی نے اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے[8]

[1] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۹۵ و [2] ابن اثیر [3] صحیح بخاری باب الطہارۃ والصلوٰۃ [4] صحیح بخاری تفسیر سورہ بنی اسرائیل [5] ابن ہشام، ذکر قبل ہجرت [6] صحیح بخاری باب مالقی النبی بمکہ [7] اس بحث کو زرقانی نے شرح مواہب میں بتفصیل لکھا ہے، ج ۱، ص ۵۵ہم

عام طور پر آخر میں آپ کا طرزِ عمل وہی تھا جو حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کی زبانی عبادتِ شبانہ کے عنوان میں گذر چکا ہے،

فرائض پنجگانہ کے علاوہ آپ کم از کم سنن و نوافل کی ۳۹ رکعتیں روزانہ معمولاً ادا کرتے تھے، دو صبح چار چاشت، چھ ظہر، چھ عصر، چار پہلے اور دو بعد نماز (حسب روایت حضرت عائشہؓ) دو مغرب، چھ عشا، تیرہ تہجد، دو وتر، ان کے علاوہ صلوٰۃ الاوابین، سنت تحیت مسجد وغیرہ الگ تھیں، تمام سنن میں سب سے زیادہ صبح کی دو رکعتوں کے آپ سختی سے پابند تھے[1] کسی وقت کی سنت خلاف معمول اگر چھوٹ جاتی تو اس کی قضا پڑھتے، حالانکہ اصل شریعت کی رو سے اسکی ضرورت عام امت کے لیے نہیں، ایسا واقعہ حضر میں صرف ایک ہی دفعہ پیش آیا ہے ظہر و عصر کے درمیان ایک وفد خدمت اقدس میں باریاب ہوا جسکی وجہ سے آپ ظہر کے بعد کی دو رکعت نہ پڑھ سکے، نماز عصر کے بعد آپ نے بعض ازواج مطہرات کے حجروں میں جاکر دو رکعت نماز ادا کی، چونکہ یہ نماز بالکل خلاف معمول تھی، اس لیے ازواج مطہرات نے استفسار کیا، آپ نے واقعہ بیان فرمایا، عام امت کے لیے ایک نماز کی قضا ایک دفعہ کافی ہے، لیکن آپ جس چیز کو شروع کرتے تھے، پھر اس کو ترک کرنا پسند نہیں فرماتے تھے، اسلیے ام المومنین حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ آپ نے اس قضا کو تمام عمر ادا کیا۔[2]

رمضان کا مہینہ آپ کی عبادتوں کے لیے سب سے زیادہ ذوق افزا تھا، حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ آپ فیاض تو تھے ہی لیکن جب رمضان کا مہینہ آتا اور جبرئیلؑ قرآن سنانے آتے تو آپ کی فیاضی کی کوئی حد نہ رہتی، آپکی فیاضی ہوا سے آگے نکلجاتی،[3] رمضان کے آخری عشرہ میں

---

[1] صحیح بخاری، ابواب نوافل و سنن [2] مسند احمد و ابو داؤد و صحیح مسلم الرکعتان بعد العصر [3] صحیح بخاری کتاب الصوم۔

آپ اور زیادہ عبادت گزار ہو جاتے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تو آپ رات رات بھر بیدار رہتے تھے، ازواج سے بے تعلق ہو جاتے تھے، اہلبیت کو نماز کے لیے جگاتے[۱] تھے، اس اخیر عشرہ میں آپ عموماً اعتکاف میں بیٹھا کرتے تھے یعنی ہمہ وقت مسجد میں بیٹھکر یاد الٰہی اور عبادت گذاری میں مصروف رہتے تھے،[۲]

قرآن مجید کی تلاوت روزانہ فرماتے تھے، ابوداؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت کا وقت نماز عشا کے بعد تھا[۳]، روزانہ سورتوں کی تعداد مقرر تھی، اسی تعداد کے موافق آپ تلاوت کر لیا کرتے تھے، رمضان میں پورے قرآن کا دورہ کرتے تھے[۴]، پچھلی رات کو اٹھ کر کوئی موثر سورہ یا چند آیات تلاوت کرتے تھے حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کو میں نے دیکھا کہ آپ پچھلے پہر بیدار ہوئے، آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے، رات کے سناٹے میں تارے جھلملا رہے تھے، آپ نے نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور یہ آیتیں پڑھیں،[۵]

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ	آسمان اور زمین کی پیدائش اور شب و روز کے انقلاب میں
اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ	دانشمندوں کیلیے نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور پہلو پر لیٹے
الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی	ہوئے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین پر غور کرتے ہیں کہ
جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	خدایا تو نے یہ نظام عالم بے نتیجہ نہیں پیدا کیا، تو پاک ہے بس
رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا	ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا خدایا جسکو تو دوزخ میں داخل کرے
عَذَابَ النَّارِ رَبَّنَا اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ	اسکو تو نے رسوا کر دیا، گناہگاروں کا کوئی مددگار نہیں، خدایا

۱ ابوداؤد باب الصیام ۲ صحیح بخاری باب الاعتکاف ۳ ابوداؤد باب شہر رمضان ۴ صحیح بخاری بدء الوحی ۵ صحیح بخاری و صحیح مسلم صلوۃ اللیل

Marfat.com

فقد اخزيته وما للظلمين من انصار ربنا اننا	ہم نے ایک پکارنے والے کی آواز سنی جو پکار کر یہ کہہ رہا تھا کہ اپنے
سمعنا مناديا ينادي للايمان ان امنوا بربكم	پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لائے، خداوندا تو ہمارے گناہ بخش دے
فامنا ربنا فاغفر لنا ذنوبنا وكفر عنا سياتنا	ہماری برائیوں پر پردہ ڈال دے اور نیکوں کے ساتھ دنیا سے اٹھا، خداوندا
وتوفنا مع الابرار ربنا واتنا ما وعدتنا	تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ جس جس چیز کا وعدہ کیا ہے وہ ہم کو عطا کر دے
على رسلك ولا تخزنا يوم القيمة انك لا	اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا، تو وعدہ خلافی نہیں کرتا
تخلف الميعاد فاستجاب لهم ربهم اني	پروردگار نے پکار سن لی اور دعا قبول کر لی کہ میں کسی کام کرنے والے
لا اضيع عمل عامل منكم من ذكر او انثى	کے کام کو ضائع نہیں کرتا، مرد ہو یا عورت، تم ایک دوسرے سے ہو
بعضكم من بعض فالذين هاجروا	جنھوں نے ہجرت کی یا اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں
واخرجوا من ديارهم واوذوا في سبيلي وقتلوا	ستائے گئے ہیں اور وہ لڑے ہیں اور مارے گئے ہیں ان کے
وقتلوا لاكفرن عنهم سياتهم ولادخلنهم	گناہوں کو مٹا دوں گا اور ان کو جنت میں داخل کروں گا جن کے
جنت تجري من تحتها الانهار ثوابا من عند	نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اللہ کی طرف سے ان کو یہ جزا ملے گی۔
الله والله عنده حسن الثواب (آل عمران)	اور اللہ ہی کے پاس اچھی جزا ہے۔

اسی موقع پر آپ یہ الفاظ بھی کہا کرتے تھے جو سر تا پا اثر اور روحانیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

اللھم لک الحمد انت نور السموات والارض	خداوندا تیری حمد ہو، تو آسمان و زمین کا نور ہے، تیری حمد ہو
ولک الحمد انت قیام السموات والارض	تو آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کا قائم رکھنے والا ہے
ولک الحمد انت رب السموات والارض	تو حق ہے، تیرا وعدہ حق ہے، تیری بات حق ہے، تجھ سے ملنا حق ہے
ومن فیھن انت الحق ووعدک الحق وقولک الحق	جنت حق ہے، دوزخ حق ہے، قیامت حق ہے، خداوندا میں نے

ولقاءك الحق والجنة حق والنار حق، الساعة	تیرے ہی آستانہ پر سر جھکایا ہے، تجھی پر ایمان لایا ہوں،
حق، اللھم لك اسلمت وبك امنت وعليك	تجھی پر میں نے بھروسہ کیا ہے، تیرے ہی زور پر جھگڑتا
توكلت واليك انبت وبك خاصمت و	ہوں، تجھی سے فیصلہ چاہتا ہوں، تو میرا اگلا اور
اليك حاكمت فاغفرلی ما قدمت و	پچھلا، کھلا اور چھپا ہر ایک گناہ معاف کر،
اخرت واسررت واعلنت انت الٰھی لا	تو ہی میرا معبود ہے، تیرے سوا کوئی اور
اله الا انت (صحیح مسلم باب الدعا فی صلوۃ اللیل)	معبود نہیں،

کبھی گھر کے لوگ جب سو جاتے، آپ چپ چاپ بستر سے اٹھتے اور دعا و مناجات الٰہی میں مصروف ہو جاتے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک رات میری آنکھ کھلی تو آپ کو بستر پر نہ پایا، سمجھی کہ آپ کسی اور بیوی کے حجرے میں تشریف لیگئے، اندھیرے میں ہاتھ سے ادھر اُدھر ٹٹولا تو دیکھا کہ پیشانی اقدس خاک پر ہے، اور آپ سربسجود دعا میں مصروف ہیں، یہ دیکھکر حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ مجھ کو اپنے شبہ پر ندامت ہوئی اور دل میں کہا، سبحان اللہ! ہم کس خیال میں ہیں اور آپ کس عالم میں[1] کبھی کبھی راتوں کو اٹھ کر آپ تن تنہا قبرستان میں تشریف لیجاتے تھے اور دعا و زاری کرتے تھے، ایک دفعہ آپکے پیچھے پیچھے حضرت عائشہؓ گئیں تو دیکھا کہ آپ جنت البقیع میں داخل ہوئے اور دعا مانگی،[2] دعا اور نماز کے بعد آپ سو جاتے یہاں تک کہ خراٹے کی آواز سنائی دیتی کہ دفعۃً سپیدہ صبح نمودار ہوتا، آپ بیدار ہوتے، صبح کی سنت ادا کر کے مسجد کو تشریف لیجاتے اور اس وقت یہ الفاظ زبانِ مبارک پر ہوتے،

[1] سنن نسائی باب الغیرۃ [2] سنن نسائی باب الاستغفار للمومنین،

اللھم اجعل فی قلبی نوراً وفی لسانی نوراً	خدایا میرے دل میں نور پیدا کر اور میری زبان میں
واجعل فی سمعی نوراً واجعل فی بصری نوراً	اور میری قوت سامعہ میں نور پیدا کر، آنکھوں میں
واجعل فی خلفی نوراً ومن امامی نوراً واجعل	نور پیدا کر، اور میرے پیچھے اور میرے آگے نور پیدا
من فوقی نوراً وتحتی نوراً واعطنی نوراً	کر، میرے اوپر اور میرے نیچے نور پیدا کر،
(صحیح مسلم باب الدعاء فی صلوۃ اللیل)	اور مجھے نور عطا کر،

ارکان نماز میں سب سے کم وقفہ رکوع کے بعد قیام میں ہوتا ہے، لیکن حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رکوع کے بعد اتنی دیر کھڑے رہتے تھے کہ ہم لوگ سمجھتے تھے کہ آپ سجدہ میں جانا بھول گئے۔[1]

جو چیز نماز کی حضوری میں خلل ڈالتی تھی اس سے احتراز فرماتے تھے، ایک دفعہ چادر اوڑھ کر نماز ادا فرمائی جس میں دونوں طرف حاشیے تھے، نماز میں اتفاق سے حاشیوں پر نظر پڑ گئی، نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ یہ لیجا کر فلاں شخص (ابوجہیم) کو دے آؤ، اور ان سے انبجانی لاؤ، حاشیوں نے نماز کی حضوری میں خلل ڈالا،[2]

ایک دفعہ دروازے پر منقش پردہ پڑا ہوا تھا، نماز میں اس پر نگاہ پڑی تو حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اس کو ہٹا دو، اس کے نقش و نگار حضور قلب میں خلل انداز ہوتے ہیں۔[3]

روزہ (انبیاء اور داعیان مذہب نے تکمیل روحانیت کے لیے تقلیل غذا، بلکہ ترک غذا (روزہ) کو اسباب ضروری میں شمار کیا ہے، ہندوستان کے ریاضت کش اور مرتاض داعیان مذہب تو اس راہ میں حد افراط سے بھی آگے نکل گئے ہیں لیکن داعی اسلام کا طرز عمل اس باب میں افراط اور تفریط کے بیچ میں تھا،

اسلام سے پہلے اہل عرب عاشورا کے دن روزہ رکھا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی معمولاً اس دن

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۲، [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴ کتاب الصلوۃ، انبجانی ایک کپڑے کا نام ہے [3] صحیح بخاری کتاب اللباس و الصلوۃ

Marfat.com

روزہ رکھتے تھے بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے قیام کے زمانہ میں آپ متواتر کئی کئی مہینوں تک روزہ رکھتے تھے لیکن مدینہ آکر اس معمول میں فرق آگیا، مدینہ میں یہود بھی عاشورا کا روزہ رکھتے تھے، آپ نے بھی رکھا، بلکہ تمام مسلمانوں کو اس دن روزہ رکھنے کی تاکید فرمائی لیکن جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورا کا روزہ نفل رہ گیا،

رمضان کے علاوہ پورے مہینہ کا روزہ مدینہ میں آپ نے کبھی نہیں رکھا، صرف ایک شعبان مستثنیٰ ہے، اس میں قریب قریب پورے مہینہ بھر آپ روزہ سے رہتے، اس طرح سال میں دو مہینے شعبان اور رمضان تو پورے روزوں میں گذرتے تھے، سال کے بقیہ مہینوں میں یہ کیفیت رہتی تھی کہ روزہ رکھنے پر آتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب آپ کبھی روزہ نہ توڑیں گے، پھر روزہ توڑ دیتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی روزہ نہ رکھیں گے، مہینہ کے نصف اول میں جنکو ایام بیض کہتے ہیں، آپ اکثر روزوں سے رہتے تھے، مہینہ میں تین دن دو دو شنبہ اور ایک جمعرات کو معمولاً روزے رکھا کرتے تھے بعض روایتوں میں ہے کہ جمعہ کا روزہ بھی معمولات میں سے تھا، ان کے علاوہ محرم کے دس دن یکم سے عاشورا تک اور شوال کے آغاز میں چھ دن دوسری سے ساتویں تک آپ روزوں میں گذارتے تھے،[1]

اتفاقی روزے ان کے علاوہ تھے، آپ کبھی گھر میں تشریف لاکر پوچھتے تھے کہ کچھ کھانے کو ہے، جواب ملتا "کچھ نہیں،" آپ فرماتے تو میں آج روزہ سے ہوں[2]، کبھی کبھی آپ صوم وصال بھی رکھتے تھے یعنی متواتر کئی کئی دن تک ایک روزہ رکھتے تھے، بیچ میں مطلق افطار نہیں کرتے تھے، یا برائے نام کچھ کھا لیتے تھے لیکن جب صحابہ نے اس میں آپ کی تقلید کرنی چاہی تو آپ نے منع فرمایا بعض لوگوں نے

---

[1] روزہ کے متعلق یہ حدیثیں تمام کتب حدیث میں ہیں، اسوقت ابوداؤد اور صحیح مسلم کتاب الصوم پیش نظر ہیں [2] ابوداؤد باب النیۃ فی الصیام

Marfat.com

اس ممانعت کو صرف اس معنی پر محمول کیا کہ آپ حکماً نہیں، بلکہ شفقت سے منع فرماتے ہیں، اس لیے اس ممانعت کے باوجود آپ کے ساتھ انھوں نے بھی اس قسم کے روزے رکھنے شروع کیے، آپ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو دو دن متصل روزہ رکھا، تیسرے دن اتفاق سے چاند ہوگیا، آپ نے فرمایا "اگر مہینہ بڑھ سکتا تو میں اتنے دن تک افطار نہ کرتا کہ ان مذہب میں غلو کرنے والوں کا سارا غلو جاتا رہتا" صحابہ نے عرض کی "یا رسول اللہ پھر حضور کیوں کئی کئی دن تک افطار نہیں کرتے"؟ ارشاد ہوا "تم میں مجھ سا کون ہے؟ مجھ کو تو ایک کھلانے والا ہے جو کھلاتا ہے، اور ایک پلانے والا ہے جو پلاتا ہے" بعض روایتوں میں یہ الفاظ اس طرح وارد ہوئے ہیں، "تم میں مجھ جیسا کون ہے، میں شب بسر کرتا ہوں تو میرا خدا مجکو کھلاتا اور پلا دیتا ہے"[1]

عام مسلمانوں کے لیے آپ اس قسم کی مذہبی سختیوں کو ناپسند فرماتے تھے، اور عام طور پر خود بھی ان چیزوں سے احتراز کرتے تھے (تفصیلی واقعات آگے آتے ہیں)

زکوۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلام سے پہلے بھی بہت کچھ خیرات اور مبرات کیا کرتے تھے، جیسا کہ آغاز اسلام میں حضرت خدیجہؓ نے شہادت دی ہے[2]، اسلام کے بعد آپ کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی چیز نقد اپنے پاس رہنے نہیں دیتے تھے، جو کچھ آتا مستحقین میں تقسیم فرما دیتے، لیکن با ایں ہمہ زکوٰۃ کا ادا کرنا آپ سے ثابت نہیں، اس سے بعض فقہا نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی، لیکن اصل یہ ہے کہ زکوٰۃ کے دو مفہوم ہیں، ایک مطلق صدقہ و خیرات اور اس باب میں جو آپ کی کیفیت تھی وہ کس سے مخفی ہے؟ دوسرا یہ کہ چاندی سونے یا جانور وغیرہ کی مخصوص مقدار و تعداد پر جو حاجت اصلیہ سے زیادہ ہو

---

[1] صوم وصال کی یہ حدیثیں صحیح مسلم سے لی گئی ہیں۔ [2] صحیح بخاری بدء الوحی

Marfat.com

اور سال بھر تک مالک کے قبضہ میں رہی ہو، ایک خاص شرح رقم ادا کیجائے، یہ مصطلحہ زکوٰۃ کبھی آپ پر فرض ہی نہیں ہوئی، کاشانۂ نبوت میں کوئی قابل زکوٰۃ چیز سال بھر تک تو کیا رہتی یہ بھی پسند خاطر نہ تھا کہ شب گذر جائے اور مال و دولت کا کوئی نشان گھر کے اندر رہ جائے، ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ خراج کی رقم اسقدر زیادہ آگئی کہ وہ شام تک ختم نہ ہوسکی، آپنے رات بھر مسجد میں آرام فرمایا، اور کاشانۂ اقدس میں اس وقت تک قدم نہیں رکھا جبتک حضرت بلال رضؓ نے آکر یہ اطلاع نہ دی کہ "یا رسول اللہ! خدانے آپکو سبکدوش کیا"[۱]

حج (اسلام سے پہلے آپنے جسقدر حج کیے انکی تعداد صحیح متعین نہیں کیجا سکتی، ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ چونکہ قریش معمولاً ہر سال حج کیا کرتے تھے، اس لیے قرینہ غالب یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر سال حج ادا کرتے ہوں گے، ترمذی[۲] میں ہے کہ قیام مکہ کے زمانہ میں آپنے دو حج کیے تھے، اور ابن ماجہ اور حاکم میں ہے کہ تین حج کیے تھے لیکن یہ سب[۳] روایتیں مرسل ہیں، مدینہ کے زمانۂ قیام میں متفقاً ثابت ہے کہ صرف ایک حج سنہ ۱۰ھ میں کیا[۴]، یہ وہی حجۃ الوداع ہے جس کا ذکر تفصیل پہلے گذر چکا ہے،

حج کے علاوہ آپنے عمرے بھی ادا کیے ہیں، ہجرت کے بعد چار عمرے ثابت ہیں، ایک عمرہ ذیقعدہ کے مہینہ میں، ایک حدیبیہ کے سال، ایک غزوۂ حنین کے بعد، اور چوتھا حجۃ الوداع[۵] کیساتھ حضرت انس رضؓ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع والے عمرہ کے سوا تمام عمرے آپنے ذیقعدہ کے مہینہ میں ادا کیے، ایک دفعہ حضرت ابن عمر رضؓ سے کسی نے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کے عمرے کیے تھے؟ انھوں نے جوابدیا "چار عمرے ان میں سے ایک ماہ رجب میں" حضرت عائشہ رضؓ نے یہ سنا تو کہا "خدا ابوعبدالرحمٰن (ابن عمر رضؓ کی کنیت) پر رحم فرمائے، آپنے کوئی عمرہ ایسا نہیں کیا جس میں وہ شریک نہ ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں کوئی

---

۱ ابوداؤد باب قبول ہدایا المشرکین ۲ باب ما جاء کم حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۳ زرقانی ج ۸ ص ۱۴۲ ۴ صحیح مسلم و ابوداؤد، حجۃ الوداع ۵ ترمذی باب ما جاء کم حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۶ جامع ترمذی باب مذکور،

Marfat.com

عمرہ نہیں کیا۔[1]

سال حدیبیہ میں سب سے پہلے دفعہ جب آپ عمرہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہوئے تھے تو کفار قریش نے قدم قدم پر روکنے کی کوشش کی صحابہ انکی مدافعت میں آپ سے پیچھے رہ گئے لیکن آپ کو خانہ کعبہ کی زیارت کا یہ ذوق و شوق تھا کہ اپنے ہمراہیوں کا انتظار کیے بغیر بھی آپ سب سے آگے بڑھتے چلے جارہے تھے، آخر جاں نثاروں نے ابوقتادہ انصاریؓ کو بھیجا کہ وہ جاکر ہماری جانب سے سلام عرض کریں اور یہ درخواست کریں کہ "آپ ذرا توقف فرمائیں، ہمیں یہ ڈر ہے کہ دشمن کہیں ہمارے اور آپ کے درمیان حائل نہ ہو جائیں"۔ بارے آپ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی،[2]

دوام ذکر الٰہی | قرآن مجید نے اہل ایمان کا یہ وصف خاص بیان کیا ہے:

الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے لیٹے یاد کرتے ہیں (آل عمران)

لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور ۵) جنکو اشغال دنیوی خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے (نور)

اور قرآن کا مبلغ ان اوصاف کا خود بہترین مظہر تھا حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر لحظہ اور ہر لمحہ خدا کی یاد میں مصروف رہتے تھے۔[3] ربیعہ بن کعب اسلمی رات کو آپ کے آستانہ پر پہرہ دیتے تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ آپ کی تسبیح و تہلیل کی آواز سنتے سنتے میں تھک جاتا تھا اور مجھے نیند آجاتی تھی۔[4] اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، وضو کرتے، نئے کپڑے پہنتے، سوار ہوتے، سفر میں جاتے، واپس آتے، گھر میں داخل ہوتے، مسجد میں قدم رکھتے، غرض ہر حالت میں آپ دل و زبان سے[5] ذکر الٰہی میں مصروف رہتے۔ چنانچہ ان ہی بنا پر احادیث میں مختلف اوقات و حالات کیلئے کثرت سے ادعیہ ماثورہ

---

[1] بخاری و مسلم [illegible] [2] صحیح بخاری ص ۲۴۵ باب جزاء الصید [3] ابوداؤد کتاب الطہارۃ [4] مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۵۹

منقول ہیں، اخیر زندگی میں جب سورۂ اذا جاء اترا جسمیں تحمید و تسبیح کا حکم ہے تو امہات المومنین کا بیان ہے کہ ہر وقت اور ہر حالت میں زبان مبارک پر تسبیح و تہلیل جاری رہتی تھی،[1]

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ آپ اکثر یہ دعا رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد پڑھا کرتے تھے، ہم نے گنا تو ایک ایک نشست میں سو سو دفعہ یہ الفاظ آپ کی زبان سے ادا ہوئے[2] سفر اور کوچ کی بے اطمینانی میں بھی آپ یاد الٰہی سے غافل نہیں ہوتے تھے، سواری پر بیٹھے بیٹھے نفل ادا کرتے تھے، اور اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ قبلہ کی طرف رخ ہے یا نہیں، سواری کا جانور جدھر چل رہا ہوتا آپ ادھر ہی منہ کیے نماز کی نیت کر لیتے کہ[3] اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ، جدھر رخ کرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے،)

ذوق و شوق (آپ اصحابؓ کی محفل میں یا امہات المومنینؓ کے حجروں میں بات چیت میں مشغول ہوتے کہ دفعۃً اذان کی آواز آتی، آپ اٹھ کھڑے ہوتے،[4] رات کا ایک معتدبہ حصہ گو شب بیداری میں گذرتا تھا، تاہم صبح کے وقت اُدھر موذن نے اللہ اکبر کہا، ادھر آپ بستر سے اٹھ بیٹھے[5] شب کے وقت جس ذوق شوق اور وجد کی حالت میں نماز پڑھتے اس کا نقشہ حضرت عائشہؓ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے "کبھی پوری پوری رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے رہتے، سورہ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورہ نساء (قرآن کی سب سے بڑی سورتیں ہیں) پڑھتے جب کوئی خوف اور خشیت کی آیت آتی، خدا سے دعا مانگتے اور پناہ طلب کرتے، کوئی رحمت اور بشارت کی آیت آتی تو اس کے حصول کی دعا مانگتے"[6] قرأت اتنی زور سے

[1] ابن سعد جز، الوفاۃ [2] ترمذی و ابن ماجہ و دارمی باب دعوات [3] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد وغیرہ [4] صحیح بخاری باب یکون الرجل فی خدمۃ اہلہ ص ۸۰۰ [5] صحیح بخاری من انتظر الاقامۃ [6] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۹۳

فرماتے کہ دور تک آواز جاتی، اور لوگ اپنے بستروں پر پڑے پڑے آپ کی آواز سنتے[1]، کبھی کبھی کوئی آیت آجاتی کہ آپ اس کے ذوق و شوق میں محو ہو جاتے، حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ نے نماز میں یہ آیت پڑھی

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

اگر تو سزا دے تو تیرے بندے ہیں اور اگر معاف کردے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔

تو یہ اثر ہوا کہ صبح تک آپ یہی آیت پڑھتے رہ گئے[2]،

زیدؓ بن خالد جہنی ایک صحابی ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ ارادہ کیا کہ آج شب میں آپ کو نماز پڑھتے دیکھوں گا، (غالباً یہ کسی سفر کا واقعہ ہے)، نماز کا وقت آیا تو آپ نماز کیلئے کھڑے ہوئے، پہلے دو رکعتیں معمولی ادا کیں، پھر دو رکعتیں بہت ہی لمبی اور بڑی دیر تک پڑھیں، پھر دو دو رکعتیں کرکے آٹھ رکعتیں بتدریج چھوٹی پڑھیں، اور سب کے آخر میں وتر ادا کی[3]، خبابؓ کی روایت ہے کہ ایک شب آپ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو صبح تک مصروف رہے[4]۔

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ ایک شب مجکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، آپ نے سورۂ بقرہ شروع کی (قرآن کی یہ سب سے بڑی سورہ ہے) میں سمجھا کہ آپ سو آیتوں تک پڑھیں گے، لیکن آپ انکو پڑھ کر اور آگے بڑھے، میں نے دل میں کہا شاید پوری سورہ آپ ایک ہی رکعت میں ختم کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ آپ نے جب اس سورہ کو ختم کیا تو میں نے خیال کیا کہ آپ رکوع کرینگے لیکن آپ نے فوراً ہی سورۂ نسا شروع کردی، یہ بھی ختم ہوچکی تو سورۂ آل عمران شروع کی (یہ تینوں سورتیں ملکر

[1] ابن ماجہ باب ماجاء فی صلوٰۃ اللیل [2] ایضاً [3] صحیح مسلم موطا، ابوداؤد [4] نسائی احیاء اللیل

Marfat.com

سوا پانچ پاروں کے قریب ہیں) بہت ٹھہر ٹھہر کر نہایت سکون اور اطمینان سے آپ قرأت کر رہے تھے اور ہر آیت کے مضمون کے مطابق بیچ بیچ میں تسبیح اور دعا کرتے جاتے تھے، اس کے بعد آپ نے رکوع کیا، رکوع میں قیام ہی کے برابر توقف فرمایا، پھر کھڑے ہوئے اور اتنی ہی دیر تک کھڑے رہے، پھر سجدہ کیا، اور سجدہ میں بھی اسی قدر تاخیر فرمائی[1]

میدانِ جنگ میں یادِ الٰہی عین اس وقت جب دونوں طرف سے فوجیں برسرِ پیکار ہوتیں، تیر وسنان اور تیغ و خنجر کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی ہوتیں اور ہر طرف سے شور دار و گیر برپا ہوتا، آپ نہایت خضوع وخشوع اور اطمینانِ قلب کے ساتھ دعا وزاری اور ذکرِ الٰہی میں مصروف ہوتے، سپاہی شجاعت کے فخر و غرور سے پیشانیوں پر بل ڈالے ہوئے دشمنوں کے مقابلہ میں ہوتے لیکن خود سپہ سالار کی پیشانی زمینِ نیاز پر ہوتی، بدر، احد، خندق، خیبر، تبوک تمام بڑے بڑے معرکوں میں آپ کی یہی کیفیت تھی،

معرکہ ہائے جنگ میں سپہ سالاروں کو اپنے بہادر سپاہیوں کی قوت پر ناز ہوتا ہے لیکن اسلام کے قائد اعظم کو صرف خدائے ذوالجلال کی قوت پر ناز تھا، عالمِ اسباب کے لحاظ سے گو آپ نے اصولِ جنگ کے مطابق ہر میدان میں اپنی فوجیں مرتب کیں لیکن اصلی اعتماد اور بھروسا اسبابِ کائنات سے ماوراء قادرِ مطلق کی ذات پر تھا، بدر میں دو صحابی حاضر ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! ہم کو کافروں نے اس شرط پر رہا کیا ہے کہ ہم جنگ میں شرکت نہ کریں، ارشاد ہوتا ہے "ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے[2]، بدر کا میدان خون سے لالہ زار ہو رہا ہے، اور خشوع وخضوع سے دونوں ہاتھ پھیلا کر بارگاہِ ایزدی میں عرض کر رہے ہیں" خدایا اپنا وعدۂ نصرت پورا کر، محویت اور بیخودی میں

---

[1] صحیح مسلم ونسائی صلوٰۃ اللیل [2] صحیح مسلم باب الوفاء بالعہد۔

Marfat.com

ردائے مبارک کندھے سے گر گر پڑتی ہے، اور آپ کو خبر تک نہیں ہوتی کبھی سجدے میں گر پڑتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ "خدایا: اگر آج یہ چند نفوس مٹ گئے تو پھر قیامت تک تو نہ پوجا جائیگا"[۱] اسی اثنا میں حضرت علیؓ تین دفعہ میدان جنگ سے حاضر خدمت ہوتے ہیں، اور ہر دفعہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے[۲]،

غزوۂ اُحد کے خاتمہ پر ابوسفیان مسرت سے ہبل کی جے پکارتا ہے، لیکن آپ اس دل شکستگی کے عالم میں بھی حضرت عمرؓ کو حکم دیتے ہیں کہ تم بھی کہو

اللّٰہ مولانا ولا مولیٰ لکم اللّٰہ اعلیٰ واجلّ — خدا ہمارا آقا ہے، تمھارا کوئی آقا نہیں، خدا بڑا اور بلند ہے،

غزوۂ احزاب میں آپ بنفس نفیس خود اپنے دست مبارک سے خندق کھودنے میں مصروف تھے، اور لب مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے،

اللّٰھم لا خیر الا خیر الاٰخرۃ فبارک فی الانصار والمھاجرۃ — خدایا، بھلائی صرف آخرت کی بھلائی ہے، انصار اور مہاجرین کو برکت عطا کر،

دشمن اس شدت سے حملہ کر رہے تھے کہ کسی مسلمان کا اپنی جگہ سے ہٹنا ممکن نہ تھا، اور یہ محاصرہ ۲۰ - ۲۲ دن تک قائم رہا، لیکن اس مدت میں صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ چار وقت کی نمازیں قضا ہوئیں، ایک دن عصر کے وقت دشمنوں نے اس زور کا حملہ کیا کہ ایک لمحہ کے لیے بھی مہلت نہ مل سکی، آخر عصر کا وقت ختم ہو گیا، آپ کو سخت رنج ہوا، حملہ رکنے پر سب سے پہلے باجماعت نماز ادا کی[۳]

---

[۱] صحیح بخاری، مسلم، بدر [۲] سیرۃ جلد اول صفحہ ۵۰۷ [۳] صحیح بخاری اُحد

Marfat.com

غزوۂ خیبر میں جب آپ شہر کے قریب پہنچے تو زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے اللہ اکبر خربت خیبر، اللہ اکبر خیبر ویران ہو چکا، عمارتیں نظر آئیں تو صحابہ سے ارشاد کیا کہ ٹھہر جاؤ، پھر یہ دعا مانگی،

اللھم انا نسئلک خیر ھذہ القریۃ وخیر اھلھا	اے خدا ہم تجھ سے اس آبادی کی، اس کی آبادی والوں کی،
وخیر ما فیھا ونعوذ بک من شرھا وشر اھلھا	اس کی آبادی کی چیزوں کی بھلائی چاہتے ہیں، اور ان
وشر ما فیھا (ابن ہشام)	سب کی برائیوں سے تیری پناہ کے طلبگار ہیں،

حنین کے معرکہ میں بارہ ہزار فوج آپ کے ساتھ تھی لیکن اول ہی حملہ میں اس کے پاؤں اکھڑ گئے، اس فوج کا سپہ سالار اگر ان ہی آدمیوں کے بھروسہ پر میدان جنگ میں اترتا تو شاید وہ سب سے پہلے بھاگ کر اپنی جان بچاتا لیکن آپ کو جس قوت پر اعتماد تھا آپ اسکو اس تنہائی میں بھی اسی طرح ناصر و مددگار سمجھتے تھے، جس طرح فوج و لشکر کیساتھ عین اس وقت جب دس ہزار قدر انداز تیروں کا مینہ برساتے ہوئے سیلاب کی طرح بڑھتے چلے آتے تھے، اور آپ کے پہلو میں چند جاں نثاروں کے سوا کوئی اور باقی نہیں رہا تھا، آپ سواری سے اتر آئے اور فرمایا "میں خدا کا بندہ اور پیغمبر ہوں" پھر بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہو کر نصرت موعودہ کی درخواست کی، دفعۃً ہوا کا رخ پلٹ گیا اور نسیم فتح علم اسلام کو لہرانے لگی، دس ہزار دشمن کے بے پناہ تیروں کو یکہ و تنہا مناجات و زاری کی سپر پر روکنے کی جرأت پیغمبروں کے سوا اور کس سے ظاہر ہو سکتی ہے،

اس موقع کا سب سے مؤثر منظر غزوۂ **بنی مصطلق** میں نظر آتا ہے، سامنے دشمن پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں، اور غفلت کے منتظر ہیں، کہ دفعۃً نماز کا وقت آجاتا ہے، اور آپ امام بنکر آگے کھڑے ہو جاتے ہیں،

---

[1] صحیح بخاری و مسلم حنین

Marfat.com

صحابہ کی ایک جماعت مقتدی بن کر نماز میں مصروف ہو جاتی ہے، اور دوسری دشمنوں کا سامنا روک لیتی ہے، صلح حدیبیہ کے زمانہ میں اس سے بھی زیادہ خطرناک موقع پیش آیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے پاس عسفان میں خیمہ زن تھے، قریش کے مشہور جنرل خالد بن ولید آس پاس کی پہاڑیوں میں دشمنوں کی فوج کا ایک دستہ لیے ہوئے موقع کی تاک میں تھے، آخر قریش کی یہ رائے قرار پائی کہ مسلمان جب نماز کے لیے کھڑے ہوں تو عین اس وقت ان پر بے خبری میں حملہ کیا جائے، خداوند کارساز کی بارگاہ میں قصر صلوٰۃ کی ایک عمدہ تقریب پیدا ہوگئی، چنانچہ قصر کی آیتیں نازل ہوئیں، عصر کا وقت آیا تو آپ نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، دشمن اپنی فوج کا پرا لیے آپ کے سامنے تھے، صحابہ دو حصوں میں منقسم ہوگئے، ایک حصہ نے آپ کے پیچھے آکر نماز کی صفیں قائم کرلیں اور دوسرا حصہ دشمنوں کے مقابل کھڑا ہوگیا، پہلی جماعت فارغ ہوکر بتدریج دشمنوں کے مقابل آگئی، اور دوسری ترتیب کے ساتھ پیچھے ہٹ کر آپ کے ساتھ نماز جا ملی، یہ تمام تبدیلیاں مقتدیوں کی صفوں میں ہو رہی ہیں لیکن خود سپہ سالار خون آشام تلواروں کے سایہ میں تمام خطرات سے بے پروا عبادت الٰہی میں مصروف ہے[1]، اور اسکو ذرہ برابر جنبش نہیں ہوتی

ان واقعات کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ اس حکم الٰہی کی کہانتک تعمیل ہوئی،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (انفال)

مسلمانو جب کسی گروہ سے مٹ بھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور بار بار خدا کا نام لیتے جاؤ، تم کامیاب ہو گے،

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد میں جب کسی بلندی پر چڑھتے تو تین بار[2] اللہ اکبر کہتے۔

خشیت الٰہی آپ خاتم الانبیا تھے، افضل رسل تھے، محبوب خاص تھے، تاہم خشیت الٰہی کا یہ اثر تھا کہ فرمایا کرتے

[1] ابوداؤد جلد اول باب صلوٰۃ المسافرین [2] باب التکبیر عند الحرب،

Marfat.com

کہ مجھکو کچھ نہیں معلوم کہ میرے اوپر کیا گذریگی"۔ حضرت عثمانؓ بن مظعون نے جب وفات پائی تو آپ تعزیت کو گئے، لاش دھری تھی، ایک عورت نے لاش کی طرف مخاطب ہوکر کہا "خدا گواہ ہے کہ خدا نے تجھکو نوازا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم کو کیونکر معلوم ہوا" بولیں خدا نے ان کو نہیں نوازا تو اور کس کو نوازے گا"۔ ارشاد ہوا کہ ہاں مجھ کو بھی ان کی نسبت بھلائی کی توقع ہے لیکن میں پیغمبر ہو کر بھی یہ نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔"[1]

(جب کبھی زور سے ہوا چلتی آپ سہم جاتے کسی ضروری کام میں ہوتے، اسکو چھوڑ کر قبلہ رخ ہو جاتے[2] اور فرماتے "خدایا تیری بھیجی ہوئی مصیبت سے پناہ مانگتا ہوں" جب مطلع صاف ہو جاتا یا پانی برس جاتا تو مسرور ہوتے اور خدا کا شکر ادا فرماتے، ایک دن اس قسم کا واقعہ پیش آیا، تو حضرت عائشہؓ نے پوچھا "یارسول اللہ! آپ کیوں مضطرب ہو جاتے ہیں"۔ ارشاد ہوا "عائشہ! تجھے کیا معلوم کہ قوم ہود کو واقعہ نہ پیش آئے جس نے بادل دیکھکر کہا یہ ہمارے کھیتوں کو سیراب کرنیوالا ہے حالانکہ وہ عذاب الٰہی تھا"۔[3]

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ یارسول اللہ آپکے بال پکنے لگے۔ فرمایا مجھے سورۂ ہود و واقعہ والمرسلات اور عم یتسألون نے بوڑھا کر دیا"[4] (ان سورتوں میں قیامت وغیرہ کے واقعات مذکور ہیں) ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ جب دو ثلث شب گذر چکتی، باواز بلند الفاظ ادا فرماتے لوگو! خدا کو یاد کرو، زلزلہ آرہا ہے، اس کے پیچھے آنے والا آرہا ہے، موت اپنے سامان کے ساتھ آپہنچی، موت اپنے سامان کے ساتھ آپہنچی،[5]

[1] صحیح بخاری باب الجنائز) [2] سنن ابن ماجہ باب ید عو بہ الرجل اذا ای السحاب [3] یہ واقعہ بخاری و مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے، اخیر فقرہ قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے [4] شمائل ترمذی ما جاء فی شیبہ صلعم [5] مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی باب البکاء والخوف)

Marfat.com

فرمایا کرتے تھے "لوگو! جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے ہوتے تو تم کو ہنسی کم اور رونا زیادہ آتا"[1]

ایک دفعہ آپ نے نہایت مؤثر طرز سے خطبہ میں فرمایا "اے معشر قریش! اپنی آپ خبر لو، میں تم کو خدا سے نہیں بچا سکتا، اے بنی عبد مناف! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا، اے عباس بن عبد المطلب! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا، اے صفیہ! رسول خدا کی پھوپھی! میں تجھ کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا اے محمد کی بیٹی فاطمہ! میں تجھکو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا" (صحیحین)

ایک دفعہ اعراب بادیہ کا مسجد نبوی میں اتنا ہجوم ہوا کہ آپ پسینے کے قریب ہو گئے، مہاجرین نے اٹھ کر لوگوں کو ہٹایا، آپ نکل کر حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں داخل ہو گئے، اور تقاضائے بشری سے بد دعا زبان سے نکل گئی، فوراً قبلہ رخ ہو کر دونوں ہاتھ خدا کی بارگاہ میں اٹھائے اور دعا کی، خدایا! میں ایک انسان ہوں، اگر تیرے کسی بندہ کو مجھ سے تکلیف پہنچے تو مجھے سزا نہ دینا"[2]

گریہ و بکا خشیت الٰہی کی وجہ سے اکثر آپ پر رقت طاری ہوتی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے جب آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا، تو بے اختیار چشم مبارک سے آنسو جاری ہو گئے[3]، اکثر نماز میں رقت طاری ہوتی، اور آنسو جاری ہو جاتے، ایک دفعہ جب سورج گرہن پڑا تو نماز کسوف میں آپ ٹھنڈی سانسیں بھرتے اور فرماتے تھے، خدایا تو نے وعدہ کیا ہے کہ تو لوگوں پر میرے ہوتے عذاب نہیں نازل کریگا،[4]

عبد اللہ بن شخیر ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں ایک بار خدمت نبوی میں حاضر ہوا، دیکھا کہ آپ نماز میں مشغول ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، روتے روتے اسقدر ہچکیاں بندھ گئی تھیں کہ معلوم

[1] صحیحین [2] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۱۰۰ و ۲۲۳، دونوں صفحوں میں دو روایتیں ہیں، مگر غالباً ایک ہی واقعہ ہے)
[3] صحیح بخاری تفسیر آیت مذکورہ [4] ابوداؤد صلوٰۃ الکسوف

Marfat.com

ہوتا تھا کہ چکی چل رہی ہے یا ہانڈی ابل رہی ہے[1]،

ایک بار آپ ایک جنازہ میں شریک تھے۔ قبر کھودی جا رہی تھی، آپ قبر کے کنارے بیٹھ گئے۔ یہ منظر دیکھ کر آپ پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ آنسوؤں سے زمین نم ہوگئی، پھر فرمایا بھائیو! اس دن کے لیے سامان کر رکھو[2]،

ایک دفعہ کسی غزوہ سے واپس تشریف لا رہے تھے، راہ میں ایک پڑاؤ ملا، کچھ لوگ بیٹھے تھے، آپ نے دریافت فرمایا کہ تم کون ہو؟ بولے ہم مسلمان ہیں، ایک عورت بیٹھی چولھا سلگا رہی تھی، پاس ہی اس کا لڑکا تھا، آگ خوب روشن ہوگئی اور بھبھک گئی تو وہ بچہ کو لیکر آپ کی خدمت میں آئی اور بولی، آپ رسول اللہ ہیں؟ ارشاد ہوا ہاں بیشک، پھر اس نے پوچھا کیا ایک ماں اپنے بچہ پر جسقدر مہربان ہے، خدا اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان نہیں ہے، آپ نے فرمایا ہاں بیشک، اس نے کہا تو ماں اپنے بچہ کو آگ میں نہیں ڈالتی، آپ پر گریہ طاری ہوگیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا، خدا اس بندہ کو عذاب دیگا جو سرکش اور متمرد ہے، خدا سے سرکشی کرتا ہے اور اس کو ایک نہیں کہتا[3]،

ایک دفعہ آپ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا،

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ — پروردگار ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا، ان میں

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ — سے جس نے میری پیروی کی وہی میری جماعت میں ہے،

اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ والی دعا پڑھی،

---

[1] ترمذی و ابوداؤد باب البکاء فی صلوٰۃ اللیل [2] سنن ابن ماجہ باب الحزن والبکاء، [3] سنن ابن ماجہ باب ما یرجی من رحمۃ اللہ

Marfat.com

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ — اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں،
لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ — اور اگر معاف کر دے تو تو غالب و دانا ہے،

دونوں ہاتھ اٹھا کر اللھم امتی امتی فرماتے جاتے تھے، اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے[ل]

محبت الٰہی

دنیا میں دو قسم کے پیغمبر آئے ہیں، ایک وہ جنکی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا، اور اس لیے وہ صرف خدا کے خوف و خشیت کی تعلیم دیتے تھے، مثلاً حضرت نوحؑ و حضرت موسیٰ علیہما السلام، دوسرے وہ جو محبت الٰہی میں سرشار تھے، اور وہ لوگوں کو اسی خمخانۂ عشق کی طرف بلاتے تھے، مثلاً حضرت یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام لیکن یہ دونوں افراط و تفریط کے راستے تھے، پہلی راہ اخلاص و محبت کی منزل تک پہنچاتی، اور دوسری عبودیت اور آداب احترام کی منزل سے دور پھینک دیتی ہے، جیسا کہ عیسائی تعلیم اور موجودہ انجیل کی سیرۃ مسیحؑ میں ہر شخص کو نظر آسکتا ہے لیکن اسلام دونوں جلووں کو یکساں نمایاں کرنا چاہتا ہے، یہی سبب ہے کہ حامل شریعت اسلامیہ کی ذات مبارک میں یہ دونوں پہلو بیک دفعہ نظر آتے ہیں، قرآن مجید نے کمال ایمان کا وصف یہ بیان کیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ — جو ایمان لائے ہیں ان کو سب سے زیادہ خدا پیارا ہے،

صحیح روایتوں میں ہے کہ آپ راتوں کو اتنی دیر تک نمازیں کھڑے رہتے تھے کہ پائے مبارک پر ورم آجاتا تھا، یہ دیکھکر بعض صحابہ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! آپ کی مغفرت تو خدا کر چکا ہے، آپ یہ زحمت کیوں اٹھاتے ہیں؟" ارشاد ہوا کہ "کیا میں عبد شکور نہ ہوں" ارباب باطن کہتے ہیں کہ لوگ سمجھتے تھے کہ آپ کی عبادتیں خشیۃ الٰہی سے ہے، اور چونکہ آپ گناہوں سے پاک کر دیے گئے تھے، اسلیے آپکو

ل صحیح مسلم باب بکائہ صلی اللہ علیہ وسلم لامتہ

Marfat.com

ریاضاتِ شاقہ کی ضرورت نہ تھی، آپ نے اپنے جواب میں اسی شبہہ کو دفعہ فرمایا اور بتایا کہ ان کا مقتضا محبت الٰہی ہے، خشیۃ الٰہی نہیں ہے، اسی لیے آپ فرمایا کرتے تھے،

وجعلت لی قرۃ عینی فی الصلوٰۃ — میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہےؐ

راتوں کو سناٹے میں اٹھ کر آپ کبھی دعاوزاری میں مصروف ہوتے کبھی قبرستان کی طرف نکل جاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ نصف شب کے سکوت میں خدا سمائے دنیا پر نزول فرماتا ہے،[ا] عبادتِ شبانہ کا خاتمہ صبح کی دو رکعتوں پر ہوتا تھا جن کی نسبت آپ کا ارشاد تھا کہ "ان کے معاوضہ میں دنیا اور مافیہا کی نعمتیں بھی میرے سامنے ہیچ ہیں"[۳]

ایک دفعہ ایک غزوہ میں کوئی عورت گرفتار ہو کر آئی، اس کا بچہ گم تھا، محبت کا یہ جوش تھا کہ کوئی بچہ مل جاتا تو وہ سینہ سے لگا لیتی، اور اس کو دودھ پلاتی، آپ نے دیکھا تو حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو آگ میں ڈالدے" لوگوں نے عرض کی "ہرگز نہیں"، فرمایا "تو خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ محبت ہے جتنی اس کو اپنے بچہ سے ہے"[۳]

اسی طرح ایک اور واقعہ اوپر گذر چکا ہے، کہ آپ ایک غزوہ سے واپس آ رہے تھے، ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لیکر خدمتِ اقدس میں آئی، اور عرض کی "یارسول اللہ! ایک ماں کو اپنے بچہ پر جسقدر محبت ہوتی ہے، کیا خدا کو اپنے بندوں پر اس سے زیادہ نہیں ہے؟" فرمایا ہاں بیشک ہے، اس نے کہا کوئی ماں تو اپنے بچہ کو آگ میں ڈالنا گوارا نہیں کرتی، یہ سن کر فرطِ اثر سے آپ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا، خدا صرف اس بندہ کو عذاب دیگا جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے،[۴]

[ا] صحیح بخاری [۲] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ [۳] صحیح بخاری صفحہ ۸۰ باب رحمۃ الولد [۴] سنن ابن ماجہ باب ما یرجی من الرحمۃ

Marfat.com

ایک دفعہ آپ صحابہ کی مجلس میں تشریف فرما تھے، ایک صاحب ایک چادر میں ایک پرند کو مع اس کے بچوں کے لپیٹے ہوئے لائے، اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا، اس کی ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی، میں نے ذرا سا کپڑے کو کھول دیا تو وہ فوراً بچوں پر گر پڑی، ارشاد ہوا کہ کیا اپنے بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہی، قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہی، جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہی۔[1]

آپ محبتِ الٰہی کے سامنے دنیا کی تمام محبتوں کو ہیچ سمجھتے تھے، وفات سے پانچ دن پہلے آپ نے صحابہ کے مجمع میں ایک خطبہ دیا، اس میں فرمایا "میں خدا کے سامنے اس بات سے برارت کرتا ہوں کہ تم میں سے (یعنی انسانوں میں سے) کوئی میرا دوست ہو، کیونکہ خدا نے مجھے اپنا دوست بنا لیا جس طرح ابراہیم کو اس نے اپنا دوست بنا لیا تھا، اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو دوست بنا سکتا تو ابوبکر کو بناتا۔"[2]

وفات کے وقت زبانِ مبارک سے جو فقرہ بار بار ادا ہو رہا تھا یہ تھا۔

اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی — خدایا صرف رفیق اعلیٰ مطلوب ہی۔

یہ الفاظ سن کر حضرت عائشہؓ نے کہا کہ "اب آپ ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے۔"[3]

اس "رفاقتِ علوی" کے راز سے جو کسی قدر آشنا ہیں وہ اس فقرہ کی یہ تشریح کرتے ہیں؛

انبیاء علیہم السّلام چوں از مقام دعوت فارغ میگردند و متوجہ عالم بقا میشوند و مصلحت رجوع (الی الخلق) تمام می شود

---

[1] مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد باب رحمۃ اللہ۔ [2] صحیح مسلم صفحہ ۲۰۱ باب النہی عن بناء المساجد علی القبور [3] صحیح بخاری باب وفات)

بشوق تمام ندائے الرفیق الاعلیٰ برآرد، وہ بکلیت متوجہ حق جل شانہٗ میگرداند و در مراتب قرب سیر مینماید۔"[1]

توکل علی اللہ

(توکل کے یہ معنی ہیں کہ انسان کوششوں کے نتائج اور واقعاتِ عالم کے فیصلہ کو خدا کے سپرد کردے، اسباب و علل کے پردے اسکے سامنے سے اٹھ جائیں، وہ براہ راست ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں نظر آئے، بظاہر اسباب و علل گو ناموافق ہوں مگر یہ غیر متزلزل یقین پیدا ہو کہ یہ ناموافق حالات ہمارے کام میں ذرہ بھر موثر نہیں ہو سکتے، بلکہ اصلی قوت و قدرت عالم اسباب سے ماوراہی کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کا استقلال، عزم، جرأت و بیباکی یہ تمام باتیں اسی ایک اصل کی پرتو ہیں، اسی کی بدولت مشکل سے مشکل اوقات میں بھی زمام صبر اسکے ہاتھ سے نہیں چھوٹتی، پر خطر سے پر خطر راستوں میں بھی جبن اور ضعفِ ہمت اس کے قلب میں راہ نہیں پاتا، شدید سے شدید حالات میں بھی اس کے دل پر مایوسی کا بادل نہیں چھاتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح زندگی کا ایک ایک حرف پڑھ جاؤ تم کو صاف نظر آئیگا کہ آسمان کے نیچے شدائد اور مصیبتوں کی کوئی ایسی صنف نہ ہوگی جو آپ کی راہ میں حائل نہ ہوئی ہو، لیکن آپکا دل کبھی اضطراب و انتشار، مایوسی و ناامیدی اور خوف و بیم سے آشنا نہ ہوا، مکہ کی تنہائیوں میں مصائب کے ہجوم میں، دشمنوں کے نرغہ میں حنین و احد کے خونریز معرکوں میں ہر جگہ توکل و اعتماد علی اللہ کا ایک ہی جلوہ نظر آتا ہے۔ ابو طالب سمجھاتے ہیں کہ "جان پدر! اس کام سے ہاتھ اٹھاؤ" آپ فرماتے ہیں عم محترم! میری تنہائی کا خیال نہ کیجئے، حق زیادہ دیر تک تنہا نہیں رہے گا، عجم و عرب ایک دن اس کے ساتھ ہوگا، ایک دوسرے کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ "خدا مجھے تنہا نہیں چھوڑیگا"۔[2] مکہ میں ایک مصیبت زدہ

[1] مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی مکتوب ۲۷۰ جلد اول [2] یہ دونوں واقعے ابن ہشام میں ہیں۔

Marfat.com

مایوس صحابی سے ارشاد ہوتا ہے" خدا کی قسم عنقریب وہ وقت آتا ہے جب یہ دین مرتبۂ کمال کو پہنچ جائے گا، اور خدا کے سوا کسی اور کا ڈر نہیں رہے گا"[1]

ایک دفعہ حرم میں بیٹھکر کفار نے باہم مشورہ کیا کہ محمد اب جیسے ہی یہاں قدم رکھیں، ان کی بوٹی بوٹی اڑا دی جائے، حضرت فاطمہؓ ان کی یہ تقریر سن رہی تھیں، وہ روتی ہوئی آپ کے پاس آئیں، اور واقعہ عرض کیا، آپ نے ان کو تسکین دی، اور وضو کے لیے پانی مانگا، وضو کر کے آپ بے خطر حرم کی سمت روانہ ہوگئے، جب خاص صحن حرم میں پہنچے، اور کفار کی نظر آپ پر پڑی تو خود بخود ان کی نگاہیں جھک گئیں،[2]

جلد اول میں پڑھ چکے ہو کہ شب ہجرت میں قریش کے بہادر خون آشام ارادوں کے ساتھ کاشانۂ اقدس کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، لیکن آپ نے نہایت سکون واطمینان کے ساتھ اپنے عزیز قوت بازو علی مرتضیٰؓ کو اپنی جگہ بستر پر لٹا دیا، حالانکہ اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ قتل گاہ ہے، بستر خواب نہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم تھا کہ ایک قادر کل ہستی ہے، جو تختۂ مقتل کو فرش گل بنا سکتی ہے، ان کو لٹاتے ہوئے نہایت بے پروائی سے فرمایا کہ تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا،[3]

گھر کے چاروں طرف دشمنان قریش محاصرہ کیے ہوئے تھے، اور خیال ہو سکتا تھا کہ صبح امید کے انتظار میں مکہ کے برنا و پیر عجب نہیں کوچوں اور گلیوں میں مشتاق خبر پھر رہے ہوں لیکن آپ نے اذن الٰہی کے اعتماد پر ان تمام ناموافق حالات کی موجودگی میں گھر سے باہر قدم نکالا، اس وقت سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیتیں زبان مبارک پر تھیں جن میں نبوت کی اور اپنے راہ راست پر ہونے کی تصدیق ہے، آخری آیت یہ تھی،

---

[1] صحیح بخاری اواخر جلد اول [2] مسند احمد جلد اول صفحہ ۳۶۸ [3] ابن ہشام وطبری

Marfat.com

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (یسین)

ہم نے ان کے آگے اور انکے پیچھے دیواریں کھڑی کر دی ہیں، انکی آنکھوں پر پردہ ڈالدیا ہے کہ وہ نہیں دیکھتے ہیں،

اور یہ بالکل سچ تھا۔

مکہ سے نکل کر آپ نے مع حضرت ابوبکرؓ کے غار ثور میں پناہ لی، قریش میں خون آشامی کے ساتھ اب اپنی ناکامی کا غصہ بھی تھا، اور اس لیے اس وقت ان کے انتقام کے جذبات میں غیر معمولی تلاطم ہوگا، وہ آپکے تعاقب میں نشانِ قدم کو دیکھتے ہوئے ٹھیک اسی غار کے پاس پہنچ گئے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس پرخطر حالت میں کسی کے حواس برجا رہ سکتے ہیں، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے گھبرا کر عرض کی کہ "یا رسول اللہ! دشمن اسقدر قریب ہیں کہ اگر ذرا نیچے جھک کر اپنے پانوں کی طرف دیکھیں گے تو ہم پر نظر پڑ جائے گی" لیکن آپ نے روحانیت کی پرسکون آواز میں فرمایا "ان دو کو کیا غم ہے جن کے ساتھ تیسرا خدا ہو"[1] پھر جیسا کہ قرآن مجید میں ہے، فرمایا

لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا

غم نہ کر، خدا ہمارے ساتھ ہے،

سینۂ نبوت کے سوا اس روحانی سکون کا جلوہ اور کہاں نظر آسکتا ہے،

قریش کے اس اعلان کے بعد کہ جو محمد کو زندہ یا ان کا سر کاٹ کر لائے گا، اسکو سو اونٹ ملیں گے، سراقہ بن جعشم نے آپکا تعاقب کیا، اور اسقدر قریب پہنچ گیا کہ وہ آپ کو پاسکتا تھا حضرت ابوبکرؓ بار بار گھبرا کر ادھر دیکھ رہے تھے لیکن آپ نے ایک دفعہ بھی مڑ کر نہیں دیکھا کہ سراقہ کس ارادہ سے آرہا ہے، یہاں دل پر وہی سکینتِ ربانی طاری تھی، اور لب ہائے مبارک تلاوتِ قرآن میں مصروف تھے،[2]

---

[1] صحیح بخاری و مسلم ہجرت [2] صحیح بخاری ہجرت،

Marfat.com

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مدینہ آکر آپ کی زندگی ہر قسم کے خطروں سے محفوظ ہو گئی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ گو اسلام کو یہاں اعوان وانصار کی ایک معتد بہ تعداد مل گئی تھی لیکن اسی کے ساتھ ان دشمنوں کا سامنا بھی تھا جو دشمنان مکہ سے زیادہ خطرناک تھے، مکہ میں قریش گو آپ کے دشمن تھے لیکن ان میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نسبی تعلقات تھے، جو کبھی کبھی کسی کو غمخواری اور مواسات پر بھی مائل کر دیتے تھے لیکن مدینہ کے منافقین اور یہود کو مواسات وہمدردی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی، علاوہ بریں یہود و منافقین مدینہ اور قریش مکہ میں باہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل و جلا وطنی کی سازشیں شروع ہو گئی تھیں[1] اس بنا پر صحابہ جاں نثاری کی بنا پر آکر راتوں کو پہرہ دیا کرتے تھے، اسی زمانہ میں ایک رات صحابہ آپ کے خیمہ کا پہرہ دے رہے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی،

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ) اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا،

اور آپ نے اسی وقت خیمہ سے باہر سر نکال کر صحابہ سے فرمایا،[2]

ایہا الناس انصرفوا فقد عصمنی اللہ لوگو واپس جاؤ میری حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے،

غزوۂ نجد سے واپسی میں آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ کیا، یہاں بہت سے درختوں کے جھنڈ تھے، دوپہر کا وقت تھا، صحابہ درختوں کے سایہ میں ادھر ادھر سو رہے تھے، آپ بھی ایک درخت کے نیچے تنہا استراحت فرما تھے، آپ کی تلوار ایک درخت سے لٹکی تھی، کہ ناگاہ ایک بدو جو شاید اسی موقع کی تاک میں تھا، چپکے سے آیا اور آپ کی تلوار اتار کر نیام سے باہر کی اور آپ کے سامنے آیا کہ دفعۃً آپ ہشیار ہوئے، دیکھا کہ ایک بدو تیغ بکف کھڑا ہے، بدو نے پوچھا اے محمد! اب مجھ سے تم کو کون بچا سکتا ہے؟

---

[1] سیرۃ جلد اول سلسلۂ غزوات [2] جامع ترمذی تفسیر مائدہ

Marfat.com

ایک پر اطمینان صدا آئی کہ "اللہ"!

ایک دفعہ ایک شخص گرفتار ہو کر پیش ہوا کہ یہ آپ پر حملہ کی گھات میں تھا، آپ نے فرمایا "اس کو چھوڑ دو کہ یہ مجھکو قتل کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا۔" یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ میری حفاظت کا ذمہ دار کوئی اور ہے، خیبر میں جس یہودیہ نے آپ کو زہر دیا تھا، اس سے آپ نے دریافت کیا کہ "تم نے یہ حرکت کیوں کی؟" اس نے جواب دیا کہ "آپ کے قتل کرنے کے لیے" آپ نے فرمایا کہ خدا تم کو اس پر مسلط نہ کرتا۔"

اُحد اور حنین کے معرکوں میں جب میدانِ جنگ تھوڑی دیر کے لیے جان نثاروں سے خالی ہو گیا تھا، آپ کا استقلال، توکل علی اللہ و سکینت روحانی کی معجزانہ مثال ہے،

یہ توکل اور اعتماد علی اللہ کی یکرخی تصویر ہے، اس مرقع کا دوسرا رخ بھی کچھ اس سے کم مؤثر نہیں ہے، آپ پر فقر و غنا کے مختلف دور گذرے، کوئی دن ایسا آتا کہ مسجد نبوی کا صحن زر و مال سے معمور ہو جاتا، اور پھر متصل کئی کئی دن ایسے آتے کہ فاقہ سے شکم مبارک پر دو دو تین تین پتھر بندھے ہوتے، حالانکہ بالکل ممکن تھا کہ آج کا سرمایہ کل کے مصارف کے لیے اٹھا رکھا جائے، لیکن تمام عمر آپ کا طرز عمل اس کے خلاف رہا، کبھی ایک دن کی آمدنی دوسرے دن کے لیے اٹھا کر نہیں رکھی گئی، ضروری اور بقدر کفاف اخراجات کے بعد جو کچھ بچ جاتا وہ شام تک اہلِ استحقاق پر صرف کر دیا جاتا تھا، ترمذی میں حضرت انسؓ سے روایت ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان لا یدخر لغد — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل کیلیے کوئی چیز اٹھا کر نہیں رکھتے تھے،

۱؎ صحیح بخاری کتاب الجہاد ۲؎ مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۱۴ ۳؎ صحیح مسلم باب السّم،

Marfat.com

اتفاق سے یا بھولے سے اگر کوئی چیز گھر میں رہ جاتی تو آپ کو سخت تکلیف ہوتی تھی، بلکہ آپ اس وقت تک گھر میں تشریف نہیں لیجاتے تھے، جب تک یہ نہ معلوم ہو جاتا کہ اب وہاں خدا کی برکت کے سوا کچھ نہیں ہے[۱]، اس قسم کے متعدد واقعات جود و سخا کے عنوان میں مذکور ہیں۔

نزع کے وقت جب انسان ہر چیز کو فراموش کر دیتا ہے، آپ کو یاد آیا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں، وہ پڑی ہونگی، اس نازک موقع پر بھی یہ سہو آپ کو توکل علی اللہ کی شان کے خلاف نظر آیا، ارشاد ہوا کہ "عائشہ! کیا محمد! خدا سے بدگمان ہو کر ملیگا، جاؤ پہلے ان کو خیرات کر دو[۲]"

صبر و شکر رنج و غم کے متعاقب اور توام دور کسی کی زندگی میں نہیں آتے لیکن انسان کے روحانی کمال کا جوہر یہ ہے کہ ایک طرف حصول مقصد اور کامیابی کے نشہ میں سرشار اور از خود رفتہ نہ ہو تو دوسری طرف مصائب و آلام کی تلخی کو خندہ جبینی اور کشادہ دلی کے ساتھ گوارا کرلے اور یقین رکھے کہ انسان کا فرض صرف عمل ہے، کامیابی و ناکامی کا سر رشتہ کسی بالاتر ہستی کے ہاتھ میں ہے، قرآن مجید نے اس آیت میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ	جتنی مصیبتیں زمین پر اور خود تم پر نازل ہوتی ہیں وہ ان کے وجود سے پہلے دیوان قضا میں لکھ دی گئی ہیں، یہ بات خدا کے لیے آسان ہے، یہ اس لیے کیا گیا تاکہ تم ناکامی پر غم اور حصول مقصد پر فخر نہ کرو، خدا مغرور اور فخار

[۱] صحیح بخاری باب من صلی بالناس فذکر حاجۃ فتخطاہم و مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۲۹۔ [۲] ابوداؤد باب قبول ہدایا المشرکین [۳] مسند احمد و ابن سعد جزء الوفاۃ۔

لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (حدید - ۳) کو دوست نہیں رکھتا،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی میں وہ بڑی سے بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں، جو اس آسمان کے نیچے نوع انسان کے کسی فرد کو حاصل ہو سکتی تھیں، تاہم آپ کے آئینۂ دل میں کبھی فخر و غرور نے اپنا عکس نہیں ڈالا، آپ نے فرمایا انا سید ولد آدم ولا فخر "میں آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں، لیکن مجھے اس پر فخر نہیں،" عدی بن حاتم طائی نے جو مذہباً عیسائی تھے، آپ کے جو حالات سنے تھے ان کی بنا پر ان کو یہ شک تھا کہ آپ بادشاہ ہیں یا پیغمبر؟ جب وہ اپنے قبیلہ کا وفد لیکر حاضر خدمت ہوئے تو عین اسی وقت ایک مسکین سی عورت اپنی کسی غرض کے لیے بارگاہ اقدس میں آئی اور مجمع سے ذرا ہٹ کر کچھ سن لینے کی درخواست کی، آپ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس وقت تک گلی میں کھڑے رہے جب تک وہ خود اپنی مرضی سے چلی نہیں گئی، عدی کہتے ہیں کہ آپ کی تواضع اور خاکساری کا یہ عالم دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ پیغمبر ہیں، بادشاہ نہیں[1]،

مفتوح شہروں میں داخل ہوتے ہوئے دنیا کے ہر فاتح کا سر غرور و ناز سے بلند ہو جاتا ہے، لیکن مکہ و خیبر کا فاتح اس وقت بھی اپنا سر نیاز بارگاہ ایزدی میں جھکا کر شہر میں داخل ہوا، ابن اسحاق نے روایت کی ہے کہ فتح مکہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذی طوی میں پہنچے اور دیکھا کہ خدا نے آپ کو فتح کی عزت عطا کی ہے تو آپ نے اپنی سواری پر توقف کیا۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما انتھی الی ذی طوی وقف علی راحلتہ .... لیضع را

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذی طوی میں پہنچے اور دیکھا کہ خدا نے آپ کو فتح کی عزت عطا کی ہے تو آپ نے اپنی سواری پر توقف کیا...

---

[1] سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۲۷۰ جلد ۲

Marfat.com

تواضعًا للہ حین رای ما اکرمہ اللہ بہ من الفتح — تاکہ اپنا سر خدا کے سامنے جھکالیں، پھر یہاں تک آپ جھکے کہ

حتی ان عثنونہ لیکاد یمس واسطۃ الرحل[1] — آپ کی ٹھڈی قریب تھی کہ کجاوہ کی لکڑی سے لگ جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے عبادت اور تسبیح وتہلیل کیا کرتے تھے، بعض صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ!

خدا تو آپ کو بے گناہ اور معصوم بنا چکا، اب آپ کیوں یہ زحمت اٹھاتے ہیں، ارشاد ہوا

افلا اکون عبدًا شکورًا[2] — کیا میں خدا کا شکر گذار بندہ نہ ہوں

یعنی اگر یہ تعبد وتسبیح وتحمید پہلے اس مرتبہ کے حصول کے لیے تھی تو اب اس مرتبہ کے حصول پر شکر گذاری اور احسان مندی کے اعتراف میں ہے۔

دنیا کے اعاظم رجال جن کو روحانیت کا کوئی حصہ نہیں دیا گیا اپنی ہر کامیابی کو اپنی قوت بازو اپنے حسن تدبیر اور اپنے ذاتی رعب داب کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن مقربین الٰہی کی اصطلاح میں یہ تخیل شرک وکفر کے ہم پایہ ہے، ان کو ہر کامیابی اور مسرت کے واقعہ کے اندر قادر کل کا دست غیر مرئی کام کرتا ہوا نظر آتا ہے، حدیث میں[3] ہے کہ

انہ کان اذا جاءہ امر سرور او بشر بہ — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی خوشی کی خبر آتی تھی تو

خر ساجدًا شاکرًا للہ تعالیٰ — خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کیلئے آپ فورًا سجدہ میں گر پڑتے تھے۔

قبیلہ ہمدان کے اسلام لانے کی خبر جب آپ کو پہنچی تو آپ نے سجدۂ شکر ادا کیا،[4] اسی طرح ایک دفعہ اور کسی بات پر آپ کو خبر دی گئی تو آپ فورًا سجدۂ الٰہی بجا لائے۔[5]

---

[1] سیرت ابن ہشام ذکر فتح مکہ [2] صحیح بخاری قیام اللیل [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سجود الشکر [4] زاد المعاد بحوالہ بیہقی بسند علی شرط البخاری جلد اول صفحہ ۹ [5] زاد المعاد مذکور بحوالہ ابن ماجہ

Marfat.com

وحی کے ذریعہ سے جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ جو مجھ پر درود بھیجے گا، اس پر خدا درود بھیجے گا تو اس رفع منزلت پر آپ نے سجدۂ شکر ادا کیا۔[1]

حضرت سعدؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ سے مدینہ طیبہ روانہ ہوئے اور جب مقام عزوراء کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر گئے اور ہاتھ اٹھا کر دیر تک بارگاہ الٰہی میں دعا کی، پھر سجدہ میں گئے، اور دیر تک اسی حالت میں پڑے رہے، پھر سر اٹھا کر بدستور دعا کیلیے ہاتھ پھیلائے اور پھر دیر تک سجدہ میں رہے، پھر اٹھ کر تضرع کے ساتھ دعا شروع کی اور اسکے بعد جبین نیاز خاک پر رکھی، اس دعا و سجود سے فارغ ہو کر آپ نے صحابہ سے فرمایا "میں نے اپنی امت کی مغفرت کے لیے خدا سے دعا مانگی تھی جس کا ایک حصہ مقبول ہوا، میں شکر کے لیے سجدہ میں گرا، پھر مزید درخواست کی، اس نے وہ بھی قبول کی، میں سجدۂ شکر بجا لایا اور پھر دعا و زاری کی، اس نے اس کو بھی درجۂ استجابت بخشا، اور پھر میں سجدہ میں گر پڑا۔"[2]

سورۂ والضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے آپکے اسی وصف کو نمایاں فرمایا ہے۔

وَالضُّحٰى، وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰى، مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى، وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى، وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى، اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى، وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى، وَوَجَدَكَ عَائِلًا

(اے پیغمبر) دن کے پہلے پہر کی قسم، اور رات کی قسم جب وہ پردہ ڈالدے کہ تیرے پروردگار نے نہ تجکو چھوڑا اور نہ تجھ سے ناراض ہوا یقیناً تیری پچھلی زندگی پہلی سے بہتر ہے، وہ تجکو وہ کچھ دیگا جس سے تو خوش ہو جائیگا، کیا اس نے تجھکو یتیم نہیں پایا تو اپنے پناہ میں لے لیا، اور تجھ کو راہ حق کا جویاں پایا تو اس نے سیدھی

---

[1] مسند احمد عن عبدالرحمن بن عوف [2] ابوداؤد کتاب السجود

فَاَغْنٰی، فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ، وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ، وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (ضحیٰ-۱)

راہ دکھا دی، اور تجھ کو مفلس پایا تو غنی کر دیا (ان نعمتوں کے شکریہ میں) یتیم پر ظلم نہ کرنا اور سائل کو نہ جھڑکنا اور اپنے پروردگار کے احسان کو یاد کرتے رہنا۔

آپ کی سوانحِ زندگی کا حرف حرف شاہد ہے کہ آپ عمر بھر کیونکر اس ارشادِ ربانی کی تعمیل کرتے رہے۔

صبر کا مفہوم بالکل شکر کے مخالف ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک میں یہ دونوں متضاد اوصاف ایک ساتھ جمع ہو گئے تھے، اور آپ کو عملاً دونوں کے اظہار کا موقع ملا، حدیث شریف میں ہے ایک صحابی نے آپ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! سب سے زیادہ مصیبت کس پر آتی ہے؟ ارشاد ہوا کہ "پیغمبروں پر، پھر اسی طرح درجہ بدرجہ لوگوں پر"[1] واقعات بھی اس روایت کی تصدیق کرتے ہیں، آپ سرور انبیاء تھے، اس بنا پر دنیا کے شدائد اور مصائب کا بار اس مقدس گروہ میں سب سے زیادہ آپ کے دوشِ مبارک پر تھا، اسی لیے قرآن مجید میں بار بار آپ کو صبر کی تلقین کی گئی ہے، سورۂ احقاف میں ہے

وَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (اے پیغمبر! جس طرح اولو العزم پیغمبروں نے صبر کیا تم بھی صبر کرو)

آپ ابھی پیدا نہ ہوئے تھے کہ والد نے انتقال کیا، عہدِ طفولیت میں تھے کہ سر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا، اس کے دو برس کے بعد دادا نے جن کی نگاہِ لطف زخمِ یتیمی کا مرہم تھی، وفات پائی، نبوت کے بعد ابوطالب نے جو قریش کے ظلم و ستم کے سپر تھے، مفارقت کی، محرم اسرار ام المومنین خدیجۃ الکبریٰؓ جو اس ہجوم مصائب میں آپ کی تنہا مونس و غمخوار تھیں، موت نے ان کو بھی اسی زمانہ میں آپ سے علیحدہ کر دیا، والدین اور بیوی کے بعد انسان کو سب سے زیادہ اولاد سے محبت ہوتی ہے جس کی مفارقت کا زخم تمام عمر مندمل نہیں ہوتا،

[1] سنن ابن ماجہ باب الصبر علی البلاء۔

Marfat.com

آپ کی اولاد کی حسب اختلاف روایت کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ آٹھ تھی، لڑکیوں کی تعداد چار تھی، لیکن ایک حضرت فاطمہؓ کے سوا سب نے کمسنی یا جوانی میں آپ کی نگاہوں کے سامنے جان دی، ان واقعات پر اگرچہ کبھی کبھی آپ کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں لیکن زبان و دل پر ہمیشہ صبر و سکینت کی مہر لگی رہی اور کبھی کوئی کلمہ زبان مبارک سے ایسا نہیں نکلا جس سے کارکنان قضا کی شکایت کا پہلو نکلتا ہو۔

آپ کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے ۸ھ میں وفات پائی تو تجہیز و تکفین کے متعلق آپ نے خود بنفس نفیس ہدایات دیں، جنازہ قبر کے سامنے رکھا گیا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، لیکن زبان مبارک سے ایک لفظ بھی نہ نکلا، حضرت زیدؓ (پروردہ خاص) اور حضرت جعفرؓ (ابن عم) دونوں آپ کو بہت محبوب تھے، غزوۂ موتہ میں ان کی شہادت کی خبر آئی، تو چشم مبارک اشک آلود ہوگئی، لیکن اسی اثناء میں حضرت جعفرؓ کے گھر سے نوحہ کی آواز آئی تو آپ نے منع کرا بھیجا، آپ کے ایک نواسا جس سے آپ کو محبت تھی مبتلائے نزع ہوا تو صاحبزادی نے بلا بھیجا لیکن آپ نے اس کے جواب میں سلام کے بعد یہ پیغام بھیجا،

ان للہ ما اخذ وللہ ما اعطی وکل عندہ	اللہ نے جو لے لیا وہ اسی کا تھا، اور جو دیا وہ بھی اسی کا ہے،
باجل مسمّی فلتصبر ولتحتسب	اسکا ہر کام وقت مقررہ پر ہوتا ہے، صبر کرو اور اس سے خیر طلب کرو،

صاحبزادی نے دوبارہ باصرار بلایا، آپ چند صحابہ کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے، بچہ آپ کی گود میں رکھ دیا گیا، وہ دم توڑ رہا تھا، آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، ایک صحابی نے کہا "یا رسول اللہ یہ کیا ہے"۔ فرمایا جذبۂ محبت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دل میں رکھا ہے، خدا اپنے بندوں میں سے رحمدلوں ہی پر رحم کرتا ہے۔

Marfat.com

ایک بار آپ سعد بن عبادہ کی عیادت کو تشریف لائے، اور ان کی حالت دیکھکر فرمایا "انتقال کر گئے" صحابہ نے کہا نہیں یا رسول اللہ" آپ رو پڑے، تو آپ کو روتے دیکھ کر صحابہ بھی رو پڑے آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ آنکھوں کے آنسو اور دل کے غم کو منع نہیں کرتا، لیکن (زبان کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ) اس سے عذاب ہوتا ہے، حضرت ابراہیم کی وفات کے وقت جب آپ کی آنکھوں سے اشک محبت جاری ہوئے تو عبدالرحمن بن عوف نے کہا "یا رسول اللہ! یہ کیا بات ہے" فرمایا "یہ رحمت و شفقت ہے" حضرت عبدالرحمن نے دوبارہ گذارش کی، ارشاد ہوا۔

ان العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول	آنکھ اشک ریز ہے، دل غمگین ہے لیکن ہم وہی کہیں گے جو
الا ما یرضی ربنا وانا بفراقک یا ابراھیم	ہمارے رب کی مرضی ہو، اے ابراہیم ہم تیرے فراق میں
لمحزونون	بہت غمگین ہیں۔

بہرحال یہ واقعات آنی ہیں یعنی ان کا اثر ایک خاص وقت تک انسان پر رہتا ہے پھر مٹ جاتا ہے لیکن مسلسل اور غیر منقطع مصائب حوادث کو اس طرح برداشت کرنا کہ کبھی پیمانہ صبر لبریز نہ ہونے پائے سخت مشکل ہے، ہجرت سے پہلے ۱۳ سال تک طائف اور مکہ کے اشقیا نے دعوت حق کا جس تحقیر و استہزا، سب و شتم، تعذیب ایذا رسانی کے ساتھ جواب دیا، اس کے دہرانے کی حاجت نہیں، مدینہ منورہ میں آٹھ نو برس تک جن خونی معرکوں کا ہمیشہ سامنا رہا، اور دشمنوں نے آپ کی جلا وطنی و قتل و شکست کے جو جو منصوبے باندھے، ان کے اعادہ کی بھی ضرورت نہیں لیکن ان تمام تیروں کی بوچھار صبر کے سوا آپ نے کس سپر پر روکی؟

لہ ان تمام واقعات کے لیے صحیح بخاری کتاب الجنائز دیکھو۔

Marfat.com

اس سے بھی زیادہ مشکل ان واقعات پر صبر ہے جو خود اختیاری ہوں، فتوحات کی کثرت گو ہر دفعہ بیت المال کو معمور کر دیتی تھی لیکن دستِ کرم کو اسی وقت آرام ملتا جب سارا خزانہ ارباب حاجت اور فقراء میں لٹ چکا ہوتا، چنانچہ اسی بنا پر خود آپ اور تمام اہلبیت کی زندگی اکثر فقر و فاقہ میں گذرتی تھی، جسم مبارک کے لیے ایک کے سوا کپڑے کا کوئی دوسرا جوڑا نہیں ہوتا تھا، تاہم یہ تمام شدائد اس لیے گوارا تھے کہ صبر کی لذت الوانِ نعمت کی خوش گواری اور لباس ہائے فاخرہ کی مسرت سے کہیں زیادہ تھی۔

لیکن سب سے زیادہ حوصلہ شکن اور صبر آزما اس تیر کا نشانہ ہے جو دشمنوں کے نہیں بلکہ دوستوں کے ہاتھ سے لگایا جائے، دو دفعہ ایسا ہوا کہ بعض جلد باز نوجوانوں نے آپ کے کسی فعل پر جو کسی مصلحت پر مبنی تھا، اعتراض کیا، اس موقع پر بھی صبر کا رشتہ آپ کے ہاتھ سے نہ چھوٹا، صحیح بخاری میں ہے کہ غنائم حنین کے متعلق ایک دو انصاریوں نے اعتراض کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دوسروں کو کیوں دیدیا، حق تو ہمارا تھا، آپ کو اس کی خبر پہنچی تو فرمایا

رحمۃ اللہ علی موسیٰ قد اوذی اکثر من ذالک فصبر۔ (باب غزوہ حنین) | موسیٰ پر خدا کی رحمت ہو وہ اس سے بھی زیادہ اذیت دہ باتوں کی طرف سے ستائے گئے ہیں لیکن انھوں نے صبر کیا۔)

اخلاقِ نبویؐ

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ

حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اقدس کا یہ وہ حصہ ہے جہاں آکر آپ کی زندگی تمام انبیائے کرام اور مصلحین عالم سے علانیہ ممتاز نظر آتی ہے، تاریخی ہستی کا ثبوت ایک طرف اگر یہ سوال کیا جائے کہ ان اخلاقی واعظوں کا خود عملی نمونہ کیا تھا تو دنیا اس کے جواب سے عاجز رہ جائے گی دنیا کے تمام مصلحین اخلاق میں گوتم بدھ اور مسیح کا درجہ سب سے بڑا ہے لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ہندستان کا یہ مصلح اعظم (بودھ) عملاً کیا تھا، کوہ زیتون کے رحیمانہ اخلاق کا واعظ (مسیح) دنیا کو اخلاق کا بہترین درس دیتا تھا لیکن اس کی زندگی کا ایک واقعہ بھی اس کے زریں مقولوں کی تائید میں تم کو معلوم ہے؟ لیکن مکہ کا معلم امی پکار کر کہتا تھا،

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (بقرہ) جو نہیں کرتے، وہ کہتے کیوں ہو،

وہ خود اپنی تعلیم کا آپ نمونہ تھا، انسانوں کے مجمع عام میں وہ جو کچھ کہتا تھا، گھر کے خلوت کدہ میں وہ اسی طرح نظر آتا تھا، اخلاق و عمل کا جو نکتہ وہ دوسروں کو سکھاتا تھا وہ خود اس کا عملی پیکر بنجاتا تھا، بیوی سے بڑھکر انسان کے اخلاق کا اور کون رازداں ہوسکتا ہے، چند صاحبوں نے آکر حضرت عائشہؓ سے درخواست کی کہ حضرت کے اخلاق بیان کیجیے، انھوں نے پوچھا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے ان خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان القرآن، آپ کا اخلاق ہمہ تن قرآن تھا،[1]

[1] ابو داؤد باب الصلوٰۃ فی اللیل

موجودہ صحائفِ آسمانی اپنے داعیوں کے بہترین اقوال کا مجموعہ ہیں لیکن کیا انکا ایک حرف بھی اپنے مبلغین کے عمل کا مدعی ہے، قرآن مجید لاکھوں مخالفین و اہلِ عناد کی بھیڑ میں اپنے داعی حق کی نسبت گویا تھا،

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ — اے محمد تم اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو۔

بیدردنکتہ چیں آج تیرہ سو برس کے بعد آپ کو سنگدل کہتے ہیں لیکن اس وقت جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا قرآن خود دشمنوں کے مجمع میں آپ کی نسبت کیا شہادت دے رہا تھا،

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران) — خدا کی عنایت سے تم ان سے بنرمی پیش آتے ہو، اگر تم کہیں کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے ہٹ جاتے۔

دوسری جگہ کہتا ہے:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ) — تمہارے پاس تم ہی سے خود ایک پیغمبر آیا، اس پر تمہاری تکلیف بہت شاق گذرتی ہے، تمہاری بھلائی کا دہ بھوکا ہے، اہل ایمان پر نہایت نرم اور مہربان ہے۔

مسئلہ اخلاق کی نسبت ایک بڑی غلطی یہ کی گئی ہے کہ صرف رحم و رافت اور تواضع وخاکساری کو پیغمبرانہ اخلاق کا مظہر قرار دیدیا گیا، حالانکہ اخلاق وہ چیز ہے جو زندگی کی ہر قسم اور واقعات کے ہر پہلو میں نمایاں ہوتی ہے، دوست و دشمن، عزیز و بیگانہ، صغیر و کبیر، مفلس و تونگر، صلح و جنگ، خلوت و جلوت غرض ہر جگہ اور ہر ایک تک دائرۂ اخلاق کی وسعت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوانِ اخلاق پر اسی حیثیت سے نظر ڈالنی چاہیے)

اخلاق نبوی کا جامع بیان (اس سے پہلے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق مبارکہ کے جزئی اور تفصیلی واقعات لکھے جائیں، اُن صاحبوں کے بیانات زیر تحریر آتے ہیں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سالہا سال اور مدتہائے دراز بسر کی ہیں اور جو آپ کے اخلاق وعادات کے دفتر کے ایک ایک حرف سے واقف تھے۔ انسان کے حالات کا واقفکار بیوی سے بڑھکر دنیا میں کون ہو سکتا ہے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ جو نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد ۱۵ برس تک آپکی خدمتِ زوجیت میں رہی تھیں، زمانہ آغاز وحی میں آپ کو ان الفاظ میں تسلی دیتی تھیں "ہرگز نہیں، خدا کی قسم، خدا آپ کو کبھی غمگین نہ کریگا، آپ صلہ رحم کرتے ہیں، مقروضوں کا بار اٹھاتے ہیں، غریبوں کی اعانت کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق کی حمایت کرتے ہیں، مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں[1]"

امہات المومنین میں حضرت عائشہؓ سے بڑھکر کسی نے آپکے اوصاف تفصیل سے نہیں بیان کئے ہیں، فرماتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کسی کو برا بھلا کہنے کی نہ تھی، برائی کے بدلہ میں برائی نہیں کرتے تھے، بلکہ درگذر کرتے تھے، اور معاف فرمادیتے تھے[2]، آپ کو جب دو باتوں میں اختیار کیا جاتا تو ان میں جو آسان ہوتی اس کو اختیار فرماتے، بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو، ورنہ آپ اس سے بہت دور ہوتے، آپنے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا لیکن جو احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتا خدا اس سے انتقام لیتا تھا[3] (یعنی خدا کی طرف سے بموجب احکام ربانی آپ اس پر حد جاری فرماتے تھے) آپنے نام لیکر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی، آپنے کبھی کسی غلام کو، لونڈی کو، کسی عورت کو، خادم کو[4]، جانور کو اپنے

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی [2] جامع ترمذی وشمائل ترمذی [3] صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد۔ کتاب الادب [4] یہ تفصیل مسلم، ابوداؤد وغیرہ احادیث کی مختلف روایات میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔

Marfat.com

ہاتھ سے نہیں مارا، آپ نے کسی کی کوئی درخواست رد نہیں فرمائی لیکن یہ کہ وہ ناجائز ہو[۱]، آپ جب گھر کے اندر تشریف لاتے تو نہایت خندان، ہنستے اور مسکراتے ہوئے، دوستوں میں پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے[۲]، باتیں ٹھہر ٹھہر کر اس طرح فرماتے تھے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ لے[۳]۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے اور آغاز نبوت سے آخر عمر تک کم از کم ۲۳ برس آپ کی خدمت اقدس میں رہے تھے، ایک دفعہ حضرت امام حسینؓ نے ان سے آپ کے اخلاق و عادات کی نسبت سوال کیا، فرمایا، آپ خندہ جبیں، نرم خو، مہربان طبع تھے، سخت مزاج اور تنگدل نہ تھے، بات بات پر شور نہیں کرتے تھے، کوئی برا کلمہ منھ سے کبھی نہیں نکالتے تھے، عیب جو اور تنگ گیر نہ تھے۔ کوئی ایسی بات ہوتی جو آپ کو ناپسند ہوتی تو اس سے اغماض فرماتے تھے، کوئی آپ سے اس کی امید رکھتا تو نہ اس کو مایوس بناتے تھے اور نہ منظوری ظاہر فرماتے تھے، (یعنی صراحۃً انکار و تردید نہیں کرتے تھے، بلکہ خاموش رہتے تھے، اور مزاج شناس آپ کے تیور سے آپ کا مقصد سمجھ جاتے تھے) اپنے نفس سے تین چیزیں آپ نے بالکل دور کر دی تھیں، بحث و مباحثہ، ضرورت سے زیادہ بات کرنا اور جو بات مطلب کی نہ ہو اس میں پڑنا، دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز کرتے تھے، کسی کو برا نہیں کہتے تھے، کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے، کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے، وہی باتیں کرتے تھے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا تھا، جب آپ کلام کرتے صحابہ اس طرح خاموش ہو کر اور سر جھکا کر سنتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں، جب آپ چپ ہو جاتے تو پھر وہ آپس میں بات چیت کرتے، کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا، چپ سنا کرتے، لوگ جن باتوں پر

---

[۱] حاکم بسند متصل۔ اس کے بعض ٹکڑے صحیح مسلم میں بھی ہیں [۲] ابن سعد [۳] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد،

Marfat.com

ہنستے آپ بھی مسکرا دیتے جن پر لوگ تعجب کرتے، آپ بھی کرتے، کوئی باہر کا آدمی اگر بیباکی سے گفتگو کرتا تو آپ تحمل فرماتے، دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے لیکن اگر کوئی آپکے احسان وانعام کا شکریہ ادا کرتا، تو قبول فرماتے جبتک بولنے والا خود چپ نہ ہو جاتا آپ اس کی بات درمیان سے نہیں کاٹتے تھے[1]، نہایت فیاض، نہایت راست گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے، اگر کوئی دفعۃً آپ کو دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپ سے محبت کرنے لگتا[2]"

ہند بن ابی ہالہ جو گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آغوش پرورده تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ "آپ[3] نرم خو تھے، سخت مزاج نہ تھے، کسی کی توہین روا نہیں رکھتے تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہار شکر فرماتے تھے، کسی چیز کو برا نہیں کہتے تھے، کھانا جس قسم کا سامنے آتا تناول فرماتے، اور اسکو برا بھلا نہ کہتے، کوئی اگر کسی امر حق کی مخالفت کرتا تو آپ کو غصہ آجاتا، اور اس کی پوری حمایت کرتے لیکن خود اپنے ذاتی معاملہ پر کبھی آپ کو غصہ نہیں آیا اور نہ کسی سے انتقام لیا)

مداومت عمل | (اخلاق کا سب سے مقدم اور ضروری پہلو یہ ہے کہ انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر اسقدر استقلال کے ساتھ قائم رہے کہ گویا وہ اس کی فطرتِ ثانیہ بنجائے، انسان کے سوا تمام دنیا کی مخلوقات صرف ایک ہی قسم کا کام کر سکتی ہے، اور وہ فطرۃً اسی پر مجبول ہے، آفتاب صرف روشنی بخشتا ہے، اس سے تاریکی کا صدور نہیں ہو سکتا، رات تاریکی ہی پھیلاتی ہے، وہ روشنی کی علت نہیں، درخت اپنے موسم ہی میں پھلتے ہیں اور پھول ایام بہار ہی میں پھولتے ہیں، حیوانات کا ایک ایک فرد اپنے نوعی افعال و اخلاق سے ایک سر مو تجاوز نہیں کر سکتا، لیکن انسان خدا کی طرف سے مختار پیدا ہوا ہے، وہ آفتاب بھی ہے اور

---

[1] یہ پوری تفصیل شمائل ترمذی بیان اخلاق میں ہے [2] یہ ٹکڑا شمائل ترمذی بیان حلیہ مبارک میں ہے [3] شمائل ترمذی

Marfat.com

رات کی تاریکی بھی، اس کے جوہر کا درخت ہر موسم میں پھلتا ہے، اور اس کے اخلاق کے پھول ایام بہار کے پابند نہیں، وہ حیوانات کی طرح کسی ایک ہی خاص قسم کے اعمال و اخلاق پر مجبور نہیں، اس کو اختیار دیا گیا ہے اور یہی اختیار اس کے مکلف اور ذمہ دار ہونے کا راز ہے،

لیکن اخلاق کا ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے اخلاق حسنہ کا جو پہلو پسند کرے، اس کی شدت سے پابندی کرے، اور اس طرح دائمی اور غیر متبدل طریقے سے اس پر عمل کرے کہ گویا وہ اپنے اختیار کے باوجود اس کام کے کرنے پر مجبور رہے، اور لوگ دیکھتے دیکھتے یقین کرلیں کہ اس شخص سے اس کے علاوہ اور کوئی بات سرزد ہو ہی نہیں سکتی، گویا اس سے یہ افعال اس طرح صادر ہوتے ہیں، جیسے آفتاب سے روشنی، درخت سے پھل اور پھول سے خوشبو کہ یہ خصوصیات ان سے کسی حالت میں الگ نہیں ہوسکتیں، اسی کا نام استقامت حال اور مداومت عمل ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام کاموں میں اسی اصول کی پابندی فرماتے تھے، جس کام کو جس طرح سے جس وقت آپ نے شروع فرمایا، اس پر برابر شدت کے ساتھ قائم رہتے تھے، سنت کا لفظ ہماری شریعت میں اسی اصول سے پیدا ہوا ہے، سنت وہ فعل ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ مداومت فرمائی اور بغیر کسی قوی مانع کے کبھی اس کو ترک نہیں فرمایا، اس بنا پر جس قدر سنن ہیں وہ درحقیقت آپ کی استقامت حال اور مداومت عمل کی ناقابل انکار مثالیں ہیں، آپ کے معمولات کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے جس سے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ آپ کے تمام اخلاق و اعمال کس قدر پختہ اور مستحکم تھے، کہ کبھی تمام عمر ان میں ایک ذرہ فرق نہیں پیدا ہوا، ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عبادات و اعمال کے متعلق حضرت عائشہؓ سے دریافت فرمایا کہ کیا آپ کسی خاص دن یہ کرتے تھے، انھوں نے جواب دیا لا کان عملہ دیمۃ

Marfat.com

آپ کا عمل جھڑی ہوتا تھا یعنی جس طرح بادل کی جھڑی برسنے پر آتی ہے تو نہیں رکتی، اسی طرح آپ کا حال تھا کہ جو بات ایک دفعہ آپ نے اختیار کرلی، ہمیشہ اس کی پابندی کی، پھر فرمایا وایکم یستطیع ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یستطیع، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کر سکتے تھے وہ تم میں سے کون کر سکتا ہے[1]، دوسری روایت میں ہے،

وکان اذا عمل عملاً اثبتہ[2] — جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی کام کرتے تھے تو اس پر مداومت فرماتے تھے،

اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خود ارشاد ہے[3]،

ان احب العمل الی اللہ ادومہ — خدا کے نزدیک سب سے محبوب کام وہ ہے جس پر سب سے زیادہ انسان مداومت کرے،

آپ راتوں کو اٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی رات کی یہ عبادت ترک نہیں کی، اگر کبھی مزاج اقدس ناساز یا سست ہوا تو بیٹھ کر ادا کرتے تھے[4]، جریر بن عبداللہؓ ایک صحابی ہیں، جن کو دیکھ کر آپ محبت سے مسکرا دیا کرتے تھے، ان کا بیان ہے کہ کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا ہوں اور آپ نے مسکرا نہ دیا ہو[5]،

جس کام کے کرنے کا جو وقت آپ نے مقرر کر لیا تھا، اس میں کبھی تخلف نہ ہوا، نماز اور تسبیح وتہلیل کے اوقات، نوافل کی تعداد، خواب و بیداری کے مقررہ ساعات، ہر شخص سے ملنے جلنے کے طرز و انداز میں کبھی فرق نہ آیا، (یہی مسلمانوں کی زندگی کا دستور العمل ہے)

حسن خلق | حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت انسؓ، حضرت ہند بن ابی ہالہ وغیرہ جو مدتوں آپ کی خدمت میں رہے تھے، ان سب کا متفقاً بیان ہے کہ آپ نہایت نرم مزاج، خوش اخلاق اور نکو سیرت تھے، آپ کا

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرقاق [2] ابوداؤد، آخر کتاب الصلوٰۃ و صحیح بخاری کتاب الادب [3] ایضاً [4] ابوداؤد قیام اللیل [5] صحیح مسلم مناقب جریر بن عبداللہ۔

Marfat.com

چہرہ ہنستا تھا، وقار و متانت سے گفتگو فرماتے تھے، کسی کی خاطر شکنی نہیں کرتے تھے،

معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام اور مصافحہ فرماتے، کوئی شخص جھک کر آپکے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اسکی طرف سے رخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منھ نہ ہٹا لے[۱] مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا یعنی کسی سے ہات ملاتے تو جب تک وہ خود نہ چھوڑ دے، اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے، مجلس میں بیٹھتے تو آپکے زانوں کبھی ہمنشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے،[۱]

اکثر نوکر چاکر، لونڈی غلام خدمتِ اقدس میں پانی لیکر آتے کہ آپ اس میں ہات ڈالدیں تاکہ متبرک ہو جائے، جاڑوں کے دن اور صبح کا وقت ہوتا، تاہم آپ کبھی انکار نہ فرماتے،[۲]

ایک دفعہ آپ سعد بن عبادہؓ سے ملنے گئے، واپس آنے لگے تو انھوں نے اپنے صاحبزادہ قیسؓ کو ساتھ کر دیا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب جائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیسؓ سے کہا تم بھی میرے اونٹ پر سوار ہو لو، انھوں نے بے ادبی کے لحاظ سے تامل کیا، آپنے ارشاد فرمایا کہ یا سوار ہو لو یا گھر واپس جاؤ، وہ واپس چلے آئے،[۳]

ایک دفعہ نجاشی کے ہاں سے ایک سفارت آئی، آپنے اس کو اپنے ہاں مہمان رکھا، اور خود بہ نفسِ نفیس مہمانداری کے تمام کام انجام دیے، صحابہ نے عرض کی کہ ہم یہ خدمت انجام دینگے، ارشاد ہوا کہ ان لوگوں نے میرے دوستوں کی خدمت گذاری کی ہے، اسلیے میں خود ان کی خدمت گذاری کرنی چاہتا ہوں،[۴]

---

[۱] ابوداؤد و ترمذی [۲] صحیح مسلم باب فی قرب النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الناس [۳] سنن ابوداؤد کتاب الادب [۴] شرح شفاے قاضی عیاض بحوالہ دلائل بیہقی جلد اخلاق،

Marfat.com

عتبانؓ بن مالک جو اصحاب بدر میں تھے، ان کی بینائی میں فرق آگیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر درخواست کی کہ میں اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھاتا ہوں لیکن جب بارش ہو جاتی ہے، تو مسجد تک جانا مشکل ہو جاتا ہے، اسلئے اگر آپ میرے گھر میں تشریف لاکر نماز پڑھ لیتے تو میں اسی جگہ کو سجدہ گاہ بنا لیتا، دوسرے دن صبح کے وقت آپ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لیکر ان کے گھر گئے اور دروازہ پر ٹھہر کر اذن مانگا، اندر سے جواب آیا تو گھر میں تشریف لے گئے اور دریافت فرمایا کہ کہاں نماز پڑھوں؟ انھوں نے جگہ بتا دی، آپ نے تکبیر کہکر دو رکعت نماز ادا کی، نماز کے بعد لوگوں نے کھانے کے لیے اصرار کیا، خزیرہ ایک کھانا ہوتا ہے، قیمہ پر آٹا چھڑک کر تیار کرتے ہیں، وہ سامنے آیا، محلہ کے تمام لوگ کھانے میں شریک ہوئے، حاضرین میں سے کسی نے کہا مالک بن دخیشن نظر نہیں آتے، ایک نے کہا وہ منافق ہے، ارشاد فرمایا یہ نہ کہو، وہ لاالٰہ الا اللہ کہتے ہیں، لوگوں نے کہا ہاں انکا میلان منافقین کی طرف ہے؛ آپ نے فرمایا جو شخص خدا کی مرضی کیلیے لاالٰہ الا اللہ کہتا ہے، خدا اس پر آگ کو حرام کر دیتا ہے،[1]

ابتداے ہجرت میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مہاجرین انصار کے گھر میں مہمان رہے تھے، دس دس آدمیوں کی ایک ایک جماعت ایک ایک گھر میں مہمان اتاری گئی تھی مقدادؓ بن الاسود کہتے ہیں کہ میں اس جماعت میں تھا جسمیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شامل تھے، گھر میں چند بکریاں تھیں، جن کے دودھ پر گذارا تھا، دودھ دُہ چکتا تو سب لوگ اپنے اپنے حصہ کا پی لیتے، اور آپکے لیے پیالہ میں چھوڑ دیتے، ایک شب کا واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری میں تاخیر ہوئی، لوگ دودھ پی پی کر سو رہے، آپ نے آکر دیکھا تو پیالہ خالی پایا، خاموش ہو رہے، پھر فرمایا خدایا، جو آج کھلائے اس کو

---

[1] بخاری جلد اول صفحہ ۶۱ کتاب الصلوٰۃ۔

تو بھی کھلا دینا، حضرت مقداد چھری لیکر کھڑے ہوئے کہ بکری کو ذبح کر کے گوشت پکائیں، آپ نے روکا اور بکری کو دوبارہ دوہ کر جو کچھ نکلا اسی کو پی کر سو رہے[1] اور کسی کو اس فعل پر ملامت نہ کی ۔

ابو شعیبؓ ایک انصاری تھے، ان کا غلام بازار میں گوشت کی دوکان رکھتا تھا، ایک دن وہ خدمت اقدس میں آئے، آپ صحابہ کے حلقہ میں تشریف فرما تھے، اور چہرہ سے بھوک کا اثر پیدا تھا، ابو شعیبؓ نے جا کر غلام سے کہا کہ پانچ آدمیوں کا کھانا تیار کرو، کھانا تیار ہو چکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ صحابہ کے ساتھ قدم رنجہ فرمائیں، کل پانچ آدمی تھے، راہ میں ایک اور شخص ساتھ ہو لیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو شعیبؓ سے کہا کہ یہ شخص بے کہے ساتھ ہو لیا ہے تم اجازت دو تو یہ بھی ساتھ آئے، ورنہ رخصت کر دیا جائے، انھوں نے کہا آپ ان کو بھی ساتھ لائیں[2] ۔

عقبہؓ بن عامر ایک صحابی تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ کے درہ میں اونٹ پر سوار جا رہے تھے، یہ بھی ساتھ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ "آؤ سوار ہو لو" انھوں نے اس کو گستاخی سمجھا کہ رسول اللہ کو پیادہ بنا کر خود سوار ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ کہا، اب انکار کرنا امتثالِ امر کے خلاف تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتر پڑے اور یہ سوار ہو لیے[3] ۔

مجالس صحبت میں لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت فرماتے، اور اس کا اظہار نہ کرتے، حضرت زینبؓ سے جب نکاح ہوا، اور دعوتِ ولیمہ کی تو کچھ لوگ کھانا کھا کر وہیں بیٹھے رہے، اسوقت پردہ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اور حضرت زینبؓ بھی مجلس میں شریک تھیں، آپ چاہتے تھے کہ لوگ اٹھ جائیں، لیکن زبان سے کچھ نہیں فرماتے تھے، لوگوں نے کچھ خیال نہ کیا، آپ اٹھ کر حضرت عائشہؓ کے حجرہ تک گئے،

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۶ ص ۴ [2] بخاری صفحہ ۸۲۱ [3] نسائی صفحہ ۸۰۳

واپس آئے تو اسی طرح مجمع موجود تھا، پھر واپس چلے گئے، اور دوبارہ تشریف لائے، پردہ کی آیت اسی موقع پر اتری[1]،

غزوۂ حنین سے واپس آرہے تھے کہ راہ میں نماز کا وقت آگیا حسب دستور ٹھہر گئے، موذن نے اذان دی، ابو محذورہ جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے، چند دوستوں کے ساتھ گشت لگا رہے تھے، اذان سن کر سب نے چلا چلا کر استہزا کے طور پر اذان کی نقل اتارنی شروع کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو بلوا کر ایک ایک سے اذان کہلوائی، ابو محذورہؓ خوش لحن تھے، انکی آواز پسند آئی، سامنے بٹھا کر سر پر ہات پھیرا اور برکت کے لیے دعا کی، پھر ان کو اذان سکھلا کر ارشاد فرمایا کہ جاؤ، اسی طرح حرم میں اذان دیا کرنا[2]،

ایک صحابی کا بیان ہے کہ بچپن میں میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا اور ڈھیلوں سے مار کر کھجوریں گراتا، لوگ مجکو خدمت اقدس میں لے گئے، آپ نے پوچھا ڈھیلے کیوں چلاتے ہو؟ میں نے کہا کھجوروں کے لیے، ارشاد فرمایا کہ زمین پر ٹپکی ہوئی کھجوریں کھالیا کرو، ڈھیلے نہ مارو، یہ کہکر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی[3]،

عباد بن شرجبیل مدینہ میں ایک صاحب تھے، ایک دفعہ قحط پڑا اور بھوک کی حالت میں ایک باغ میں گھس گئے، اور خوشے توڑ کر کچھ کھائے، کچھ دامن میں رکھ لیے، باغ کے مالک کو معلوم ہوا تو اس نے آکر انکو مارا اور کپڑے اتروا لیے، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لیکر آئے، مدعا علیہ بھی ساتھ تھا، آپ نے اسکی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ جاہل تھا، اسکو تعلیم دینا تھا، یہ بھوکا تھا اس کو کھانا کھلانا تھا

[1] بخاری ص ۹۲۲ باب آیۃ الحجاب [2] دارقطنی مطبوعہ دہلی ج اص ۸۷ کتاب الصلوۃ [3] ابوداؤد کتاب الجہاد

Marfat.com

یہ کہکر کپڑے واپس دلوائے اور ساٹھ صاع غلہ اپنے پاس سے عنایت فرمایا،[1]

یہود کا دستور تھا کہ عورتوں کو جب ایام آتے تو اُن کو گھروں سے نکال دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے، تو انصار نے آپ سے اسکے متعلق سوال کیا، اس پر آیت اتری کہ اس حالت میں مقاربت ناجائز ہے، اس بنا پر آپ نے حکم دیا کہ مقاربت کے سوا کوئی چیز منع نہیں، یہودیوں نے آپ کا حکم سنا تو بولے کہ یہ شخص بات بات میں ہماری مخالفت کرتا ہے، صحابہ آپ کی خدمت میں آئے کہ یہود جب یہ کہتے ہیں تو ہم مقاربت بھی کیوں نہ کریں، رخسارہ مبارک غصہ سے سرخ ہوگیا، دونوں صاحب چلے گئے، آپ نے ان کے پاس کچھ کھانے کی چیزیں بھیجیں اس وقت اُن کو تسکین ہوئی کہ آپ ناراض نہ تھے،[2]

کسی شخص کی کوئی بات ناپسند آتی تو اکثر اس کے سامنے اس کا تذکرہ نہ فرماتے، ایک دفعہ ایک صاحب عرب کے دستور کے مطابق زعفران لگاکر خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے کچھ نہ فرمایا جب وہ اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں سے کہا کہ ان سے کہدینا کہ یہ رنگ دھوڈالیں،[3]

ایک دفعہ ایک شخص نے باریابی کی اجازت چاہی، آپ نے فرمایا اچھا آنے دو، وہ اپنے قبیلہ کا اچھا آدمی نہیں ہے لیکن جب وہ خدمت مبارک میں حاضر ہوا تو نہایت نرمی کے ساتھ اس سے گفتگو فرمائی، حضرت عائشہؓ کو اس پر تعجب ہوا، اور آپ سے دریافت فرمایا کہ آپ تو اس کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، پھر اس رفق و ملاطفت کے ساتھ کلام کیا، آپ نے فرمایا خدا کے نزدیک سب سے برا وہ شخص ہے جس کی بدزبانی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیں،[4]

---

[1] ابوداؤد جلد ا کتاب الجہاد [2] ابوداؤد باب مواکلۃ الحائض [3] ابوداؤد جلد ۲ کتاب الادب [4] صحیح بخاری وابوداؤد جلد ۲ کتاب الادب باب حسن العشرہ باب الترجل

Marfat.com

یہود جس درجہ شقی اور دشمنِ اسلام تھے، اس کا اندازہ گذشتہ واقعات سے ہو چکا ہوگا، بایں ہمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سنگدلوں کے ساتھ ہمیشہ نرمی اور لطف کا برتاؤ کرتے اور ان سے داد و ستد رکھتے، سخت سے سخت غصہ کی حالت میں صرف اسقدر فرماتے، "اس کی پیشانی خاک آلود ہو"[1]

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں کہ مدینہ میں ایک یہودی رہتا تھا، جس سے میں قرض لیا کرتا تھا، ایک سال اتفاق سے کھجوریں نہیں پھلیں اور قرضہ ادا نہ ہو سکا، اس پر پورا سال گذر گیا، بہار آئی تو یہودی نے تقاضا شروع کیا، اب کی بھی پھل کم آئے، میں نے آیندہ فصل کی مہلت مانگی، اس نے انکار کیا، میں نے آنحضرت صلعم سے آکر تمام واقعات بیان کیے، آپ چند صحابہ کیساتھ خود یہودی کے گھر تشریف لے گئے اور سمجھایا کہ مہلت دیدو، اس نے کہا ابو القاسم! میں کبھی مہلت نہ دونگا، آپ نخلستان میں تشریف لے گئے، اور ایک چکر لگا کر پھر یہودی کے پاس آئے اور اس سے گفتگو کی لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوا، بالآخر آپ نے مجھ سے فرمایا کہ چبوترہ پر (جو مسقّف تھا) فرش بچھاؤ، اس پر آرام فرمایا اور سو گئے، سو کر اٹھے تو پھر یہودی سے خواہش ظاہر کی کہ مہلت دیدے، اس شقی نے اب بھی نہ مانا، آپ درختوں کے جھنڈ میں جا کر کھڑے ہو گئے، اور جابر سے کہا کہ کھجوریں توڑنی شروع کرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اتنی کھجوریں نکلیں کہ یہودی کا قرضہ ادا کر کے بچ رہیں،[2]

مجلس نبوی میں جگہ بہت کم ہوتی تھی، جو لوگ پہلے سے آکر بیٹھ جاتے تھے، ان کے بعد جگہ باقی نہیں رہتی تھی، ایسے موقع پر اگر کوئی آجاتا تو اس کے لیے آپ خود اپنی ردائے مبارک بچھا دیتے تھے، ایک دفعہ مقام جعرانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، اور اپنے ہاتھوں سے لوگوں کو گوشت

---

[1] ادب المفرد امام بخاری [2] بخاری ص ۸۱۸ باب الرطب والتمر

Marfat.com

تقسیم فرما رہے تھے کہ اتنے میں ایک عورت آئی اور آپ کے پاس چلی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو اس کی نہایت تعظیم کی، اپنی چادر مبارک اس کے لیے بچھا دی، راوی کہتا ہے کہ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون عورت تھی، تو لوگوں نے کہا یہ حضور کی رضاعی ماں تھیں،[1]

اسی طرح ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، کہ آپ کے رضاعی والد آئے، آپ نے ان کے لیے چادر کا ایک گوشہ بچھا دیا، پھر رضاعی ماں آئیں، آپ نے دوسرا گوشہ بچھا دیا، آخر میں رضاعی بھائی آئے تو آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کو اپنے سامنے بٹھا لیا،[2]

حضرت ابوذرؓ مشہور صحابی ہیں، ایک دفعہ ان کو بلا بھیجا، تو وہ گھر میں نہیں ملے تھوڑی دیر کے بعد حاضر خدمت ہوئے تو آپ لیٹے ہوئے تھے، ان کو دیکھکر اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے سینہ سے لگا لیا[3]

حضرت جعفرؓ بھی جب حبشہ سے واپس آئے تھے تو انکو گلے لگا لیا اور انکی پیشانی کو بوسہ دیا۔[4]

سلام میں پیشدستی فرماتے، راستہ میں جب چلتے تو مرد، عورتیں، بچے جو سامنے آتے ان کو سلام کرتے،[5] ایک دفعہ آپ راستہ سے گذر رہے تھے، ایک مقام پر مسلمان اور منافق و کافر یکجا بیٹھے ملے، آپ نے سب کو سلام کیا،[6]

کسی کی کوئی بات بری معلوم ہوتی تو مجلس میں نام لیکر اس کا ذکر نہیں کرتے تھے، بلکہ صیغۂ تعمیم کے ساتھ فرماتے تھے کہ لوگ ایسا کرتے ہیں، لوگ ایسا کہتے ہیں بعض لوگوں کی یہ عادت ہے یہ طریقۂ ابہام اس لیے اختیار فرماتے تھے کہ شخص مخصوص کی ذلت نہ ہو، اور اسکے احساس غیرت

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب [2] ابوداؤد کتاب الادب بر الوالدین [3] ابوداؤد کتاب الادب باب المعانقہ [4] حوالہ سابق

[5] بخاری وابوداؤد باب السلام [6] بخاری باب السلام علی جماعۃ فیہا الکافر

Marfat.com

میں کمی نہ آجائے،

حسن معاملہ | اگرچہ غایتِ فیاضی کی وجہ سے اکثر مقروض رہتے تھے، یہانتک کہ وفات کے وقت بھی آپ کی زرہ من بھر غلہ پر ایک یہودی کے ہاں گرو تھی لیکن ہرحال میں حسن معاملت کا سخت اہتمام تھا، مدینہ میں دولتمند عموماً یہودی تھے، اور اکثر ان ہی سے آپ قرض لیا کرتے یہودی عموماً دنی الطبع اور سخت گیر ہوتے ہیں، آپ ان کی ہر قسم کی بدمزاجیاں برداشت فرماتے تھے،

(نبوت سے پہلے جن لوگوں سے آپکے تاجرانہ تعلقات تھے، انھوں نے ہمیشہ آپ کی دیانت اور حسن معاملہ کا اعتراف کیا ہے، اسی لیے قریش نے متفقاً آپ کو **امین** کا خطاب دیا تھا، نبوت کے بعد بھی گو قریش بغض و کینہ کے جوش سے لبریز تھے، تاہم ان کی دولت کے لیے مامون مقام آپ ہی کا کاشانہ تھا، عرب میں سائبؓ نام ایک تاجر تھے، وہ مسلمان ہو کر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے لوگوں نے مدحیہ الفاظ میں آپ سے ان کا تعارف کرایا، آپنے فرمایا "میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں"، سائبؓ نے کہا "میرے ماں باپ فدا، آپ میرے ساجھی تھے، لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا)[1]

ایک دفعہ ایک شخص سے کچھ کھجوریں قرض کے طور پر لیں، چند روز کے بعد وہ تقاضے کو آیا، آپ نے ایک انصاری کو حکم دیا کہ اس کا قرضہ ادا کر دیں، انصاری نے کھجوریں دیں لیکن ویسی عمدہ نہ تھیں جیسی اس نے دی تھیں، اس شخص نے لینے سے انکار کیا، انصاری نے کہا تم رسول اللہؐ کی عطا کردہ کھجور کے لینے سے انکار کرتے ہو، بولا ہاں، رسول اللہؐ عدل نہ کریں گے تو اور کس سے توقع رکھی جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملے سنے تو آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور فرمایا کہ یہ بالکل سچ ہے،[2]

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ۲۱۰ [2] ترغیب و ترہیب بحوالہ مسند احمد صفحہ ۲۳ مطبوعہ مصر جلد ۲

Marfat.com

ایک دن ایک بدو آیا جس کا کچھ قرضہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، بدو عموماً وحشی مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی صحابہ نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا، اور کہا کہ تجھکو خبر ہے تو کس سے ہمکلام ہے، بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہیے، کیونکہ اس کا حق ہے، (قرض خواہ کو بولنے کا حق ہے، اس کے بعد صحابہ کو اس کا قرض ادا کردینے کا حکم صادر فرمایا اور زیادہ دلوایا) [1]

ایک غزوہ میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ ہمرکاب تھے، ان کی سواری میں جو اونٹ تھا سست رو تھا، اور تھک جانے کی وجہ سے اور بھی سست ہوگیا تھا، آپ نے اونٹ ان سے خرید لیا، اور دام کے ساتھ اونٹ بھی ان کو دیدیا، کہ دونوں تمہارے ہیں [2]

یہی واقعہ ایک روایت میں اس طرح پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تمہارے پاس کوئی لکڑی ہو تو دو، انھوں نے دی، آپ نے اس سے اونٹ کو مارا، تو وہ اسقدر تیز دوڑنے لگا کہ سب سے آگے نکل گیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے چار دینار پر اونٹ اس شرط پر خرید لیا کہ مدینہ تک انکا سواری کا حق ہے، مدینہ پہنچکر جابر بن عبداللہ نے قیمت طلب کی، آپ نے بلالؓ سے فرمایا کہ ان کو قیمت چار دینار اور اس سے کچھ اور زیادہ بھی دو، چنانچہ حضرت بلالؓ نے چار دینار پر ایک قیراط سونا اور زیادہ دیا) [3]

معمول تھا کہ کوئی جنازہ لایا جاتا تو پہلے فرماتے کہ میت پر کچھ قرض تو نہیں ہے، اگر معلوم ہوتا کہ مقروض تھا، تو صحابہ سے فرماتے کہ جنازہ کی نماز پڑھا دو، خود شریک نہ ہوتے۔[4]

ایک دفعہ کسی سے اونٹ قرض لیا جب واپس کیا تو اس سے بہتر اونٹ واپس کیا اور فرمایا

[1] ابن ماجہ باب لصاحب الحق سلطان [2] بخاری ص ۲۸۲ باب شری الدواب [3] صحیح بخاری کتاب الوکالۃ [4] صحیح بخاری ص ۸۰۹ کتاب النفقات

Marfat.com

سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرض کو خوش معاملگی سے ادا کرتے ہیں[1]،

ایک دفعہ کسی شخص سے ایک پیالہ مستعار لیا، سو، اتفاق سے وہ گم گیا، تو اسکا تاوان ادا فرمایا[2]،

عموماً فرمایا کرتے تھے کہ میں تین دن سے زیادہ اپنے پاس ایک دینار بھی رکھنا پسند نہیں کرتا، بجز اس دینار کے جن کو قرض ادا کرنے کے انتظار میں اپنے پاس رکھ چھوڑتا ہوں[3]،

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں، آپنے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکا لیا، گھر میں آکر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے، باہر تشریف لاکر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں، اس نے واویلا مچائی کہ ہائے بد دیانتی! لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ بد دیانتی کریں گے؟ آپنے فرمایا نہیں چھوڑ دو، اس کو کہنے کا حق ہے، پھر قصاب کی طرف خطاب کرکے وہی فقرہ ادا کیا اس نے پھر وہی لفظ کہے، لوگوں نے پھر روکا، آپنے فرمایا اس کو کہنے دو، اس کو کہنے کا حق ہے، اور اس جملہ کو کئی بار دہراتے رہے، اس کے بعد آپنے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھجوا دیا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے جب وہ چھوہارے لیکر پلٹا تو آپ صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپکے حلم وعفو اور حسن معاملت سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا محمد! تم کو خدا جزائے خیر دے، تم نے قیمت پوری دی اور اچھی دی[4]،

ایک دفعہ مدینہ منورہ کے باہر ایک مختصر سا قافلہ آکر فروکش ہوا، ایک سرخ رنگ کا اونٹ اس کے ساتھ تھا، اتفاقاً ادھر سے آپ کا گذر ہوا، آپنے اونٹ کی قیمت پوچھی، لوگوں نے قیمت بتائی،

---

[1] ترمذی باب استقراض البعیر صفحہ ۲۲۵ [2] ترمذی ابواب الکلام صفحہ ۲۳۱ [3] بخاری جلد ا صفحہ ۳۲۱ کتاب الاستقراض
[4] مسند ابن حنبل جلد ۶ ص ۲۶۸

بے مول تول کیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی قیمت منظور کرلی، اور اونٹ کی مہار پکڑ کر شہر کی طرف روانہ ہوگئے، بعد کو لوگوں کو خیال آیا کہ بے جان پہچان ہم نے جانور کیوں حوالہ کردیا، اور اس حماقت پر اب پورے قافلہ کو ندامت تھی۔ قافلہ کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی، اس نے کہا "مطمئن رہو، ہم نے کسی شخص کا چہرہ ایسا روشن نہیں دیکھا" یعنی ایسا شخص دغا نہ کرے گا، رات ہوئی تو آپ نے ان کے لیے کھانا اور قیمت بھر کھجوریں بھجوادیں[1]،

غزوۂ حنین میں آپ کو کچھ اسلحہ کی ضرورت تھی، صفوان اس وقت تک کافر تھے، ان کے پاس بہت سی زرہیں تھیں، آپ نے ان سے کچھ زرہیں طلب کیں، انھوں نے کہا محمد! کیا کچھ غصب کا ارادہ ہے؟ فرمایا نہیں، میں عاریۃً مانگتا ہوں، اگر ان میں سے کوئی تلف ہوئی تو میں تاوان دوں گا" چنانچہ انھوں نے چالیس زرہیں مسلمانوں کو عاریۃً دیں، حنین سے واپسی کے بعد جب اسلحہ اور دیگر سامانوں کا جائزہ لیا گیا، تو کچھ زرہیں کم نکلیں، آپ نے صفوان سے کہا، تمھاری چند زرہیں کم ہیں، ان کا معاوضہ لے لو، صفوان نے عرض کی "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے دل کی حالت اب پہلی جیسی نہیں[2]" (یعنی مسلمان ہوگیا، اب معاوضہ کی حاجت نہیں)

عدل وانصاف کوئی شخص گوشہ نشین ہوکر بیٹھ جائے، تو اس کے لیے عدل وانصاف سے کام لینا نہایت آسان ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کے سیکڑوں قبائل سے کام پڑتا تھا، یہ آپس میں ایک ایک کے دشمن تھے، ایک کے موافق فیصلہ کیا جاتا تو دوسرا دشمن بنجاتا، اسلام کی اشاعت کی غرض سے ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تالیف قلوب سے کام لینا پڑتا، ان سب مشکلات اور پیچیدگیوں پر بھی عدل و

---

[1] دارقطنی جلد ثانی صفحہ ۳۰۰ کتاب البیوع [2] ابوداؤد باب تضمین العاریۃ

کا پلہ کبھی کسی طرف جھکنے نہ پاتا،

فتح مکہ کے بعد تمام عرب میں صرف طائف رہ گیا تھا جس نے گردن تسلیم خم نہیں کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا محاصرہ کیا، لیکن پندرہ بیس روز کے بعد محاصرہ اٹھا لینا پڑا، صخر ایک رئیس تھے، ان کو یہ حال معلوم ہوا، تو خود جاکر طائف کی حصار بندی کی اور اہل شہر کو اسقدر دبایا کہ بالآخر وہ مصالحت پر راضی ہو گئے، صخر نے بارگاہ نبوت میں اطلاع کی، مغیرہ بن شعبہ ثقفی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے کہ صخر نے میری پھوپھی کو قبضہ میں کر رکھا ہے، آپ نے صخر کو بلا بھیجا اور حکم دیا کہ مغیرہ کی پھوپھی کو ان کے گھر پہنچادو، اس کے بعد بنو سلیم آئے کہ جس زمانہ میں ہم کافر تھے صخر نے ہمارے چشمہ پر قبضہ کر لیا تھا، اب ہم اسلام لائے، ہمارا چشمہ ہم کو واپس دلا دیا جائے، آپ نے صخر کو بلا بھیجا، اور فرمایا کہ جب کوئی قوم اسلام قبول کرتی ہے تو اپنے جان و مال کی مالک ہو جاتی ہے، اس لیے ان کو انکا چشمہ دیدو، صخر کو منظور کرنا پڑا، راوی کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے صخر نے دونوں حکم منظور کیے تو میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر شرم سے سرخی آگئی[1] کہ صخر کو دونوں معاملوں میں شکست ہوئی، اور فتح طائف کا ان کو کوئی صلہ نہ ملا،

ایک دفعہ ایک عورت نے جو خاندان مخزوم سے تھی، چوری کی، قریش کی عزت کا خیال تھا، لوگ چاہتے تھے کہ سزا سے بچ جائے اور معاملہ دب جائے حضرت اسامہ بن زیدؓ رسول اللہ کے محبوب خاص تھے، لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ سفارش کیجئے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی کی درخواست کی، آپ نے غضب آلود ہو کر فرمایا[2] کہ بنی اسرائیل اسی کی بدولت تباہ ہوئے کہ وہ غربا پر حد جاری کرتے اور امراء سے درگذر کرتے تھے،

---

[1] ابوداؤد صفحہ ۸۰ جلد ۲ [2] صحیح بخاری کتاب الحدود،

Marfat.com

خیبر کے یہودیوں سے جب صلح ہوکر وہاں کی زمین مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تو عبداللہ بن سہل ایک دفعہ کھجوروں کی بٹائی کے لیے گئے، محیصہ ان کے چچیرے بھائی بھی ساتھ تھے، عبداللہ گلی میں جا رہے تھے کہ کسی نے ان کو قتل کر کے لاش ایک گڈھے میں ڈال دی، محیصہ نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر استغاثہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے ان کو قتل کیا" بولے ہم نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا" آپ نے فرمایا تو یہود سے حلف لیا جائے، بولے "حضرت! یہودیوں کی قسم کا اعتبار کیا، یہ سو دفعہ جھوٹی قسم کھالیں گے۔"

خیبر میں یہود کے سوا اور کوئی قوم آباد نہ تھی، یہ یقینی تھا کہ یہودیوں ہی نے عبداللہ بن سہل کو قتل کیا ہے، تاہم چونکہ کوئی عینی شہادت موجود نہ تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے تعرض نہیں فرمایا اور خونبہا کے سو اونٹ بیت المال سے دلوائے[1]۔

طارق محاربی کا بیان ہے کہ جب اسلام عرب میں پھیلنا شروع ہوا تو ہم چند آدمی ربذہ سے نکلے اور مدینہ کو روانہ ہوئے، شہر کے قریب پہنچکر مقام کیا، زنانی سواری بھی ساتھ تھی، ہم سب بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صاحب سفید کپڑے پہنے ہوئے آئے، اور سلام علیک کہی، ہم نے سلام کا جواب دیا، ہمارے ساتھ سرخ رنگ کا اونٹ تھا، اس کی قیمت پوچھی ہم نے جواب دیا، اتنی کھجوریں، انھوں نے کچھ مول تول نہیں کیا اور وہی قیمت منظور کر لی، پھر اونٹ کی مہار پکڑ کر شہر کی طرف بڑھے، نظروں سے اوجھل ہو گئے، تو سب کو خیال آیا کہ دام رہ گئے، اور ہم لوگ ان کو پہچانتے نہیں، لوگوں نے ایک دوسرے کو ملزم ٹھہرانا شروع کیا، محمل نشین خاتون نے کہا مطمئن رہو، ہم نے کسی شخص کا چہرہ اس قدر

---

[1] یہ واقعہ بخاری ونسائی وغیرہ میں (باب القسامۃ) میں باختلاف روایات مذکور ہے۔

چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن نہیں دیکھا (یعنی ایسا شخص دغا نہ کریگا) رات ہوئی تو ایک شخص آیا کہ رسول اللہ نے تمھارے لیے کھانا اور کھجوریں بھیجی ہیں، دوسرے دن صبح کو ہم لوگ مدینہ میں آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں خطبہ دے رہے تھے، ہم لوگوں کو دیکھکر ایک انصاری نے اٹھ کر کہا "یا رسول اللہ! یہ لوگ بنو ثعلبہ کے قبیلہ کے ہیں، اور ان کے مورث نے ہمارے خاندان کے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، اسکے بدلہ میں ان کا ایک آدمی قتل کرا دیجئے، آپنے فرمایا "باپ کا بدلہ بیٹے سے نہیں لیا جا سکتا"۔[1]

سرقؓ ایک صحابی تھے، انھوں نے ایک بدوی سے ایک اونٹ مول لیا، لیکن قیمت نہ ادا ہو سکی، بدوان کو پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا اور واقعہ بیان کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قیمت ادا کر دو، انھوں نے ناداری کا عذر کیا، آپنے بدوی سے کہا کہ بازار لیجا کر انکو فروخت کر لو، بدوان کو بازار میں لے گیا، ایک صاحب نے دام دے کر بدو سے خریدا اور آزاد کر دیا۔[2]

(ابو حدرد اسلمیؓ ایک صحابی تھے جن پر ایک یہودی کا قرض آتا تھا، اور انکے پاس بدن پر جو کپڑے تھے، ان کے سوا کچھ نہ تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی مہم کا ارادہ کر رہے تھے، ابو حدردؓ نے یہودی سے کچھ مہلت طلب کی لیکن وہ نہ مانا اور انکو پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا، آپنے فرمایا کہ ان کا قرض ادا کر دو، انھوں نے عذر کیا، آپنے پھر فرمایا، انھوں نے پھر یہی جواب دیا، اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! غزوۂ خیبر قریب ہے، شاید وہاں سے واپسی پر کچھ ہاتھ آئے تو میں اس کو ادا کر دوں، آپنے پھر یہی حکم دیا کہ فوراً ادا کر دو، آخر اپنا تہبند اس یہودی کو قرض میں نذر کیا، اور سر سے جو عمامہ بندھا تھا، اس کو کھول کر کمر سے لپیٹ لیا۔[3]

---

[1] دار قطنی جلد ۲ ص ۱۱، ۲۰ و ۲۳ [2] ایضاً ص ۳۱۴ [3] مسند احمد جلد ۳ ص ۴۲۳، معجم صغیر طبرانی معجم عبدان

اس عدل وانصاف کا یہ اثر تھا کہ مسلمان ایک طرف، یہود بھی جو آپ کے شدید ترین دشمن تھے، اپنے مقدمات اسی بارگاہِ عدالت میں[1] لاتے تھے، اور ان کی شریعت کے مطابق اس کا فیصلہ ہوتا تھا، چنانچہ قرآن مجید میں اس واقعہ کا مصرح ذکر ہے، اسلام سے پہلے یہودیان بنو نضیر و قریظہ میں عزت و شرافت کی عجیب غریب حد قائم تھی، کوئی قریظی اگر کسی نضیری کو قتل کرتا تو قصاص میں وہ مارا جاتا، لیکن اگر کوئی قریظی کسی نضیری کے ہاتھ سے مارا جاتا تو اس کے خون کی قیمت سو بار شتر چھوہارا تھی، اسلام میں جب یہ واقعہ پیش آیا، تو قریظہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مقدمہ پیش کیا، آپ نے فوراً توراۃ کے آئین کے مطابق النفس بالنفس کے حکم سے دونوں قبیلوں میں برابر کا قصاص جاری[2] کردیا،

عدل و انصاف کا سب سے نازک پہلو یہ ہے کہ خود اپنے مقابلہ میں بھی حق کا رشتہ چھوٹنے نہ پائے، ایک بار آپ مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے، لوگوں کا گرد و پیش ہجوم تھا، ایک شخص آکر منہ کے بل آپ[3] پر لد گیا، دستِ مبارک میں پتلی سی لکڑی تھی، آپ نے اس سے اس کو ٹھوکا دیا، اتفاق سے لکڑی کا سرا اسکے منہ میں لگ گیا اور خراش آگئی، فرمایا مجھ سے انتقام لے لو، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے معاف کردیا،

مرض الموت میں آپ نے مجمع عام میں اعلان کیا کہ اگر میرے ذمہ کسی کا قرض آتا ہو، اگر میں نے کسی کی جان و مال یا آبرو کو صدمہ پہنچایا ہو، تو میری جان و مال و آبرو حاضر ہے، اسی دنیا میں وہ اپنا انتقام لے لے، مجمع میں سناٹا تھا، صرف ایک شخص نے چند درہم کا دعویٰ کیا جو دلوا دیے گئے[4]،

جود و سخا جود و سخا آپ کی فطرت تھی (ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آپ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور خصوصاً رمضان کے مہینہ میں آپ بہ زیادہ سخاوت فرماتے تھے[5]، تمام عمر کسی کے سوال پر "نہیں" کا لفظ نہیں فرمایا[6]

[1] ابوداؤد باب تضمین العاریۃ جلد ثانی [2] ابوداؤد کتاب الدیات [3] ابوداؤد باب القود بغیر حدید [4] ابن اسحٰق بروایت ابن ہشام [5] صحیح بخاری باب بدء الوحی [6] صحیح بخاری کتاب الادب باب حسن الخلق۔

Marfat.com

انما انا قاسم وخازن واللہ یعطی[1] (بخاری)   میں تو صرف دینے بانٹنے والا اور خازن ہوں اور دیتا اللہ ہے،

ایک دفعہ ایک شخص خدمتِ اقدس میں آیا اور دیکھا کہ دور تک آپ کی بکریوں کا ریوڑ پھیلا ہوا ہے۔ اس نے آپ سے درخواست کی اور آپ نے سب کی سب دیدیں۔ اس نے اپنے قبیلہ[2] میں جاکر کہا کہ اسلام قبول کرلو محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے فیاض ہیں کہ مفلس ہوجانے کی پروا نہیں کرتے"

ایک دفعہ ایک شخص نے کچھ مانگا، آپ نے فرمایا، اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے، تم میرے ساتھ آؤ، حضرت عمرؓ بھی ساتھ تھے، عرض کی کہ آپ کے پاس کچھ موجود نہیں تو آپ پر کیا ذمہ داری ہے، ایک اور صاحب حاضر تھے، انھوں نے کہا یا رسول اللہ! آپ دیے جایئے اور عرش والے خدا سے نہ ڈریے، وہ آپ کو محتاج نہ کرے گا، آپ فرطِ بشاشت[3] سے مسکرا دیئے،

(عام فیاضی کا یہ حال تھا کہ جو شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، اگر آپ کے پاس کچھ سرمایہ موجود رہتا تو اس کو کچھ نہ کچھ ضرور عطا فرماتے، ورنہ وعدہ فرماتے، اس معمول کی بنا پر لوگ مقدر دلیر ہوگئے تھے کہ ایک دفعہ عین اقامتِ نماز کے وقت ایک بدو آیا، اور آپ کا دامن پکڑ کر کہا کہ میری ایک معمولی سی حاجت باقی رہ گئی ہے، خوف ہے کہ میں اس کو بھول نہ جاؤں، اسکو پورا کر دیجئے، چنانچہ آپ اس کے ساتھ تشریف لے گئے اور اسکی حاجت پوری کرکے آئے تو نماز پڑھی[4]۔

بعض اوقات ایسا ہوتا کہ ایک شخص سے ایک چیز خریدتے قیمت چکا دینے کے بعد پھر وہ چیز اس کو بطور عطیہ کے عنایت فرماتے، چنانچہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ سے ایک اونٹ خریدا اور پھر اسی وقت اس کو عبداللہ بن عمرؓ کو دیدیا، حضرت جابرؓ کے ساتھ بھی اسی قسم کا ایک واقعہ مذکور ہے[5]۔

---

۱ صحیح بخاری باب فرض الخمس ۲ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۹۰ ۳ ادب المفرد امام بخاری ۴ صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۸۴ ۵ ایضاً ص ۲۸۲

کھانے پینے کی چیزوں میں معمولی سے معمولی چیز بھی تنہا نہ کھاتے، بلکہ تمام صحابہ کو شریک فرما لیتے، کسی غزوہ میں ۱۳۰ صحابہ ہمراہ تھے، آپ نے ایک بکری خرید کر ذبح کروائی، اور کلیجی کے بھوننے کا حکم دیا، وہ تیار ہوئی تو تمام صحابہ کو تقسیم فرمایا، جو لوگ موجود نہ تھے، ان کا حصہ الگ محفوظ رکھا،[1]

جو چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی، جبتک صرف نہ ہو جاتی، آپ کو چین نہ آتا بیقراری سی رہتی، ام المومنین ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو چہرہ متغیر تھا، ام سلمہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ خیر ہے؟ فرمایا کل جو سات دینار آئے تھے شام ہو گئی اور وہ بستر پر پڑے رہ گئے،[2]

حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ ایک شب کو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک راستہ سے گذر رہے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ابوذر! اگر احد کا پہاڑ میرے لیے سونا ہو جائے، تو میں کبھی یہ پسند نہ کرونگا کہ تین راتیں گذر جائیں، اور میرے پاس ایک دینار بھی رہ جائے، لیکن ہاں وہ دینار جس کو میں ادائے قرض کے لیے چھوڑ دوں۔[3]

اکثر یہاں تک معمول تھا کہ گھر میں نقد کی قسم سے کوئی چیز موجود ہوتی تو جب تک کل خیرات نہ کر دیتے گھر میں آرام نہ فرماتے، رئیس فدک نے ایک دفعہ چار اونٹ پر غلہ بار کر کے خدمت نبویؐ میں بھیجا، حضرت بلالؓ نے بازار میں غلہ فروخت کر کے ایک یہودی کا قرض تھا وہ ادا کیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر اطلاع کی، آپ نے پوچھا کچھ بچ تو نہیں رہا، بولے ہاں کچھ بچ بھی رہا، فرمایا کہ جب تک کچھ باقی رہے گا، گھر میں نہیں جا سکتا، حضرت بلالؓ نے کہا میں کیا کروں، کوئی سائل نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں رات بسر کی، دوسرے دن حضرت بلالؓ نے آکر کہا یا رسول اللہ خدا نے آپکو

[1] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۹۹ [2] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۹۳ [3] صحیح بخاری کتاب الاستقراض صفحہ ۳۲۱

Marfat.com

سبکدوش کر دیا یعنی جو کچھ تھا وہ بھی تقسیم کر دیا گیا، آپ نے خدا کا شکر ادا کیا اور گھر تشریف لے گئے۔[1]

اسی طرح ایک بار عصر کی نماز پڑھ کر خلاف معمول فوراً گھر کے اندر تشریف لیگئے اور پھر فوراً نکل آئے لوگوں کو تعجب ہوا، آپنے فرمایا، مجھکو نماز میں خیال آیا کہ کچھ سونا گھر میں پڑا رہ گیا ہے، گمان ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے اور وہ گھر میں پڑا رہ جائے، اسلیے جاکر اسکو خیرات کر دینے کو کہہ آیا۔[2]

غزوۂ حنین میں جو کچھ ملا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو خیرات فرما کر واپس آرہے تھے، راہ میں بدوؤں کو خبر ملی کہ ادھر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہونے والا ہے، آس پاس سے دوڑ دوڑ کر آئے اور لپٹ گئے کہ ہمیں بھی کچھ عنایت ہو، آپ ازدحام سے گھبرا کر ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے، انھوں نے ردائے مبارک تھام لی، بالآخر اس کشاکش میں جسم اطہر سے چادر اتر کر ان کے ہاتھ میں رہ گئی، نبیاعن عالم نے کہا "میری چادر دیدو، خدا کی قسم، اگر ان جنگلی درختوں کے برابر بھی اونٹ میرے پاس ہوتے تو میں سب تم کو دیدیتا، اور پھر مجھکو بخیل نہ پاتے، نہ دروغگو نہ نامرد۔"[3]

لوگوں کو عام حکم تھا کہ جو مسلمان مرجائے اور اپنے ذمہ قرض چھوڑ جائے تو مجھے اطلاع دو، میں اس کو ادا کر دوں گا، اور جو ترکہ چھوڑ جائے وہ وارثوں کا حق ہے مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔

ایک دفعہ آپ صحابہ کے مجمع میں تشریف فرما تھے، ایک بدو آیا اور آپ کی چادر کا گوشہ زور سے کھینچکر بولا "محمد! یہ مال نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے، ایک بار شتر دے" آپ نے اس کے اونٹ کو جو اور کھجوروں سے لدوا دیا۔[4]

ایک دفعہ بحرین سے خراج آیا اور اسقدر کثیر رقم تھی کہ اس سے پہلے کبھی دار الاسلام میں

---

[1] ابوداؤد باب قبول ہدایا المشرکین [2] صحیح بخاری یذکر الرجل الشئ فی الصلاۃ [3] صحیح بخاری باب الشجاعۃ فی الحرب
[4] صحیح بخاری شعبہ ابوداؤد کتاب الادب

نہیں آئی تھی، آپ نے حکم دیا کہ اس کو صحن مسجد میں ڈالدو، اسکے بعد جب آپ مسجد میں تشریف لائے تو اس پر مڑکر بھی نظر نہ ڈالی، نماز سے فارغ ہوکر آپ نے اس کی تقسیم شروع کی، جو سامنے آتا اس کو دیتے چلے جاتے حضرت عباسؓ کو جو غزوہ بدر کے بعد دولتمند نہیں رہے تھے، اتنا دیا کہ اٹھاکر چل نہیں سکتے تھے، اسی طرح اور لوگوں کو بھی عنایت فرماتے جاتے تھے جب کچھ نہ رہا تو کپڑے جھاڑکر اٹھ کھڑے ہوئے۔[1]

اسلام میں قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی آزادشدہ غلام مرجائے تو اس کا ترکہ اس کے آقا کو ملتا ہے، ایک دفعہ آپ کا اسی قسم کا ایک غلام مرگیا، لوگ اسکا متروکہ سامان اٹھاکر آپکے پاس لائے، آپنے دریافت فرمایا کہ کوئی اس کا یہاں ہموطن ہی، لوگوں نے کہا ہاں ہی، آپنے فرمایا یہ تمام چیزیں اسی کے حوالہ کردو۔[2]

ایک دفعہ چند انصار نے آپسے کچھ مانگا، آپنے دیدیا، پھر مانگا، پھر دیا، پھر جبتک رہا آپ دیتے رہے۔ یہانتک کہ آپکے پاس کچھ نہیں رہا، لیکن وہ باوجود اس کے حاضر ہوئے اور درخواست کی، فرمایا میرے پاس جو کچھ ہو، میں اس کو تم سے بچاکر نہیں رکھوں گا۔[3]

ایثار آپ کے اخلاق وعادات میں جو وصف سب سے زیادہ نمایاں اور جس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا تھا، وہ ایثار تھا، اولاد سے آپ کو بے انتہا محبت تھی، اور ان میں حضرت فاطمہؓ زہرا اسقدر عزیز تھیں کہ جب آتیں تو فرطِ محبت کھڑے ہوجاتے، پیشانی کو بوسہ دیتے، اور اپنی جگہ بٹھاتے، تاہم حضرت فاطمہؓ کی عسرت اور تنگدستی کا یہ حال تھا کہ گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی، خود چکی پیستیں، خود ہی پانی کی مشک لاتیں، چکی پیتے پیتے ہتھیلیاں گھس گئی تھیں، اور مشک کے اثر سے سینہ پر نیل پڑگئے تھے، ایک دن خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، خود تو پاس حیا سے عرض حال نہ کرسکیں، جناب امیرؓ نے انکی طرف سے یہ حال عرض کیا،

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ باب القسمۃ [2] مسند ابن حنبل، جلد ۲ ص ۵۰۱ [3] صحیح بخاری ص ۱۹۸ کتاب الصدقات

Marfat.com

اور درخواست کی کہ فلاں غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں ان میں سے ایک کنیز مل جائے آپ نے ارشاد فرمایا ابھی اصحاب صفہ کا انتظام نہیں ہوا، اور جب تک ان کا بندوبست نہ ہولے میں اور طرف توجہ نہیں کر سکتا،[1]

ایک روایت میں ہے کہ حضرت زبیرؓ کی صاحبزادیاں اور حضرت فاطمہ زہراؓ خدمت اقدس میں گئیں، اور اپنے افلاس و تنگدستی کی شکایت کرکے عرض کی کہ اب کی غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں ان میں سے ایک دو ہم کو مل جائیں، آپ نے فرمایا بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے۔[2]

ایک دفعہ حضرت علیؓ نے کسی امر کی درخواست کی، فرمایا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تم کو دوں اور اہل صفہ کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ وہ بھوک سے اپنے پیٹ لپیٹے پھریں،[3]

ایک دفعہ ایک عورت نے ایک چادر لاکر پیش کی، آپ کو ضرورت تھی، آپ نے لے لی، ایک صاحب حاضر خدمت تھے، انھوں نے کہا کیا اچھی چادر ہے، آپ نے اتار کر ان کو دیدی، جب اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں نے ان کو ملامت کی کہ تم جانتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چادر کی ضرورت تھی، یہ بھی جانتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کا سوال رد نہیں کرتے، انھوں نے کہا ہاں لیکن میں نے تو برکت کے لیے لی ہے کہ مجھکو اسی چادر کا کفن دیا جائے،[4]

زہد و قناعت کے عنوان سے جو واقعات لکھے گئے ہیں، ان سے ظاہر ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس عسرت اور تنگدستی میں بسر فرماتے تھے، سنہ ۷ھ کے بعد فتوحات کو وسعت

---

[1] یہ روایت کتب احادیث (سنن ابوداؤد وغیرہ) میں مختلف طریقوں سے مروی ہے، ایک روایت میں ہے کہ آپ نے حضرت فاطمہؓ کو ایک دعا بتادی کہ یہ لونڈی سے بڑھ کر ہے، [2] ابوداؤد جلد ۲ ص ۱۴۳، [3] مسند احمد جلد ۱ ص ۹۷، [4] صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخاء وباب من استعد الکفن

حاصل ہوئی ہے۔ عرب میں باغات سب سے بہتر جائداد تھے، ۳ھ میں یہودان بنو نضیر میں سے مخیریق نامی ایک شخص نے اپنے سات باغ مثیب، صائفہ، دلال، حسنی، برقہ، اعواف، مشربہ ام ابراہیم مرتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وصیت کر دیے۔ آپ نے سب کو خیرات کر دیا یعنی وہ خدا کی راہ میں وقف تھے، جو کچھ پیدا ہوتا تھا غربا اور مساکین کو دیدیا جاتا تھا۔[۲]

ایک صحابی نے شادی کی، سامانِ ولیمہ کے لیے گھر میں کچھ نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ عائشہ کے پاس جاؤ اور آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ، وہ گئے اور جاکر لے آئے حالانکہ کاشانۂ نبوت میں اس ذخیرے کے سوا شام کے کھانے کو کچھ نہ تھا۔[۳]

ایک دفعہ ایک غفاری آکر مہمان ہوا، رات کو کھانے کے لیے صرف بکری کا دودھ تھا، وہ آپ نے اسکے نذر کر دیا، یہ تمام رات خانۂ نبوی میں فاقہ سے گذری، حالانکہ اس سے پہلی شب میں بھی یہاں فاقہ ہی تھا۔[۴]

مہمان نوازی | ۹ھ میں مختلف اطراف اور قبیلوں سے جوق جوق لوگ بارگاہِ نبوی میں آتے تھے۔ رملہ ایک صحابیہ تھیں، ان کا گھر دار الضیوف تھا، یہیں لوگ مہمان اترتے تھے۔[۵] ام شریک جو ایک دولتمند اور فیاض انصاریہ تھیں، انکا گھر بھی گویا ایک مہمان خانہ تھا۔[۶] مخصوص لوگ مسجد نبوی میں آکر اترتے تھے، چنانچہ وفد ثقیف یہیں اترا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بہ نفس نفیس ان مہمانوں کی خاطرداری اور تواضع فرماتے تھے، یہود تک جو لوگ حاضر ہوتے تھے بغیر کچھ کھائے پئے واپس نہ آتے تھے، فیاضی میں کافر و مسلم اور دوست کا امتیاز نہ تھا، مشرک و کافر سب آپ کے مہمان ہوتے اور آپ

۱؎ فتح الباری شرح کتاب الفرائض ۲؎ اصابہ تذکرہ مخیریق ۳؎ مسند احمد جلد ۴ ص ۵۸ ۴؎ مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۳۹۷ ۵؎ زرقانی ذکر وفود ۶؎ مسلم جلد ۲ صفحہ ۴۹۵ ۷؎ شمائل ترمذی

یکساں ان کی مہمان نوازی کرتے، جب اہل حبشہ کا وفد آیا تو آپ نے خود اپنے ہاں ان کو مہمان اتارا اور خود بنفس نفیس ان کی خدمت کی[1]، ایک دفعہ کافر مہمان ہوا، آپ نے ایک بکری کا دودھ اسے پلایا، وہ سارے کا سارا پی گیا، آپ نے دوسری بکری منگوائی، وہ بھی کافی نہ ہوئی غرض سات بکریوں تک نوبت آئی، جب تک وہ سیر نہ ہوا، آپ پلاتے گئے[2]،

کبھی ایسا ہوتا کہ مہمان آجاتے اور گھر میں جو کچھ موجود رہتا وہ ان کی نذر ہو جاتا اور تمام اہل و عیال فاقہ کرتے[3]، آپ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنے مہمانوں کی خبر گیری کرتے تھے،

صحابہ میں سب سے مفلس اور نادار گروہ اصحاب صفہ کا تھا، وہ مسلمانوں کے مہمان عام تھے، لیکن ان کو زیادہ تر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہونے کا شرف حاصل ہوتا، ایک بار آپ نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس دو آدمی کا کھانا ہو وہ ان میں سے تین آدمی کو، اور جس کے پاس چار آدمی کا کھانا ہو وہ ان میں سے پانچ آدمی کو ساتھ لیجائے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ تین آدمی کو ساتھ لائے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دس آدمیوں کو ہمراہ لے گئے[4]،

اصحاب صفہ میں حضرت ابوہریرہؓ اپنے فقر و فاقہ کی داستان نہایت درد انگیز طریقہ سے بیان کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک روز شدت گرسنگی کی حالت میں گذرگاہ عام پر بیٹھ گیا، حضرت ابوبکرؓ راستے سے گذرے تو میں نے بطور حسن طلب کے ان سے قرآن مجید کی ایک آیت پوچھی، لیکن وہ گذر گئے، اور میری حالت کی طرف توجہ نہ کی، حضرت عمرؓ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا، اور وہی نتیجہ ہوا، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہوا، تو آپ مجھکو دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا کہ میرے ساتھ ساتھ آؤ،

---

[1] شفائے قاضی عیاض بسند متصل۔ [2] صحیح مسلم باب المؤمن یاکل فی معی واحد، مسند ابن حنبل جلد ۲ ص ۳۹۰۔ [3] ابوداؤد کتاب الادب۔
[4] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۰۰)

Marfat.com

آپ گھر میں پہنچے تو دودھ کا ایک پیالہ نظر آیا آپ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کسی نے ہدیۃً بھیجا ہے، آپ نے مجھ سے کہا کہ اصحاب صفہ کو بلا لاؤ، میں ان کو بلا لایا تو آپ نے مجھکو دودھ کا پیالہ دیا کہ سب کو تقسیم کردو[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ایک پیالہ اسقدر بھاری تھا کہ اسکو چار آدمی اٹھا سکتے تھے جب دوپہر ہوتی تو وہ پیالہ آتا، اور اصحاب صفہ اس کے گرد بیٹھ جاتے، یہانتک کہ جب زیادہ مجمع ہو جاتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اکڑوں بیٹھنا پڑتا کہ لوگوں کے لیے جگہ نکل آئے،[2]

مقداد کہتے ہیں کہ میں اور میرے دو رفیق اسقدر تنگدست تھے کہ بھوک سے بینائی جاتی رہی ہم لوگوں نے صحابہ سے اس کی درخواست کی لیکن کسی نے منظور نہیں کیا، آخر ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ دولت کدہ پر لے گئے، اور تین بکریوں کو دکھا کر فرمایا ان کا دودھ دوہ کر پیا کرو چنانچہ ہم میں ہر شخص دودھ دوہ کر اپنا اپنا حصہ پی لیا کرتا تھا۔[3]

ایک دن اصحاب صفہ کو لیکر حضرت عائشہؓ کے گھر پہنچے اور فرمایا کھانے کو جو کچھ ہو لاؤ، چنانچہ پکا ہوا کھانا سامنے لا کر رکھا گیا، پھر آپ نے کھانے کی کوئی اور چیز طلب کی تو چھوہارے کا حریرہ پیش ہوا اس کے بعد ایک پیالہ میں دودھ حاضر کیا گیا اور یہی سامان ضیافت کی آخری قسط تھی[4])

گداگری اور سوال سے نفرت | باوجود اس کے کہ آپ کا گھر ہر وقت پرستار رہتا تھا تاہم کوئی شخص شدید سوال کرتا آپ پر نہایت گراں گذرتا تھا، ارشاد فرماتے کہ اگر کوئی شخص لکڑی کا گٹھا پیٹھ پر لاد لائے اور بیچکر اپنی آبرو بچائے تو اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے سوال کرے[5]

(ایک دفعہ ایک انصاری آئے اور کچھ سوال کیا، آپ نے فرمایا تمہارے پاس کچھ نہیں ہے؟

---

[1] ترمذی ص ۳۹۹ [2] ابوداؤد کتاب الاطعمہ [3] صحیح مسلم جلد دوم ص ۲۰۰ [4] ابوداؤد کتاب الادب [5] صحیح بخاری کتاب الصدقات صفحہ ۱۹۸

Marfat.com

بولے کہ میں ایک بچھونا ہے جس کا کچھ حصہ اوڑھ لیتا اور کچھ بچھا لیتا ہوں اور ایک پانی پینے کا پیالہ ہے آپ نے دونوں چیزیں منگوائیں، پھر فرمایا یہ چیزیں کون خریدتا ہے؟ ایک شخص نے دو درہم لگائے آپ نے فرمایا اس سے بڑھ کر بھی کوئی دام لگاتا ہے؟ ایک صاحب نے ایک کے دو کر دیئے آپ نے دونوں چیزیں دیدیں اور درہم انصاری کو دیے کہ ایک درہم کا کھانا خرید کر گھر میں دے آؤ اور دوسرے سے کلہاڑی خرید لو اور جنگل سے لکڑیاں لا کر شہر میں بیچو، پندرہ دن کے بعد وہ خدمت اقدس میں آئے تو دس درہم ان کے پاس جمع ہو گئے تھے، اس سے کچھ کپڑا خریدا، کچھ کا غلہ مول لیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ اچھا ہے یا یہ کہ قیامت میں چہرہ پر گدائی کا داغ لگا کر جاتے"[۱]

ایک دفعہ چند انصاری آئے اور سوال کیا، آپ نے عنایت فرمایا، پھر مانگا پھر دیا، آپ نے کسی کی درخواست رد نہیں فرمائی جب کچھ نہیں رہا تو آپ نے فرمایا میرے پاس جو مال ہوگا تو رہے گا تم سے بچا کر اسکو نہیں رکھوں گا، لیکن جو شخص اللہ سے دعا مانگے کہ وہ اسکو سوال کرنے کی ذلت سے بچائے تو وہ اس کو بچا دیتا ہے اور جو خدا سے غنا کا طالب ہوتا ہے وہ اسکو غنا عطا فرماتا ہے اور جو صبر کرتا ہے اللہ اس کو صابر بنا دیتا ہے، اور صبر سے کوئی بہتر اور وسیع تر دولت کسی کو نہیں ملی[۲]

حکیم بن حزام فتح مکہ میں اسلام لائے تھے، ایک دفعہ انھوں نے آپ سے کچھ مانگا آپ نے عنایت فرمایا، کچھ دن کے بعد پھر مانگا، آپ نے پھر ان کو دیا، تیسری دفعہ پھر مانگا آپ نے پھر دیا اس کے بعد فرمایا "اے حکیم یہ دولت سبز و شیریں ہے، جو استغنا کیساتھ اس کو لیتا ہے اس کو برکت ملتی ہے اور جو حرص و طمع کیساتھ اسکو حاصل کرتا ہے وہ اس کی برکت سے محروم رہتا ہے، [illegible]

---

۱ ابوداؤد و ترمذی صدقات ۲ صحیح بخاری صفحہ ۱۹۰ کتاب الصدقات

جیسی ہے جو کھاتا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا، دستِ بالا دستِ زیریں سے بہتر ہے"۔ حکیم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ جب تک زندہ رہے کبھی کسی سے کوئی معمولی چیز بھی نہیں مانگی۔[1]

حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صدقات کا مال تقسیم فرما رہے تھے کہ دو صاحب آکر شامل ہوئے، آپ نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ تنومند اور ہاتھ پاؤں کے درست معلوم ہوئے، آپ نے فرمایا "اگر تم چاہو تو میں اس میں سے دے سکتا ہوں لیکن غنی اور تندرست کام کرنے کے لائق لوگوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے"۔[2]

قبیصہ نام ایک صاحب تھے، وہ مقروض ہو گئے تھے، آپ کے پاس آئے تو اپنی حاجت عرض کی، آپ نے وعدہ کیا، اس کے بعد ارشاد فرمایا "اے قبیصہ! سوال کرنا اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا صرف تین شخصوں کو روا ہے، ایک اس شخص کو جو قرض سے بار یا وہ نیچا رہو، وہ مانگ سکتا ہے لیکن جب اس کی ضرورت پوری ہو جائے تو اس کو رک جانا چاہیے، دوسرے اس شخص کو جس پر کوئی ایسی ناگہانی مصیبت آگئی جس نے اسکے تمام مالی سرمایہ کو برباد کیا، اس کو اس وقت تک مانگنا جائز ہے جب تک اسکی حالت کسی قدر درست نہ ہو جائے، تیسرے اس شخص کو جو مبتلائے فاقہ ہو، اور محلہ کے تین معتبر آدمی گواہی دیں کہ ہاں اسکو فاقہ ہے، اس کے علاوہ جو کوئی کچھ مانگ کر حاصل کرتا ہے وہ حرام کھاتا ہے"۔[3]

| صدقہ سے پرہیز | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اور اپنے خاندان کیلیے صدقہ وزکوٰۃ لینے کو سخت موجب ننگ و عار سمجھتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ "میں گھر میں آتا ہوں تو کبھی کبھی اپنے بستر پر کھجور پاتا ہوں جی میں آتا ہے کہ اٹھا کر منہ میں ڈال لوں، پھر خیال ہوتا ہے کہ کہیں صدقہ کی کھجور نہ ہو، اس لیے ڈال دیتا ہوں"۔[4]

---

[1] صحیح بخاری ص ۱۹۹ کتاب الصدقات [2] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ [3] ایضاً [4] بخاری جلد اص ۳۲۸ کتاب اللقطہ

ایک دفعہ راستہ میں ایک کھجور ہاتھ آگئی، فرمایا اگر صدقہ کا شبہ نہ ہوتا تو میں اس کو کھا جاتا۔[1]

ایک بار امام حسن علیہ السلام نے صدقہ کی کھجوروں میں سے منہ میں ایک کھجور ڈال لی، آپ نے ڈانٹ کر کہا "کیا تمہیں یہ خبر نہیں کہ ہمارا خاندان صدقہ نہیں کھاتا"[2] پھر منہ سے اگلوا دیا،

آپ کے سامنے جب کوئی شخص کوئی چیز لیکر آتا تو دریافت فرماتے کہ ہدیہ ہے یا صدقہ؟ اگر ہدیہ کہتا قبول فرماتے، اور اگر یہ کہتا کہ صدقہ ہے تو آپ ہاتھ روک لیتے اور دوسرے صاحبوں کو عنایت فرما دیتے[3]

ہدایا اور تحفے قبول کرنا

دوست واحباب کے ہدایا اور تحفے آپ قبول فرماتے تھے، بلکہ آپ نے اسکو ازدیادِ محبت کا بہترین ذریعہ فرمایا ہے،

تھادوا وتحابوا (حدیث) باہم ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجو تو باہم محبت ہوگی،

اسی لیے صحابہ عموماً کچھ نہ کچھ روز آپ کے گھر بھیجا کرتے تھے اور خصوصیت کے ساتھ اس دن بھیجتے تھے جس دن آپ حجرۂ عائشہؓ میں قیام فرماتے تھے،[4] اوپر گذر چکا ہے کہ کوئی چیز آپ کے سامنے پیش کی جاتی تو آپ دریافت فرماتے تھے کہ یہ صدقہ ہے یا ہدیہ؟ اگر ہدیہ ہوتا تو قبول فرماتے، ورنہ احتراز کرتے،[5]

ایک دفعہ ایک عورت نے ایک چادر خدمتِ اقدس میں پیش کی، آپ نے لے لی، اسی وقت ایک صاحب نے مانگ لی، آپ نے ان کو عنایت فرما دی[6]

آس پاس کے ملوک وسلاطین بھی آپ کو تحفے بھیجا کرتے تھے۔ حدودِ شام کے ایک رئیس نے ایک سفید خچر تحفہ دیا تھا، عزیز مصر نے ایک خچر مصر سے بھیجا تھا، ایک امیر نے آپکو موزے بھیجے تھے، ایک دفعہ قیصر روم نے آپ کی خدمت میں ایک پوستین بھیجی جس میں دیبا کی سنجاف لگی ہوئی تھی،

۱ بخاری ج ۱ ص ۳۲۰ کتاب اللقطہ ۲ بخاری ج ۲ ص ۱۰۰ کتاب الصدقات ۳ بخاری مناقب عائشہؓ ۴ صحیح بخاری کتاب الصدقہ ۵ صحیح بخاری کتاب الجنائز

آپنے ذرا دیر کے لیے پہن لی، پھر اتار کر حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) کے پاس بھیجدی، وہ پہنکر خدمت اقدس میں آئے، آپنے ارشاد فرمایا کہ "میں نے اس لیے نہیں بھیجی کہ تم خود پہنو" عرض کی پھر کیا کروں، ارشاد فرمایا کہ اپنے بھائی نجاشی کو بھیجدو[1] حضرت جعفرؓ ایک مدت یعنی فتح خیبر تک حبش میں رہے تھے، اور نجاشی نے ان ہی سے اسلام کی تعلیم پائی تھی،

ہدایا اور تحفے دینا — جن لوگوں کے ہدایا اور تحفے قبول فرماتے تھے، ان کو ان کا صلہ بھی ضرور عطا فرماتے تھے حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کان یقبل الھدایۃ ویثیب علیھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرماتے تھے اور اس کا معاوضہ دیتے تھے، یمن کا مشہور بادشاہ ذی یزن جس نے حبشی حکومت مٹا کر ایران کے زیر اثر عربی حکومت قائم کی تھی، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک قیمتی حلہ بھیجا، جس کو اس نے ۳۳ اونٹوں کے بدلے میں خریدا تھا، آپنے قبول فرمایا، اور پھر اسکو ایک حلہ ہدیۃً بھیجا جو ۲۰ سے کچھ زیادہ اونٹ دیکر خرید آگیا تھا،[2]

(ایک دفعہ) قبیلہ بنی فزارہ کے ایک شخص نے آپ کی خدمت میں ہدیۃً ایک اونٹنی پیش کی، آپ نے اس کا صلہ دیا تو وہ سخت ناراض ہوا، آپنے منبر پر کھڑے ہو کر خطاب عام کیا اور فرمایا کہ تم لوگ مجھے ہدیہ دیتے ہو اور میں بقدر استطاعت اس کا صلہ دیتا ہوں تو ناراض ہوتے ہو، آیندہ قریش، انصار، ثقیف اور دوس کے سوا کسی قبیلہ کا ہدیہ قبول نہ کرونگا،[3]

حضرت ابو ایوب انصاریؓ جن کے مکان میں آپ چھ مہینہ تک فروکش رہے تھے، آپ اکثر انکو بچا ہوا کھانا بھیجا کرتے ہمسایوں اور پڑوسیوں کے گھروں میں بھی تحفے بھیجتے تھے، اصحاب صفہ اکثر آپ کے

[1] ابوداؤد صفحہ ۲۰۵ جلد دوم [2] ایضاً ص ۲۰۳ [3] ادب المفرد امام بخاری ص ۱۸ [4] مسلم کتاب الاطعمہ

Marfat.com

تحفوں سے مشرف ہوا کرتے تھے،

عدم قبول احسان کبھی کسی کا احسان گوارا نہ فرماتے حضرت ابوبکرؓ سے بڑھ کر جاں نثار کون ہوسکتا تھا، تاہم ہجرت کے وقت جب انھوں نے سواری کے لیے ناقہ پیش کیا تو آپ نے قیمت ادا کی،[1] مدینہ میں مسجد کے لیے جو زمین درکار تھی مالکانِ زمین نے مفت نذر کرنی چاہی تھی لیکن آپ نے قیمت دیکر لی،

ایک دفعہ عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں ہمسفر تھے، عبداللہ بن عمرؓ کی سواری کا اونٹ سرکش تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقہ سے آگے نکل نکل جاتا تھا عبداللہ بن عمرؓ روکتے تھے لیکن وہ قابو کا نہ تھا حضرت عمرؓ بار بار عبداللہ بن عمرؓ کو ڈانٹتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے کہا یہ اونٹ میرے ہاتھ بیچ ڈالو انھوں نے کہا نذر ہے، آپ نے فرمایا نہیں دام لو، انھوں نے دوبارہ عرض کی کہ یوں ہی حاضر ہے، آپ نے انکار کیا، بالآخر حضرت عمرؓ نے دام لینے منظور کیے، آپ نے خرید کر عبداللہ بن عمرؓ کو دیدیا کہ اب یہ تمھارا ہے،[2]

عدم تشدد حضرت معاذ بن جبلؓ (جو اکابر صحابہ میں سے تھے) ایک محلہ میں امامت کرتے، اور نماز فجر میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے تھے، ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ وہ اسقدر لمبی نماز پڑھتے ہیں کہ میں ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے قاصر رہتا ہوں، ابومسعود انصاریؓ کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی اسقدر غضبناک نہیں دیکھا جس قدر اس موقع پر دیکھا، آپ نے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا: "بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو لوگوں کو متنفر کر دیتے ہیں، جو شخص تم میں سے نماز پڑھائے، مختصر پڑھائے کیونکہ نماز میں بوڑھے، کمزور، کام والے سبھی طرح کے آدمی ہوتے ہیں"۔[3]

حدود و قصاص میں نہایت احتیاط فرماتے اور جہاں تک ممکن ہوتا درگذر کرنا چاہتے، ماعزاسلمی ایک

---

[1] بخاری ص ۵۵۳ [2] ایضاً ص ۲۸۴ [3] بخاری کتاب الصلوٰۃ و باب ہل یقضی الحاکم وہو غضبان صفحہ ۱۰۶۰

Marfat.com

صاحب تھے، جو زنا میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن فوراً مسجد میں آئے، اور کہا یا رسول اللہ! میں نے بدکاری کی، آپ نے منہ پھیر لیا، وہ دوسری سمت آئے، آپ نے اور طرف منہ پھیر لیا، آپ بار بار منہ پھیر لیتے اور وہ بار بار سامنے آکر زنا کا اقرار کرتے، بالآخر آپ نے فرمایا کہ تم کو جنون تو نہیں ہے؟ بولے نہیں! پھر پوچھا، تمھاری شادی ہو چکی ہے، بولے ہاں، آپ نے فرمایا کہ تم نے صرف ہاتھ لگایا ہوگا، بولے نہیں بلکہ مجامعت کی، آخر مجبور ہو کر آپ نے حکم سنا دیا کہ سنگسار کیے جائیں[1]،

ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کی کہ مجھ سے گناہ سرزد ہوا، آپ حد (سزا) کا حکم دیں، آپ چپ رہے، اور نماز کا وقت آگیا، نماز کے بعد انھوں نے پھر آکر یہی درخواست کی، آپ نے فرمایا کیا تم نے نماز نہیں پڑھی، بولے ہاں پڑھ لی، ارشاد فرمایا تو خدا نے تمھارا گناہ معاف کر دیا[2]،

ایک دفعہ قبیلہ غامد کی ایک عورت آئی، اور اظہار کیا کہ میں نے بدکاری کی، آپ نے فرمایا "واپس جاؤ" دوسرے دن پھر آئی، اور بولی کہ کیا آپ مجھکو ماعز کی طرح چھوڑ دینا چاہتے ہیں، خدا کی قسم مجکو حمل رہ گیا ہے، پھر فرمایا، واپس جاؤ، وہ چلی گئی، تیسرے دن پھر واپس آئی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ بچہ کے پیدا ہونے تک انتظار کرو، جب بچہ پیدا ہوا تو بچہ کو گود میں لیے ہوئے آئی، (یعنی اب زنا کی سزا دینے میں کیا تامل ہے؟) آپ نے فرمایا کہ دودھ پینے کی مدت تک انتظار کرو، جب دودھ چھوٹ جائے تب آنا، جب رضاعت کا زمانہ گذر گیا تو پھر حاضر ہوئی، اب آپ نے مجبور ہو کر سنگسار کرنے کا حکم دیا، لوگوں نے اس پر پتھر برسانے شروع کیے، ایک صاحب کا پتھر اس کے چہرہ پر لگا اور خون کی چھینٹیں اڑ کر ان کے چہرہ پر آئیں، انھوں نے اس کو گالی دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، زبان روکو، خدا کی قسم اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ جبراً محصول

---

[1] یہ حدیث بخاری میں کئی مختلف ابواب میں مذکور ہے، دیکھنا چاہیے صفحہ ۱۰۰۸، [2] بخاری صفحہ ۱۰۰۸

لینے والا بھی اگر یہ توبہ کرتا تو بخشدیا جاتا۔"[1]

ایک دن ایک صاحب نے عرض کی کہ ہم لوگ یہودیوں اور عیسائیوں کے ملک میں رہتے ہیں، کیا ان کے برتنوں میں کھانا کھالیا کریں؟ فرمایا اور برتن ہاتھ آئیں تو ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ ورنہ ان کو دھوکر کھا سکتے ہو۔[2]

ایک بار ایک صحابی نے ماہ رمضان تک کیلیے اپنی بی بی سے ظہار کرلیا لیکن ابھی یہ مدت گذرنے نہ پائی تھی کہ اس سے مقاربت کرلی، پھر لوگوں کو اس واقعہ کی خبر کی، اور کہا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لیچلو، سب نے انکار کردیا، انھوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر واقعہ بیان کیا، آپ نے پہلے تو تعجب ظاہر کیا، پھر ایک غلام کے آزاد کرنے کا حکم دیا، انھوں نے ناداری کا عذر کیا، تو آپ نے متصل دو ماہ تک روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی، انھوں نے کہا یہ سب تو رمضان ہی کی وجہ سے ہوا ہے، اب آپ نے ساٹھ مسکینوں پر صدقہ کرنے کو فرمایا، انھوں نے کہا ہم تو خود فاقہ کررہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ صدقہ کے عامل کے پاس جاؤ وہ تمہیں ایک وسق کھجور دیگا، اس میں سے ساٹھ مسکینوں کو دیدینا، اور جو بچے وہ اپنے اہل وعیال پر صرف کرنا، وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ تم لوگ متشدد اور بدتدبیر تھے لیکن مجھے رسول اللہ کی خدمت میں حسن رائے اور آسانی نظر آئی۔[3]

ایک بار ایک اور صحابی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ میں برباد ہوگیا، روزہ میں اپنی بیوی سے ہمبستر ہوا، آپ نے فرمایا، ایک غلام آزاد کرسکتے ہو؟ کہا نہیں، فرمایا دو مہینہ تک متصل روزہ رکھ سکتے ہو، کہا نہیں، فرمایا ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلا سکتے ہو، کہا اسکی بھی قدرت نہیں،

---

[1] ابوداؤد کتاب الصوم [2] بخاری جلد ۲ ص ۶۶ [3] ابوداؤد جلد ۱ ص ۲۲۰

آنحضرتؐ نے تامل فرمایا، کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ایک شخص نے کھجوروں کی ایک ٹوکری ہدیۃً پیش کی، آپؐ نے فرمایا سائل کہاں گیا، سائل نے کہا یا رسول اللہ میں یہ ہوں، فرمایا ان کھجوروں کو لیجاؤ اور کسی غریب کو خیرات دیدو، سائل نے کہا یا رسول اللہ مدینہ میں مجھ سے زیادہ غریب کون ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے اور فرمایا "جاؤ گھر ہی والوں کو کھلادو"[1]

تقشف ناپسند تھا

رہبانیت اور تقشف کو ناپسند فرماتے تھے، صحابہ میں سے بعض بزرگ میلان طبعی یا عیسائی راہبوں کے اثر سے رہبانیت پر آمادہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو باز رکھا، بعض صحابہؓ ناداری کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے، اور ضبط نفس پر بھی قادر نہ تھے، انھوں نے قطع اعضا کرانا چاہا آپ نے سخت ناراضی ظاہر کی، قدامہ بن مظعونؓ ایک اور صحابی آئے کہ ہم سے ایک نے ترک حیوانات اور دوسرے نے ترک نکاح کا عزم کر لیا ہے، آپ نے فرمایا کہ "میں تو دونوں سے متمتع ہوتا ہوں"۔ آپ کی مرضی نہ پاکر دونوں صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے، عرب میں صوم وصال کا طریقہ مدت سے جاری تھا یعنی کئی کئی دن متصل روزے رکھتے تھے، صحابہ نے بھی اس کا ارادہ کیا لیکن آپ نے سختی سے روکا، حضرت عبداللہ بن عمروؓ نہایت مرتاض زاہد تھے، انھوں نے عہد کر لیا تھا کہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں گے اور رات بھر عبادت کرینگے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی، تو بلا بھیجا اور پوچھا کہ کیا یہ خبر صحیح ہے، عرض کی "ہاں"، فرمایا "تم پر تمہارے جسم کا حق ہے، آنکھ کا حق ہے، بیوی کا حق ہے، مہینہ میں تین دن کے روزے کافی ہیں"، عبداللہ بن عمروؓ نے کہا مجھ کو اس سے زیادہ طاقت ہے، فرمایا کہ اچھا تیسرے دن، بولے میں اس سے بھی زیادہ طاقت رکھتا ہوں، ارشاد فرمایا کہ ایک دن بیچ دیکر کہ یہی داؤد کا روزہ تھا، اور یہی افضل الصیام ہے، انھوں نے عرض کی کہ

---

[1] بخاری صفحہ ۲۶۰ باب اذا جامع فی رمضان

مجھکو اس سے بھی زیادہ قدرت ہے، ارشاد ہوا بس اس سے زیادہ بہتر نہیں[1]

ایک روایت میں ہے کہ عبداللہ بن عمرو کی روزہ داری کا چرچا ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے پاس تشریف لے گئے، انھوں نے استقبال کیا، اور چمڑے کا گدا بچھا دیا، آپ زمین پر بیٹھ گئے، اور ان سے کہا کہ تم کو مہینہ میں تین روزے بس نہیں کرتے، عرض کی نہیں، فرمایا پانچ، بولے نہیں، غرض آپ بار بار تعداد بڑھاتے جاتے اور وہ اس پر راضی نہ ہوتے، بالآخر آپ نے فرمایا کہ اخیر حد یہ ہے کہ ایک دن افطار کرو اور ایک دن روزہ رکھو[2]

ایک دفعہ حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ میں جوان آدمی ہوں اور اتنا مقدور نہیں کہ نکاح کروں، نہ اپنے نفس پر اطمینان ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چپ رہے، حضرت ابوہریرہؓ نے پھر ان ہی الفاظ کا اعادہ کیا، آپ چپ رہے، سہ بارہ کہا تو آپ نے فرمایا کہ خدا کا حکم ٹل نہیں سکتا،[3]

(قبیلہ باہلہ کے ایک صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر واپس گئے، سال بھر کے بعد آنے کا اتفاق ہوا لیکن اتنے ہی زمانہ میں ان کی شکل و صورت اس قدر بدل گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو نہ پہچان سکے، انھوں نے اپنا نام بتایا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعجب سے پوچھا کہ تم تو نہایت خوش جمال تھے، تمھاری صورت کیوں بگڑ گئی، انھوں نے کہا جب سے رخصت ہوا متصل روزے رکھتا ہوں، آپ نے فرمایا اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا، رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک دن کا روزہ کافی ہے، انھوں نے کہا اس سے زیادہ کی قوت رکھتا ہوں، آپ نے ایک دن کا اور اضافہ کر دیا، انھوں نے اور اضافہ کی درخواست کی، آپ نے تین کر دیے، ان کو اس پر بھی تسکین نہ ہوئی، تو آپ نے اشہر حرام کے روزے

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم [2] بخاری کتاب النکاح [3] ایضاً

Marfat.com

کا حکم دیا۔[1]

ایک دن چند صحابہ خاص اس غرض سے ازواج مطہراتؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے حالات دریافت کریں، وہ سمجھتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات دن عبادت کے سوا کچھ نہ کرتے ہوں گے، حالات سنے تو ان کے معیار کے موافق نہ تھے، بولے کہ بھلا ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نسبت؟ ان کے پچھلے پہلے گناہ سب خدا نے معاف کر دیے ہیں، پھر ایک صاحب نے کہا کہ میں رات بھر نماز پڑھا کرونگا، دوسرے صاحب بولے میں عمر بھر روزہ رکھوں گا، ایک اور صاحب نے کہا میں بھی شادی نہ کرونگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سن رہے تھے، فرمایا کہ خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں، تاہم روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میرے طریقہ پر نہیں چلتا وہ میرے گروہ سے خارج ہے۔"[2]

کسی غزوہ میں ایک صحابی کا ایک غار پر گذر ہوا جس میں پانی تھا اور آس پاس کچھ بوٹیاں تھیں، خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو عرض کی، یا رسول اللہ مجھ کو ایک غار مل گیا ہے جس میں ضرورت کی سب چیزیں ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ نشین ہو کر ترک دنیا کر دوں، آپ نے فرمایا میں یہودیت یا نصرانیت لیکر دنیا میں نہیں آیا، میں آسان اور سہل ابراہیمی مذہب لیکر آیا ہوں۔"[3]

عیب جوئی اور مداحی کی ناپسندیدگی

مداحی اور تعریف کو بھی دل سے سخت ناپسند فرماتے تھے، ایک دفعہ مجلس اقدس میں ایک شخص کا مذکور نکلا، حاضرین میں سے ایک شخص نے ان کی بہت تعریف کی، آپ نے فرمایا "تم نے اپنے دوست کی گردن کاٹی"، یہ الفاظ چند بار فرمائے، پھر ارشاد کیا کہ

[1] ابوداؤد صفحہ ۲۲۴ [2] صحیح بخاری کتاب النکاح [3] مسند ابن حنبل جلد ۵ ص ۲۶۶

تم کو اگر کسی کی خواہی نخواہی مدح کرنی ہو تو یوں کہو کہ میرا ایسا خیال ہے۔"[۱]

ایک دفعہ ایک شخص کسی حاکم کی مدح کر رہا تھا حضرت مقدادؓ بھی موجود تھے، انھوں نے زمین سے خاک اٹھا کر اس کے منھ میں جھونک دی اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ مداحوں کے منھ میں خاک بھر دیں۔[۲]

ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف لائے، ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا، محجن ثقفیؓ سے پوچھا یہ کون ہے۔ محجنؓ نے ان کا نام بتایا، اور نہایت تعریف کی، ارشاد فرمایا کہ دیکھو "یہ سن نہ پائے ورنہ تباہ ہو جائیگا" یعنی دل میں غرور پیدا ہوگا، جو موجب ہلاکت ہوگا۔[۳]

ایک دفعہ اسود بن سریع جو شاعر تھے، خدمت عالی میں آئے اور عرض کی کہ میں نے خدا کی حمد اور حضور کی مدح میں کچھ اشعار کہے ہیں، فرمایا کہ ہاں خدا کو حمد پسند ہے، اسود نے اشعار پڑھنے شروع کیے، اسی اثنا میں کوئی صاحب باہر سے آگئے، آپؐ نے اسود کو روک دیا، وہ کچھ دیر باتیں کر کے چلے گئے، پھر اسود نے پڑھنے شروع کیے، وہ صاحب پھر آگئے، آپؐ نے اسود کو روک دیا، دو تین دفعہ یہی اتفاق ہوا، اسود نے عرض کی کہ یہ کون صاحب ہیں جن کے لیے آپ مجھکو بار بار روک دیتے ہیں، فرمایا کہ یہ وہ شخص ہے جو فضول باتیں پسند نہیں کرتا۔[۴]

اس موقع پر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حسانؓ کو منبر پر بٹھا کر ان کے اشعار سنتے تھے اور فرماتے تھے اللھم ایدہ بروح القدس حالانکہ یہ اشعار آنحضرتؐ کی مدح میں ہوتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ حسانؓ کے اشعار کفار کے معارضوں کا جواب ہوتے تھے عرب میں شعراء کو

---

[۱] ادب المفرد صفحہ ۶۶ [۲] ایضاً ص ۶۷ [۳] ایضاً ص ۶۸ [۴] ایضاً

Marfat.com

یہ رتبہ حاصل تھا کہ زورِ کلام سے جس شخص کو چاہتے ذلیل اور جس کو چاہتے معزز کر دیتے، ابن الزبعریٰ اور کعب اشرف وغیرہ نے اس طریقہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرر پہنچانا چاہا تھا، حسان کی مداحی انکا ردِ عمل تھا۔

سادگی اور بے تکلفی معمول تھا کہ مجلس سے اٹھکر گھر میں تشریف لیجاتے تو کبھی کبھی ننگے پاؤں چلے جاتے، اور جوتی وہیں چھوڑ جاتے، یہ اس بات کی علامت تھی کہ پھر واپس تشریف لائیں گے[1]

روز روز کنگھا کرنا ناپسند فرماتے، ارشاد تھا کہ ایک دن بیچ دے کر کنگھا کرنا چاہیے،

(کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، اٹھنے بیٹھنے، کسی چیز میں تکلف نہ تھا، کھانے میں جو سامنے آتا، تناول فرماتے، پہننے کو موٹا جھوٹا جو ملجاتا پہن لیتے، زمین پر، چٹائی پر، فرش پر جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے،[3] آپ کے لیے آٹے کی بھوسی کبھی صاف نہیں کیجاتی تھی،[4] کرتہ کا تکمہ اکثر کھلا رکھتے تھے، لباس میں نمائش کو ناپسند فرماتے تھے، سامانِ آرائش سے طبعاً نفور رہتے تھے،[5] غرض ہر چیز میں سادگی اور بے تکلفی پسند خاطر تھی)

امارت پسندی سے اجتناب اسلام رہبانیت اور جوگی پن کا سخت مخالف ہے (لا رہبانیۃ فی الاسلام) اسی بنا پر آپ ہر قسم کے جائز حظوظ دنیوی سے متمتع ہونا جائز رکھتے تھے، اور خود بھی کبھی کبھی ان چیزوں سے تمتع اٹھاتے تھے، تاہم نازو نعمت، تکلف و عیش پرستی کو ناپسند فرماتے اور اوروں کو بھی اس سے روکتے،

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت علیؓ کی دعوت کی اور کھانا پکوا کر گھر بھیج دیا، حضرت فاطمہ زہراؓ نے کہا کہ رسول اللہ بھی تشریف لاتے اور ہمارے ساتھ کھاتے تو خوب ہوتا، حضرت علیؓ گئے، اور آپ سے جا کر عرض کی، آپ تشریف لائے، لیکن دروازہ پر پہنچے تو یہ دیکھ کر کہ گھر میں دیواروں پر پردے لٹکے ہوئے ہیں، واپس چلے گئے حضرت علیؓ نے واپسی کی وجہ دریافت کی، تو فرمایا پیغمبر کی شان کے خلاف ہے کہ وہ

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ۱۸۰ [2] دیکھو شمائل [3] صحیح بخاری کتاب الاطعمہ ص ۸۱۴ [4] صحاح کی کتاب اللباس میں متعدد واقعات ہیں

کسی زیب و زینت کے مکان میں داخل ہو[1]

فرمایا کرتے کہ گھر میں ایک بستر اپنے لیے، ایک بیوی کے لیے اور ایک مہمان کے لیے کافی ہے، چوتھا شیطان کا حصہ ہے،[2]

ایک دفعہ کسی غزوہ میں تشریف لے گئے، حضرت عائشہؓ رہ گئیں، لڑائی سے واپس تشریف لائے اور حضرت عائشہؓ کے پاس آئے تو دیکھا کہ گھر پر چھت گیر لگی ہوئی ہے، اسی وقت پھاڑ ڈالی اور فرمایا کہ خدا نے ہم کو دولت اس لیے نہیں دی ہے کہ اینٹ پتھر کو کپڑے پہنائے جائیں،[3]

ایک انصاری نے ایک مکان بنوایا جس کا گنبد بہت بلند تھا، آپ نے دیکھا تو پوچھا کس نے بنایا ہے؟ لوگوں نے نام بتایا، آپ چپ رہے جب وہ حسب معمول خدمت اقدس میں آئے اور سلام کیا تو آپ نے منہ پھیر لیا، انھوں نے پھر سلام کیا، آپ نے پھر منہ پھیر لیا، وہ سمجھ گئے کہ ناراضی کی کیا وجہ ہے، جا کر گنبد کو زمین کے برابر کر دیا، ایک دن آپ بازار میں نکلے تو گنبد نظر نہ آیا، معلوم ہوا کہ انصاری نے اس کو ڈھا دیا، ارشاد فرمایا کہ "ضروری عمارت کے سوا ہر عمارت انسان کے لیے وبال ہے"[4]

ایک دفعہ کسی نے کمخواب کی قبا بھیجی، آپ نے پہن لی پھر خیال آیا اور اتار کر حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دی، حضرت عمرؓ روتے ہوئے آئے اور عرض کی کہ آپ نے جو چیز ناپسند کی وہ مجھکو عنایت ہوتی ہے، ارشاد ہوا کہ میں نے استعمال کیلیے نہیں بلکہ فروخت کے لیے بھیجی، چنانچہ حضرت عمرؓ نے فروخت کیا تو ہزار درہم اٹھے،[5]

ایک دفعہ کسی نے ایک مخطط چادر بھیجا، آپ نے حضرت علیؓ کو عنایت فرمایا، وہ پہنکر خدمت اقدس

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱۷۱ [2] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۲۱۰ کتاب اللباس [3] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۲۱۹

[4] ایضاً صفحہ ۳۷۲ [5] ایضاً کتاب اللباس

میں آئے، آپ کے چہرہ پر غضب کے آثار پیدا ہوئے۔ اور فرمایا کہ "میں نے اس لیے بھیجا تھا کہ پھاڑ کر زنانی چادریں بنائی جائیں[1]"

مہر کرنے کی ضرورت سے جب آپ نے انگوٹھی بنوائی تو پہلے سونے کی بنوائی، آپ کی تقلید سے صحابہ نے بھی زریں انگوٹھیاں بنوائیں، آپ منبر پر چڑھے اور انگوٹھی اتار کر پھینک دی، اور فرمایا کہ "اب نہ پہنوں گا" صحابہ نے بھی اسی وقت اتار کر پھینک دیں[2]،

(جس طرح آپ خود سادگی پسند فرماتے تھے، اسی طرح آپ یہ بھی چاہتے تھے کہ آپ کے اہل و عیال بھی سادہ زندگی بسر کریں اور تکلف و تنعم سے پاک رہیں، عورتوں کو شریعت میں سونے کے زیور کا استعمال مباح ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اہلبیت کرام کیلیے اس بات کو بھی خلاف اولیٰ تصور فرماتے تھے)

ایک دفعہ حضرت فاطمہؓ کے گلے میں سونے کا ہار دیکھا تو فرمایا کہ تم کو یہ گوارا ہوگا جب لوگ کہیں گے کہ پیغمبر کی لڑکی کے گلے میں آگ کا ہار ہے[3]،

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن (مسکہ) دیکھے، فرمایا کہ اگر اس کو اتار کر دو ہی کے کنگن کو زعفران سے رنگ کر پہن لیتیں تو بہتر ہوتا[4]،

ایک دفعہ نجاشی نے کچھ زیورات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہدیۃً بھیجے، ان میں ایک انگوٹھی تھی جس میں حبشی پتھر کا نگینہ جڑا تھا، آپ کے چہرہ پر کراہت کے آثار ظاہر ہوتے تھے اور لکڑی سے اس کو چھوتے تھے، ہاتھ نہیں لگاتے تھے[5])

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ۴۶۳ کتاب اللباس [2] ابوداؤد کتاب الخاتم [3] نسائی جلد ۲ ص ۲۸۴ [4] ایضاً

[5] مسند ابن حنبل جلد ۶ ص ۱۱۹

Marfat.com

ایک دفعہ کسی نے ریشم کا شلوکہ ہدیۃً بھیجا، آپ نے پہن لیا، اور اس کو پہنکر نماز ادا فرمائی، نماز سے فارغ ہوکر نہایت کراہت اور نفرت کے ساتھ نوچ کر اتار ڈالا، پھر فرمایا "پرہیزگاروں کے لیے یہ کپڑا مناسب نہیں"۔

تواضع اور خاکساری کی راہ سے اکثر معمولی کپڑے استعمال فرماتے تھے، حضرت عمرؓ کو خیال تھا کہ جمعہ و عیدین میں یا سفراء کے ورود کے موقع پر آپ شان و تجمل کے کپڑے زیب تن فرمائیں، اتفاق سے ایک بار راستہ میں ایک ریشمی کپڑا (حلہ سیرا) بک رہا تھا حضرت عمرؓ نے موقع پاکر عرض کیا، یا رسول اللہ یہ کپڑا حضور خرید لیں، اور جمعہ میں اور سفراء کی آمد کے موقع پر ملبوس فرمائیں، ارشاد فرمایا کہ "یہ وہ پہنے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں"۔

اکثر موٹے جھوٹے اور بھیڑ کے بال کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے، اور ان ہی کپڑوں میں وفات پائی۔[۱]

بستر کمبل کا تھا، یعنی چمڑے کا جس میں کھجور کی کھال بھری ہوتی تھی کبھی معمولی کپڑا جو دوتہ کر دیا جاتا تھا، حضرت حفصہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک شب کو میں نے بستر مبارک چارتہ کر کے بچھایا کہ ذرا نرم ہوجائے، صبح اٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگواری ظاہر فرمائی،[۲]

سنہ ھ میں جبکہ یمن سے شام تک صرف اسلامی حکومت تھی، فرمانروائے اسلام کے گھر میں صرف ایک گھری کی چارپائی اور چمڑے کا سوکھا ہوا مشکیزہ تھا،[۳] حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ جب آپ نے وفات پائی تو تھوڑے سے جو کے سوا گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا،[۴] صحابہ سے فرمایا

---

[۱] اوپر کی تمام روایتیں صحیح بخاری کتاب اللباس سے ماخوذ ہیں [۲] شمائل ترمذی [۳] صحیح بخاری کتاب اللباس [۴] مسند ابن حنبل جلد ۱ ص ۱۰۰

Marfat.com

کرتے تھے کہ دنیا میں انسان کے لیے اتنا کافی ہے جتنا ایک مسافر کو زادِ راہ کے لیے" ایک دفعہ ایک بوریے پر آرام فرما رہے تھے، اٹھے تو لوگوں نے دیکھا کہ پہلوئے مبارک پر نشان پڑ گئے ہیں، عرض کی یا رسول اللہ! کیا ہم لوگ کوئی گدا بنوا کر حاضر کریں، ارشاد ہوا کہ مجھکو دنیا سے کیا غرض؟ مجھکو دنیا سے اسقدر تعلق ہے جس قدر اس سوار کو جو تھوڑی دیر کے لیے راہ میں کسی درخت کے سایہ میں بیٹھ جاتا ہے، پھر اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے[۲]،

ایلاء کے زمانہ میں حضرت عمرؓ جب مشربہ میں جو اسباب کی کوٹھری تھی حاضر ہوئے تو ان کو نظر آیا کہ سرورِ عالم کے بیت قدس میں دنیاوی ساز و سامان کی کیا کیفیت ہو؟ جسم مبارک پر صرف ایک تہبند ہے، ایک کھُری چادر بچھی ہے، سرہانے ایک تکیہ پڑا ہے جس میں خرمے کی چھال بھری ہے، ایک طرف مٹھی بھر جَو رکھے ہیں، ایک کونے میں پائے مبارک کے پاس کسی جانور کی کھال پڑی ہے، کچھ مشکیزہ کی کھالیں سر کے پاس کھونٹی پر لٹک رہی ہیں، یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کا سبب دریافت فرمایا، عرض کی یا رسول اللہ! میں کیوں نہ روؤں، چارپائی کے بان سے جسم اقدس میں بدھیاں پڑ گئی ہیں، یہ آپکے اسباب کی کوٹھری ہے، اس میں جو سامان ہے وہ نظر آ رہا ہے، قیصر و کسریٰ تو باغ و بہار کے مزے لوٹیں، اور آپ خدا کے پیغمبر اور برگزیدہ ہوکر آپکے سامان خانہ کی یہ کیفیت ہو، ارشاد ہوا اے ابن خطاب! تم کو یہ پسند نہیں کہ وہ دنیا لیں اور ہم آخرت[۳]!"

مساوات | آپ کی نظر میں امیر و غریب، صغیر و کبیر، آقا و غلام سب برابر تھے، سلمانؓ و صہیبؓ و

---

[۱] ابن ماجہ کتاب الزہد [۲] جامع ترمذی کتاب الزہد [۳] صحیح مسلم کتاب الطلاق باب تخییر الازواج

Marfat.com

بلالؓ کو سب کے سب غلام رہ چکے تھے، آپ کی بارگاہ میں رؤسائے قریش سے کم رتبہ نہ تھے، ایک دفعہ حضرت سلمانؓ و بلالؓ ایک موقع پر جمع تھے، اتفاق سے ابوسفیان نکلے، ان لوگوں نے کہا ابھی تلوار نے اس دشمن خدا کے گردن پر پورا قبضہ نہیں پایا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے ان لوگوں سے کہا سردار قریش کی شان میں یہ الفاظ! پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ کہیں تم نے ان لوگوں کو ناراض تو نہیں کیا، ان لوگوں کو ناراض کیا تو تو خدا کو ناراض کیا، حضرت ابوبکرؓ نے فوراً جا کر ان بزرگوں سے کہا بھائیو! آپ لوگ مجھ سے ناراض تو نہیں ہوئے، ان لوگوں نے کہا نہیں، خدا تم کو معاف کرے[1]،

قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی، اسامہ بن زید جن سے آنحضرت نہایت محبت رکھتے تھے، لوگوں نے ان کو شفیع بنا کر خدمتِ نبویؐ میں بھیجا، آپ نے فرمایا "اسامہ! کیا تم حدود خداوندی میں سفارش کرتے ہو" پھر آپ نے لوگوں کو جمع کر کے خطاب فرمایا "تم سے پہلے کی امتیں اسی لیے برباد ہو گئیں کہ جب معزز آدمی کوئی جرم کرتا تو تسامح کرتے اور معمولی آدمی مجرم ہوتے تو سزا پاتے، خدا کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ سرقہ کرتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے[2]"

غزوۂ بدر میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ آپ کے چچا حضرت عباسؓ بھی گرفتار ہو کر آئے تھے، قیدیوں کو زرِ فدیہ لیکر رہا کیا جاتا تھا، بعض نیک دل انصار نے اس بنا پر کہ وہ آپ سے قرابت قریبہ رکھتے تھے، عرض کی کہ یا رسول اللہ! اجازت دیجئے کہ ہم اپنے بھانجے (عباس) کا زرِ فدیہ معاف کر دیں، آپ نے فرمایا نہیں، ایک درہم بھی معاف نہ کرو[3]،

---

[1] صحیح مسلم فضائل سلمانؓ و صہیبؓ [2] بخاری و مسلم و ابوداؤد کتاب الحدود [3] صحیح بخاری باب فداء المشرکین،

مجلس میں جو چیزیں آتیں ہمیشہ داہنی طرف سے اس کی تقسیم شروع فرماتے اور ہمیشہ اس میں امیر و غریب، صغیر و کبیر سب کی مساوات کا لحاظ ہوتا)

ایک دفعہ خدمتِ اقدس میں صحابہ کا مجمع تھا، اتفاق سے داہنی طرف حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیٹھے ہوئے تھے، جو بہت کمسن تھے، بائیں جانب بڑے بڑے معمر صحابہ تھے، کہیں سے دودھ آیا، آپ نے نوش فرما کر عبداللہ بن عباسؓ سے کہا تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں، انھوں نے عرض کی، اس عطیہ میں میں ایثار نہیں کرسکتا، چونکہ وہ داہنی جانب تھے اور ترتیب مجلس کی رو سے ان ہی کا حق تھا، آپ نے ان ہی کو ترجیح دی[1]،

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میرے مکان پر تشریف لائے اور پینے کا پانی مانگا، میں نے بکری کا دودھ پیش کیا، مجلس کی ترتیب یہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ بائیں جانب، حضرت عمرؓ سامنے اور ایک بدو داہنی جانب تھا، آپ نے پی لیا، تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی طرف اشارہ کیا، یعنی بقیہ ان کو عنایت ہو، آپ نے فرمایا پہلے داہنی طرف والے کا حق ہے، یہ کہکر بچا ہوا دودھ بدو کو عنایت فرمایا[2]،

(قریش اپنے فخر و امتیاز کے لیے مزدلفہ میں قیام کرتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تفریق کو کبھی پسند نہ فرمایا، بعثت[3] سے پہلے اور بعثت کے بعد[4] بھی ہمیشہ عام لوگوں کے ساتھ مقام کرتے تھے، علاوہ بریں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ وہیں خاص طور سے کوئی عمدہ جگہ دیکھ کر آپ کے لیے مخصوص کردی جائے اور وہاں سایہ کے لیے کوئی چھپر ڈال دیا جائے، صحابہ نے یہ تجویز پیش کی تو فرمایا "جو پہلے

---

[1] صحیح بخاری ص ۸۰۰ [2] بخاری ص ۸۰۵ [3] مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۸۰ [4] ایضاً

پہنچ جائے، اسی کا مقام ہے۔"[1]

صحابہ جب سب مل کر کوئی کام کرتے تو ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ شریک ہو جاتے اور معمولی مزدور کی طرح کام انجام دیتے، مدینہ میں آکر سب سے پہلا کام مسجد نبوی کی تعمیر تھی۔ اس مسجد اقدس کی تعمیر میں دیگر صحابہ کی طرح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بہ نفس نفیس شریک تھے، خود اپنے دست مبارک سے اینٹ اٹھا اٹھا کر لاتے تھے، صحابہ عرض کرتے تھے کہ ہماری جانیں قربان آپ کیوں زحمت فرماتے ہیں، لیکن آپ اپنے فرض سے باز نہ آتے۔[2] غزوۂ احزاب کے موقع پر بھی جب تمام صحابہ مدینہ کے چاروں طرف خندق کھود رہے تھے، آپ بھی ایک ادنیٰ مزدور کی طرح کام کر رہے تھے، یہاں تک کہ شکم مبارک پر مٹی اور خاک کی تہ جم گئی تھی۔[3]

ایک سفر میں کھانا تیار نہ تھا، تمام صحابہ نے مل کر کھانا پکانے کا سامان کیا، لوگوں نے ایک ایک کام بانٹ لیا، جنگل سے لکڑی لانے کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذمہ لیا، صحابہ نے عرض کی، یا رسول اللہ! یہ کام ہم خدام کر لیں گے، فرمایا "ہاں سچ ہے، لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میں تم سے اپنے کو ممتاز کروں، خدا اس بندہ کو پسند نہیں کرتا، جو اپنے ہمراہیوں میں ممتاز بنتا ہے۔"[4]

غزوۂ بدر میں سواریوں کا سامان بہت کم تھا، تین تین آدمیوں کے بیچ میں ایک ایک اونٹ تھا، لوگ باری باری سے چڑھتے اترتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی عام آدمیوں کی طرح ایک اونٹ میں دو آدمیوں کے ساتھ شریک تھے، ہمراہ جان نثار اپنی باری پیش کرتے، اور عرض کرتے کہ یا رسول اللہ! آپ سوار رہیں، حضور کے بدلہ میں ہم پیادہ چلیں گے، ارشاد ہوتا کہ نہ تم مجھ سے زیادہ پیادہ پا

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۔ [2] صحیح بخاری باب الہجرۃ و بناء المسجد۔ [3] صحیح بخاری باب غزوۂ احزاب۔ [4] زرقانی جلد ۴ ص ۳۰۶ بحوالہ سیرت محب طبری، یہ روایت کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔

Marfat.com

چل سکتے ہو اور نہ میں تم سے کم ثواب کا محتاج ہوں[1]۔

تواضع گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے، گھر میں خود جھاڑو دیتے، دودھ دوہ لیتے، بازار سے سودا لاتے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے، گدھے کی سواری سے آپ کو عار نہ تھا[2]، غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز نہ تھا[3]) ایک دفعہ گھر سے باہر تشریف لائے، لوگ تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے، فرمایا "اہل عجم کی طرح تعظیم کیلئے نہ اٹھو[4]"

غریب سے غریب بیمار ہوتا تو عیادت کو تشریف لیجاتے، مفلسوں اور فقیروں کے ہاں جا کر ان کے ساتھ بیٹھتے، صحابہ کے ساتھ بیٹھتے تو اس طرح بیٹھتے کہ امتیازی حیثیت کی بناء پر کوئی آپ کو پہچان نہ سکتا، کسی مجمع میں جاتے تو جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔

ایک دفعہ ایک شخص ملنے آیا لیکن نبوت کا رعب اسقدر طاری ہوا کہ کانپنے لگا، آپ نے فرمایا کہ "گھبراؤ نہیں میں بادشاہ نہیں، ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی[5]۔"

تواضع اور انکساری کی راہ سے آپ اکڑوں بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے، "میں بندہ اور بندوں کی طرح کھاتا اور بندوں ہی کی طرح بیٹھتا ہوں" ایک دفعہ کھانے کے موقع پر جگہ تنگ تھی، اور لوگ زیادہ آگئے، آپ اکڑوں بیٹھ گئے کہ جگہ نکل آئے، ایک بدوی مجلس میں شریک تھا، اس نے کہا محمد! یہ کیا طرز نشست ہے، آپ نے فرمایا خدا نے مجھے خاکسار بندہ بنایا ہے، جبار اور سرکش نہیں بنایا ہے[6]۔

تواضع کی انتہا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متعلق جائز تعظیمی الفاظ بھی نہیں پسند فرماتے تھے۔

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۴۲۲ و مسند ابوداؤد طیالسی [2] شمائل ترمذی [3] ابوداؤد و ابن ماجہ [4] شمائل ترمذی [5] مستدرک ج ۳ ص ۴۸ علی شرط الشیخین واقعہ فتح مکہ [6] ابوداؤد کتاب الاطعمہ

Marfat.com

ایک بار ایک شخص نے ان الفاظ سے آپ کو خطاب کیا "اے ہمارے آقا اور ہمارے آقا کے فرزند، اور اے ہم میں سب سے بہتر اور ہم میں سب سے بہتر کے فرزند" آپ نے فرمایا، لوگو پرہیزگاری اختیار کرو، شیطان تمھیں گرا نہ دے، میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول، مجھکو خدا نے جو مرتبہ بخشا میں پسند نہیں کرتا کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔[1]

ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کو یا خیر البریۃ (یعنی اے بہترین خلق) کہکر مخاطب کیا، آپ نے فرمایا وہ ابراہیم تھے۔[2]

عبداللہ بن شخیر کا بیان ہے کہ بنی عامر کی سفارت کے ساتھ جب ہم لوگ خدمت اقدس میں آئے تو عرض کی کہ حضور ہمارے آقا (سید) ہیں، ارشاد فرمایا کہ "آقا خدا ہے" پھر ہم لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہم میں سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں، ارشاد ہوا کہ "بات کہو تو دیکھ لو کہ شیطان تو تمکو نہیں چلا رہا ہے"[3]

مدینہ منورہ میں ایک عورت تھی جس کے دماغ میں کچھ فتور تھا، آپ کی خدمت میں آئی، اور کہا کہ محمد! مجھکو تم سے کچھ کام ہے۔ فرمایا جہاں کہو چل سکتا ہوں، وہ آپ کو ایک کوچہ میں لوا گئی اور وہیں بیٹھ گئی، آپ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے، اور جو کام تھا انجام دیدیا۔[4]

مخرمہؓ ایک صحابی تھے، ایک دفعہ انھوں نے اپنے بیٹے مسور سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کہیں سے چادریں آئی ہیں، اور وہ تقسیم فرما رہے ہیں آؤ ہم بھی چلیں، آئے تو آپ زنانہ میں تشریف لیجا چکے تھے کہا آواز دو، انھوں نے کہا میرا یہ رتبہ ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز دوں، مخرمہ نے کہا بیٹے! محمد جبار نہیں ہیں، انکی جرأت دلانے سے مسور نے آواز دی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۵۳ [2] صحیح مسلم باب فضائل ابراہیم [3] ابوداؤد کتاب الادب باب کراہیۃ التمادح [4] ایضاً

نو آنکل آئے اور ان کو دیبا کی قبا عنایت کی جس کی گھنڈیاں زریں تھیں[1]،

ایک دفعہ ایک انصاری نے ایک یہودی کو یہ کہتے سنا کہ اس خدا کی قسم جس نے موسیٰ کو تمام انسانوں پر فضیلت دی، یہ سمجھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تعریض ہے، غصہ میں آکر اس کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارا، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فریادی آیا، آپ نے انصاری کو بلا بھیجا، اور واقعہ کی تحقیق کے بعد فرمایا کہ "مجکو انبیاء پر فضیلت نہ دو"[2]

انسان کے غرور و ترفع کا اصلی موقع وہ ہوتا ہے جب وہ اپنے چپ و راست جلو میں ہزاروں آدمیوں کو چلتے ہوئے دیکھتا ہے، جو اس کے ایک اشارہ پر اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار ہو جاتے ہیں خصوصاً جب وہ فاتحانہ ایک جرار و پرجوش لشکر کے ساتھ شہر میں داخل ہوتا ہو لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تواضع و خاکساری کا منظر اسوقت اور نمایاں ہو جاتا ہو، فتح مکہ کے موقع پر جب آپ شہر میں داخل ہوئے تو تواضعاً سر مبارک کو اس قدر جھکا دیا کہ کجاوہ سے آکر مل گیا،[3] غزوۂ خیبر میں جب آپکا داخلہ ہوا تو آپ ایک گدھے پر سوار تھے، جس میں لگام کی جگہ کھجور کی چھال بندھی تھی[4] (حجۃ الوداع میں جس کجاوہ پر آپ سوار تھے، سن چکے ہو کہ اس کی قیمت کیا تھی)

تعظیم اور مدح مفرط سے روکتے تھے

شرک کا پہلا دیباچہ انبیاء اور صلحا کی مبالغہ آمیز تعظیم ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس نکتہ کا بڑا لحاظ فرماتے تھے حضرت عیسیٰ کی مثال پیش نظر تھی، فرمایا کرتے تھے کہ "میری اسقدر مبالغہ آمیز مدح نہ کیا کرو جسقدر نصاریٰ ابن مریم کی کرتے ہیں، میں تو خدا کا بندہ اور اسکا فرستادہ ہوں[5]"

---

[1] بخاری ص ۱۰۰م [2] بخاری کتاب الانبیاء ذکر موسیٰ [3] شرح شفا قاضی عیاض و سیرت ابن ہشام، مستدرک حاکم ج ۳ ص ۴۷
[4] مشکوٰۃ اخلاق النبی بحوالہ حاکم، ابن ماجہ، بیہقی [5] صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۹۰ کتاب الانبیاء،

Marfat.com

قیس بن سعد کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حیرہ گیا، وہاں لوگوں کو دیکھا کہ رئیس شہر کے دربار میں جاتے ہیں تو اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واقعہ بیان کیا اور عرض کی کہ آپ کو سجدہ کیا جائے تو آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں، آپ نے فرمایا کہ تم میری قبر پر گذرو گے تو سجدہ کرو گے؟ کہا نہیں، فرمایا تو جیتے جی بھی سجدہ نہیں کرنا چاہیے۔[1]

معوذ بن عفراء کی صاحبزادی (ربیع) کی جب شادی ہوئی تو آپ ان کے گھر تشریف لے گئے اور دلہن کے لیے جو فرش بچھایا گیا تھا، اس پر بیٹھ گئے، گھر کی لڑکیاں آس پاس جمع ہو گئیں اور دف بجا بجا کر شہدائے بدر کا مرثیہ گانے لگیں، گاتے گاتے ایک نے یہ مصرع گایا:

فینا نبیٌّ یعلم ما فی غد　　　ہم میں ایک پیغمبر ہے جو کل کی باتیں جانتا ہے

فرمایا "یہ چھوڑ دو اور وہی کہو جو پہلے کہہ رہی تھیں۔"[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؑ نے جس روز انتقال کیا، اتفاق سے اس روز سورج گرہن لگا، لوگوں کے خیال میں ایک پیغمبر کی ظاہری عظمت کا ذوقی تخیل یہ تھا کہ اسکے درد و صدمہ سے کرۂ اجرام سماوی میں انقلاب پیدا ہو جائے، لوگوں نے اس اتفاقی واقعہ کو اسی کے واقعہ پر محمول کیا، ایک جاہ پسند انسان کے لیے اس قسم کا اتفاق بہترین موقع ہو سکتا تھا لیکن نبوت کی شان اس سے بدرجہا ارفع و اعلیٰ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور خطبہ دیا کہ چاند اور سورج میں گرہن لگنا خدا کی آیات قدرت میں ہے، کسی کی زندگی اور موت کی وجہ سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔[3]

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وضو کر رہے تھے، وضو کا پانی جو دست مبارک سے گرتا فدائی

[1] ابوداؤد، کتاب النکاح باب حق الزوج علی المراۃ [2] صحیح مسلم باب ضرب الدف فی النکاح [3] صحیح بخاری و مسلم باب صلوۃ الخسوف۔

برکت کے خیال سے اس کو چلّو میں لیکر بدن میں مل لیتے، آپ نے پوچھا کہ تم یہ کیوں کرتے ہو، انھوں نے عرض کیا کہ خدا اور خدا کے رسول کی محبت میں، فرمایا اگر کوئی اس بات کی خوشی حاصل کرنا چاہے کہ وہ خدا اور خدا کے رسول سے محبت رکھتا ہے تو اس کو چاہیے کہ جب باتیں کرے سچ بولے جب امین بنایا جائے ادائے امانت کرے اور کسی کا پڑوسی ہو تو ہمسایگی کو اچھی طرح نباہے،[1]

ایک صاحب بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے، اثنائے گفتگو میں انھوں نے کہا "جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں"۔ ارشاد ہوا "تم نے خدا کا شریک اور ہمسر ٹھہرایا، کہو کہ جو خدا تنہا چاہے"[2]

شرم وحیا (صحاح میں ہے کہ آپ دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے، اور شرم وحیا کا اثر آپ کی ایک ایک ادا سے ظاہر ہوتا تھا، کبھی کسی کے ساتھ بدزبانی نہیں کی، بازاروں میں جاتے تو چپ چاپ گذر جاتے، تبسم کے سوا کبھی لبِ مبارک خندہ و قہقہہ سے آشنا نہیں ہوئے)

بھری محفل میں کوئی بات ناگوار ہوتی تو لحاظ کی وجہ سے زبان سے کچھ نہ فرماتے، چہرہ کے اثر سے ظاہر ہوتا اور صحابہ متنبہ ہوجاتے،

عرب میں اور ممالک کی طرح شرم وحیا کا بہت کم لحاظ تھا، ننگے نہانا عام بات تھی حرم کعبہ کا طواف ننگے ہوکر کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بالطبع یہ باتیں سخت ناپسند تھیں، ایک دفعہ فرمایا کہ حمام سے پرہیز کرو، لوگوں نے عرض کی کہ حمام میں نہانے سے میل چھوٹتا ہے اور بیماری میں فائدہ ہوتا ہے، ارشاد فرمایا کہ نہاؤ تو پردہ کرلیا کرو، عرب میں حمام نہ تھے لیکن شام وعراق کے جو شہر عرب کی سرحد سے ملے ہوئے تھے، وہاں کثرت سے حمام تھے، اس بنا پر آپ نے فرمایا کہ تم جب عجم فتح کروگے

[1] مشکوٰۃ بحوالہ شعب الایمان بیہقی [2] ادب المفرد امام بخاری ص ۱۵۷، مصر

Marfat.com

تو وہاں حمام ملیں گے، ان میں جانا تو چادر کے ساتھ جانا،

ایک دفعہ کچھ عورتیں حضرت ام سلمہؓ کے پاس آئیں، انھوں نے وطن پوچھا، بولیں حمص (شام کا ایک شہر ہے) حضرت ام سلمہؓ نے کہا تم ہی عورتیں ہو؟ جو حمام میں نہاتی ہیں، بولیں کیا حمام کوئی بری چیز ہے، فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو عورت اپنے گھر کے سوا کسی گھر میں کپڑے اتارتی ہے خدا اسکی پردہ دری کرتا ہے[۱] ابوداؤد میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حمام میں نہانے کو مطلقاً منع کر دیا تھا، پھر مردوں کو پردوں کی قید کیساتھ اجازت دی لیکن عورتوں کے لیے وہی حکم قائم رہا، عرب میں جائے ضرور نہ تھے،[۲] لوگ میدانوں میں رفع حاجت کے لیے جایا کرتے تھے لیکن پردہ نہیں کرتے تھے، بلکہ آمنے سامنے بیٹھ جایا کرتے اور ہر قسم کی بات چیت کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی سخت ممانعت کی اور فرمایا کہ خدا اس سے ناراض ہوتا ہے،[۳]

معمول تھا کہ رفع حاجت کیلیے اسقدر دور نکل جاتے کہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے،

مکہ معظمہ میں جبتک قیام تھا، حدود حرم سے باہر چلے جاتے جس کا فاصلہ مکہ معظمہ سے کم از کم تین میل تھا،

اپنے ہاتھ سے کام کرنا اگرچہ تمام صحابہ آپکے جان نثار خادموں میں داخل تھے، باایں ہمہ آپ خود اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو پسند کرتے تھے حضرت عائشہؓ، ابو سعید خدریؓ اور امام حسنؓ سے روایت ہے کہ کان یخدم نفسہ یعنی آپ اپنے کام خود اپنے دست مبارک سے انجام دیا کرتے تھے، ایک شخص نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ آپ گھر میں کیا کیا کرتے تھے، جواب دیا کہ گھر کے کام کاج میں مصروف

---

[۱] یہ تمام روایتیں ترغیب و ترہیب میں کتب حدیث کے حوالے سے منقول ہیں [۲] صحیح بخاری حدیث افک،

[۳] ابوداؤد و ابن ماجہ [۴] شرح شفائے قاضی عیاض ج ۲ ص ۱۱۶

رہتے تھے، کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے خود پیوند لگا لیتے تھے، گھر میں خود جھاڑو دے لیتے تھے، دودھ دوہ لیتے تھے، بازار سے سودا خرید لاتے تھے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے تھے، ڈول میں ٹانکے لگا دیتے تھے، اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھ دیتے تھے، اس کو چارہ دیتے، غلام کیساتھ ملکر آٹا گوندھتے، [1]

ایک دفعہ حضرت انس بن مالکؓ خدمت مبارک میں حاضر ہوئے تو دیکھا آپ خود اپنے ہاتھ سے ایک اونٹ کے بدن پر تیل مل رہے ہیں، ان سے دوسری روایت ہے کہ انھوں نے دیکھا کہ آپ صدقہ کے اونٹوں کو داغ رہے ہیں، تیسری روایت میں وہ کہتے ہیں کہ آپ بکریوں کو داغ لگا رہے تھے، [2] ایک دفعہ مسجد نبویؐ میں تشریف لے گئے، دیکھا تو مسجد میں کسی نے ناک صاف کی ہے، آپ نے خود دست مبارک سے ایک کنکر لیکر اس کو کھرچ ڈالا، اور آئندہ لوگوں کو اس فعل سے منع فرمایا، [3]

آپ جب بچے تھے اور خانہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی، تو اس وقت بھی پتھر اٹھا اٹھا کر معماروں کے پاس لاتے تھے، [4] مسجد قبا اور مسجد نبویؐ کی تعمیر اور خندق کے کھودنے میں جس طرح عام مزدوروں کیساتھ مل کر آپ نے کام کیا، خود دست مبارک سے جس طرح پتھر اٹھا اٹھا کر دیا اور جس طرح زمین کھودی اسکی تفصیل جلد اول کے واقعات میں گذر چکی ہے، ایک سفر میں صحابہ نے بکری ذبح کی اور اس کو پکانے کے لیے آپس میں کام بانٹ لیے، آپ نے فرمایا "جنگل سے لکڑی میں لاؤں گا" صحابہ نے تامل کیا تو فرمایا "میں

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب (باب ما یکون الرجل فی مھنة اھلہ) میں مجمل ہے، قاضی عیاض نے شفا میں متعدد حدیثوں سے لیکر اور ٹکڑے بھی یہ جمع کر دیئے ہیں، زرقانی نے جلد ۴ ص ۳۰۷ میں مسند احمد و ابن سعد سے یہ روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ ابن حبان نے اسکو صحیح کہا ہے۔ [2] یہ تینوں روایتیں صحیح مسلم میں ہیں، پہلی روایت کتاب الادب میں اور دوسری اور تیسری باب جواز وسم الحیوان میں ہے۔ [3] سنن نسائی کتاب المساجد [4] صحیح بخاری باب الجاہلیة

امتیاز پسند نہیں کرتا" ایک اور سفر میں آپ کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ گیا، آپ نے خود اس کو درست کرنا چاہا، ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ لائیے میں ٹانک دوں، فرمایا "یہ تشخص پسندی ہے جو مجھے محبوب نہیں ہے"[۱] "دو صحابی بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، تو دیکھا کہ آپ خود اپنے دستِ مبارک سے مکان کی مرمت کر رہے ہیں، ہم لوگ بھی اس کام میں شریک ہو گئے جب کام ختم ہو گیا تو آپ نے ہمارے لیے دعائے خیر فرمائی"[۲]

دوسروں کے کام کر دینا (خباب بن ارت[رض] ایک صحابی تھے۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کسی غزوہ پہ بھیجا، خباب کے گھر میں کوئی مرد نہ تھا اور عورتوں کو دودھ دوہنا نہیں آتا تھا، اس بنا پر آپ ہر روز انکے گھر جاتے اور دودھ دوہ دیا کرتے[۳] حبش سے جو مہمان آئے تھے صحابہ نے چاہا کہ وہ انکی خدمت گذاری کریں، لیکن آپ نے انکو روک دیا اور فرمایا کہ "انھوں نے میرے دوستوں کی خدمت کی ہے، اس لیے میں خود انکی خدمتگذاری کا فرض انجام دونگا"[۴] کفار ثقیف جنھوں نے طائف میں آپ کے پائے مبارک کو زخمی کر دیا تھا، سنہ ۹ھ میں وفد لیکر آئے تو آپ نے ان کو مسجد نبوی میں اتارا اور بہ نفس نفیس ان کی مہمانی کے فرائض ادا کیے۔

مدینہ کی لونڈیاں آپ کی خدمت میں آتیں اور کہتیں "یا رسول اللہ میرا یہ کام ہے" آپ فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور ان کا کام کر دیتے[۵] مدینہ میں ایک پاگل لونڈی تھی، وہ ایک دن حاضر ہوئی اور آپ کا دستِ مبارک پکڑ لیا، آپ نے فرمایا "اے عورت! مدینہ کی جس گلی میں تو چاہے بیٹھ میں تیرا کام کر دونگا" چنانچہ آپ اس کے ساتھ مدینہ کی ایک گلی میں جا کر بیٹھے اور اس کی ضرورت پوری کی[۶] عبداللہ بن ابی اوفیٰ[رض] ایک صحابی ہیں، وہ

---

[۱] زرقانی ج ۴ ص ۲۶۳ بحوالہ سیرت محب طبری [۲] ایضاً بحوالہ کتاب شمائل النعل الشریف لابی الیمن بن عساکر [۳] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۳۷۲ [۴] ابن سعد حصہ ہشتم ص ۲۱۰ ترجمہ بنت خباب [۵] شفائے قاضی عیاض بہ سند متصل بحوالہ البیہقی [۶] مسلم اور ابوداؤد اخلاق آداب

فرماتے ہیں،

ولا یانف ان یمشی مع الارملۃ والمسکین	بیوہ اور مسکین کے ساتھ چل کر ان کا کام کر دینے
فیقضی لہ الحاجۃ (نسائی و دارمی)	میں آپ کو عار نہ تھا۔

ایک دفعہ آپ نماز کے لیے کھڑے ہو چکے تھے کہ ایک بدو آیا اور آپ کا دامن پکڑ کر بولا "میرا ذرا سا کام رہ گیا ہے، ایسا نہ ہو کہ میں بھول جاؤں، پہلے اس کو کر دو"۔ آپ اس کے ساتھ فوراً مسجد سے باہر نکل آئے اور اس کا کام انجام دیکر نماز ادا کی[1]

عزم و استقلال خدا نے قرآن مجید میں اولوا العزم من الرسل کہکر انبیاے کبار کی مدح فرمائی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم الرسل تھے، اسلیے خصوصیت کے ساتھ خدا نے یہ وصف آپکی ذات میں ودیعت کیا تھا۔ ابتدا سے انتہا تک اسلام کا ایک ایک کارنامہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم و استقلال کا مظہر اتم ہی، عرب کے کفرستان میں ایک شخص تنہا کھڑا ہوتا ہے، بے یار و مددگار، دعوت حق کی صدائیں بلند کرتا ہی، ریگستان کا ذرہ ذرہ اس کی مخالفت میں پہاڑ بنکر سامنے آتا ہے لیکن وقار نبوت اور عزم ربانی سے ٹھوکر کھا کر پیچھے ہٹ جاتا ہے، اور مخالفتوں کی تمام قوت اس کے سامنے چور چور ہو جاتی ہے،

تیرہ برس کی متواتر ناکامیوں کے بعد بھی ذات اقدس جبین دیاس سے آشنا نہیں ہوتی، اور بالآخر وہ دن آتا ہے جب ایک تنہا انسان ایک لاکھ جان نثاروں کو چھوڑ کر دنیاے فانی کو الوداع کہتا ہے۔

ہجرت سے قبل ایک دفعہ صحابہ نے کفار کی ایذا رسانیوں سے تنگ آکر خدمت مبارک میں عرض کی کہ "آپ ہمارے لیے کیوں دعا نہیں فرماتے"؟ آپکا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور فرمایا "تم سے پہلے جو لوگ گذرنے ہیں

[1] ابو داؤد کتاب الادب و بخاری کتاب الصلوٰۃ، مختصراً

ان کو آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا تھا، ان کے بدن پر لوہے کی کنگھیاں چلائی جاتی تھیں جن سے گوشت پوست علیحدہ ہو جاتا تھا، لیکن یہ آزمائشیں بھی ان کو مذہب سے برگشتہ نہیں کر سکتی تھیں، خدا کی قسم دین اسلام اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ کر رہے گا، یہاں تک کہ صنعاء سے حضر موت تک ایک سوار اس طرح بےخطر چلا آئے گا کہ اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔"[1]

مکہ میں رؤسائے قریش جب ہر قسم کی تدبیروں سے تھک گئے تو انہوں نے آپ کے سامنے حکومت کا تخت، زر و جواہر کا خزانہ اور حسن کی دولت پیش کی، ان میں سے ہر چیز بہادر سے بہادر انسان کے قدم کو ڈگمگا دینے کے لیے کافی تھی، لیکن آپ نے ذلت کے ساتھ ان کی درخواست کو ٹھکرا دیا اور بالآخر وہ وقت آیا جب آخری ہمدم و دمساز یعنی ابو طالب نے بھی ساتھ چھوڑنا چاہا تو یہ عزم و فکر کا آخری لمحہ اور عزم و استقلال کا آخری امتحان تھا، اس وقت آپ نے جواب میں جو فقرے فرمائے، عالم کائنات میں ثبات و پامردی کے اظہار کا سب سے آخری طریقۂ تعبیر ہے، آپ نے فرمایا "چچا جان! اگر قریش میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں میں چاند رکھ دیں تب بھی اپنے اعلان حق سے باز نہ آؤں گا۔" (ابن ہشام)

غزوۂ بدر میں جب تین سو بے سر و سامان مسلم اور ایک ہزار با ساز و سامان فوج سے معرکہ آرا تھے، کفار قریش سیلاب کی طرح بڑھتے آتے تھے، اس وقت مسلمان سمٹ سمٹ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں آ جاتے تھے، اور با ایں ہمہ نبوت کا کوہ وقار اپنی جگہ پر قائم تھا۔[2]

غزوۂ احد میں آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا تو سب نے حملہ کی رائے دی، لیکن جب آپ زرہ پہن کر تیار ہو گئے تو صحابہ نے رک جانے کا مشورہ دیا، آپ نے فرمایا "پیغمبر زرہ پہن کر اتار نہیں سکتا۔"[3]

[1] صحیح بخاری ج ۱ باب ما لقی النبی [2] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۱۲۶ [3] بخاری ج ۲ ص ۱۰۹۵ باب قول اللہ وامرہم شوری بینہم

Marfat.com

غزوۂ حنین میں جب قبیلہ ہوازن کے قدر اندازوں نے متصل تیروں کی بوچھار کی تو اکثر صحابہ کے قدم اکھڑ گئے لیکن آپ نہایت سکون و اطمینان سے چند جاں نثاروں کے ساتھ میدان میں جمے رہے۔ اس وقت زبانِ مبارک پر یہ رجز جاری تھا،

انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب[1] — میں پیغمبر صادق ہوں، میں فرزند عبد المطلب ہوں،

ایک بار آپ کسی غزوہ میں درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے، ایک کافر آیا اور اسی حالتِ خواب میں تلوار کھینچ کر بولا "محمد اب تم کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے" آپ نے فرمایا "خدا" اس عزم و استقلال اور جرأت صادقہ نے اس کو اسقدر مرعوب کر دیا کہ فوراً اس نے تلوار میان میں کر لی اور پاس بیٹھ گیا،[2]

شجاعت | یہ وصف انسانیت کا اعلیٰ جوہر اور اخلاق کا سنگ بنیاد ہے، عزم، استقلال، حق گوئی، راست گفتاری، بے دردی، یہ تمام باتیں شجاعت ہی سے پیدا ہوتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سیکڑوں مصائب و خطرات اور بیسیوں معرکے اور غزوات پیش آئے لیکن کبھی پامردی اور ثباتِ قدم نے لغزش نہیں کھائی، غزوۂ بدر کی گھمسان لڑائی میں، جب نہتے مسلمانوں کے قدم جب اکثر اوقات مسلح فوج کے حملوں سے ڈگمگا جاتے تھے تو در گاہِ نبوت ہی کے دامن میں آکر پناہ لیتے تھے حضرت علیؓ جن کے دست و بازو نے بڑے بڑے معرکے سر کیے، کہتے ہیں کہ جب بدر میں زور کا رن پڑا تو ہم لوگوں نے آپ ہی کی آڑ میں آکر پناہ لی، آپ سب سے زیادہ شجاع تھے، مشرکین کی صف سے اس دن آپ سے زیادہ کوئی قریب نہ تھا۔[3]

غزوۂ حنین میں ہوازن کے بے پناہ تیروں کی بارش ہوئی، تو مسلمانوں کی کثیر التعداد فوج دفعۃً میدان سے ہٹ گئی لیکن آپ مع چند جاں نثاروں کے بدستور میدان میں کھڑے رہے، اس وقت بار بار

---

[1] صحیح بخاری حنین [2] بخاری ج ۲ ص ۵۹۳ غزوۂ ذات الرقاع [3] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۱۲۶

آپ اپنے خچر کو ایڑ لگا کر آگے بڑھانے کا قصد فرما رہے تھے لیکن جان نثار مانع آتے تھے، اب دشمنوں کی تمام فوج کا نشانہ صرف آپ کی ذات تھی۔ باایں ہمہ پائے اقدس میں لغزش نہیں ہوئی۔ حضرت براءؓ جو اس معرکہ میں شریک تھے کسی نے ان سے پوچھا کہ کیا حنین میں تم بھاگ کھڑے ہوئے تھے؟ جواب دیا "ہاں یہ سچ ہے لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تھے۔ خدا کی قسم جب لڑائی پورے زور پر ہوتی تھی تو ہم لوگ آپ ہی کے پہلو میں آکر پناہ لیتے تھے، ہم میں سب سے بڑا بہادر وہ شمار ہوتا تھا، جو آپ کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا"[1]

حضرت انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ شجاع تھے، ایک دفعہ مدینہ میں شور ہوا کہ دشمن آگئے۔ لوگ مقابلہ کے لیے تیار ہوگئے لیکن سب سے پہلے جو آگے بڑھ کر نکلا وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے، جلدی میں آپ نے اس کا بھی انتظار نہیں کیا کہ گھوڑے پر زین کسی جائے، گھوڑے کی برہنہ پشت پر سوار ہو کر آپ تمام خطروں کے مقامات میں گشت لگا آئے اور واپس آکر لوگوں کو تسکین دی کہ کوئی خطرہ کی بات نہیں[2]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کو اپنے دستِ خاص سے قتل نہیں کیا۔ ابی بن خلف آپ کا سخت دشمن تھا، بدر میں فدیہ دے کر رہا ہوا تو ساتھ ساتھ یہ کہتا گیا کہ "میرے پاس ایک گھوڑا ہے جس کو میں ہر روز چوارا کھلایا کرتا ہوں اسی پر چڑھ کر محمد کو قتل کروں گا" احد میں اسی گھوڑے کو اڑاتا اور صفوں کو چیرتا ہوا آپ کے پاس پہنچ گیا، مسلمانوں نے چاہا کہ اس کو بیچ میں روک لیں، آپ نے منع فرمایا اور ایک مسلمان

---

[1] صحیح مسلم غزوۂ حنین [2] صحیح بخاری کے متفرق ابواب میں یہ روایت ہے۔ مثلاً باب الشجاعۃ فی الحرب وباب اذا فزعوا باللیل

کے ہاتھ سے نیزہ لیکر آپ اس کی طرف بڑھے اور آہستہ سے اس کی گردن میں انی چبھودی، وہ چنگھاڑتا ہوا

بھاگا، لوگوں نے کہا یہ تو کوئی بڑا زخم نہیں تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟ اس نے کہا ہاں سچ ہے،

لیکن یہ محمدؐ کے ہاتھ کا زخم ہے)[1]

راست گفتاری | (راست گفتاری پیغمبر کی ایک ضروری صفت ہے، اور اس کا وجود ان کی ذات سے

کبھی منفک نہیں ہو سکتا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے عنوان میں اس کے جزئیات

کی تفصیل کی ضرورت نہ تھی لیکن اس موقع پر ہم صرف ان شہادتوں کو قلمبند کرنا چاہتے ہیں جو دشمنوں کے

اعتراف سے ہاتھ آسکی ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو کفار میں جو لوگ آپ سے واقف تھے، انہوں نے آپکو

کاذب اور دروغ گو یقین نہیں کیا، بلکہ یہ سمجھا کہ نعوذ باللہ آپ کے حواس درست نہیں رہے، یا اب

عقل بجا نہیں رہی ہے، یا یہ کہ ان میں اب شاعرانہ تخیل پرستی آگئی ہے اسی بنا پر انھوں نے

آپ کو مجنون کہا، مسحور کہا، شاعر کہا لیکن کاذب نہیں کہا،

ایک روز قریش کے بڑے بڑے رؤسا جلسہ جمائے بیٹھے تھے، اور آپ کا ذکر ہو رہا تھا،

نضر بن حارث نے جو قریش میں سب سے زیادہ جہاندیدہ تھا، کہا اے قریش! تم پر جو مصیبت آئی ہے

ابتک تم اس کی کوئی تدبیر نہ نکال سکے، محمد تمھارے سامنے بچہ سے جوان ہوا، وہ تم میں سب سے زیادہ

پسندیدہ، صادق القول اور امین تھا، اب جب اسکے بالوں میں سپیدی آچلی اور تمھارے سامنے

یہ باتیں پیش کیں تو کہتے ہو کہ وہ ساحر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے، مجنون ہے، خدا کی قسم میں نے انکی باتیں سنی ہیں،

[1] شرح شفا قاضی عیاض جلد ۲ ص ۲۰۴ بحوالہ بیہقی بسند صحیح و مصنف عبدالرزاق و ابن سعد و واقدی،

Marfat.com

محمد میں یہ کوئی بات نہیں تم پر یہ کوئی مصیبت ہی نئی آئی ہے[1]،

ابو جہل کہا کرتا تھا "محمد! میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا، البتہ جو کچھ کہتے ہو، ان کو صحیح نہیں سمجھتا"

قرآن مجید کی یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی ہے[2]،

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ	ہم جانتے ہیں کہ اے پیغمبر ان کافروں کی باتیں تم کو غمگین
فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ	کرتی ہیں، کیونکہ وہ تجھکو جھٹلاتے نہیں، البتہ یہ ظالم
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (انعام-۴)	اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں،

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشگاہِ الٰہی سے حکم ہوا کہ اپنے اہلِ خاندان کو اسلام کی دعوت دو تو آپ نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر پکارا یا معشر قریش، جب سب لوگ جمع ہوگئے تو فرمایا "اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آرہا ہے، تو تم کو یقین آئے گا" سب نے کہا ہاں، کیونکہ ہم نے تم کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا"[3]

قیصر روم نے دربار میں ابوسفیان سے پوچھا کہ تمہارے ہاں جو مدعی پیدا ہوا ہے، اس دعویٰ سے پہلے کبھی تم نے اس کو دروغ گو بھی پایا، ابوسفیان نے کہا نہیں، آخر میں قیصر نے جو تقریر کی اس میں کہا میں نے تم سے پوچھا کہ تمہارے نزدیک وہ کبھی کذب کا بھی مرتکب ہوا تو تم نے جواب دیا کہ نہیں، مجھے یقین ہے کہ اگر وہ خدا پر افترا باندھتا تو وہ آدمیوں پر افترا باندھنے سے کب باز رہتا[4]

ایفاے عہد

ایفاے عہد آپ کی ایک ایسی عام خصوصیت تھی کہ دشمن بھی اس کا اعتراف کرتے تھے، چنانچہ قیصر نے اپنے دربار میں آپ کے متعلق ابوسفیان سے جو سوالات کیے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ کیا کبھی

[1] ابن ہشام [2] جامع ترمذی تفسیر انعام [3] صحیح بخاری تفسیر سورۂ تبت [4] صحیح بخاری باب بدء الوحی۔

Marfat.com

محمد نے بدعہدی بھی کی ہے؟ ابوسفیان کو مجبوراً یہ جواب دینا پڑا کہ نہیں[1]، وحشی جنھوں نے حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا، اسلام کے ڈر سے شہر بشہر پھرا کرتے تھے، اہل طائف نے مدینہ بھیجنے کیلئے جو وفد مرتب کیا، اس میں ان کا نام بھی تھا لیکن ان کو ڈر تھا کہ کہیں مجھ سے انتقام نہ لیا جائے لیکن خود دشمنوں نے ان کو یقین دلا دیا کہ تم بے خوف و خطر جاؤ، محمد سفراء کو قتل نہیں کرتے، چنانچہ وہ اس اعتماد پر دربار نبوت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے[2] صفوان بن امیہ (قبل اسلام) شدید ترین دشمنوں میں تھے، جب مکہ فتح ہوا تو بھاگ کر یمن کے ارادہ سے جدہ چلے گئے، عمیر بن وہب نے حاضر خدمت ہو کر واقعہ عرض کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمامۂ مبارک عنایت کیا، اور فرمایا کہ یہ صفوان کی امان کی نشانی ہے، عمیر عمامۂ مبارک لیکر صفوان کے پاس پہنچے اور کہا تم کو بھاگنے کی ضرورت نہیں، تمکو امان ہے، جب خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو عرض کی کہ کیا آپ نے مجھے امان دی ہے؟ ارشاد ہوا کہ ہاں، یہ سچ ہے[3]۔

ابورافع ایک غلام تھے، حالت کفر میں قریش کی طرف سے سفیر بنکر مدینہ منورہ آئے، روئے اقدس پر نظر پڑی تو بے اختیار اسلام کی صداقت ان کے دل میں جاگزیں ہو گئی، عرض کی یا رسول اللہ! اب میں کبھی کافروں کے پاس لوٹ کر نہ جاؤں گا، ارشاد ہوا نہ میں عہد شکنی کر سکتا، اور نہ قاصدوں کو اپنے پاس روک سکتا، تم اس وقت واپس جاؤ، اگر وہاں پہنچکر بھی تمھارے دل کی یہی کیفیت باقی رہے تو آجانا، چنانچہ وہ اس وقت واپس گئے، پھر اسلام لائے[4]۔

صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ تھی کہ مکہ سے جو مسلمان ہو کر مدینہ جائے گا وہ اہل مکہ کے مطالبہ پر واپس کر دیا جائے گا، عین اس وقت جب معاہدہ کی شرطیں زیر تحریر تھیں، ابوجندلؓ پابزنجیر

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی [2] صحیح بخاری غزوۂ احد [3] ابن ہشام [4] ابوداؤد باب الوفاء بالعہد

Marfat.com

اہل مکہ کی قید سے بھاگ کر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فریادی ہوئے، تمام مسلمان اس دردانگیز منظر کو دیکھکر تڑپ اٹھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باطمینان تمام ان کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا:

"اے ابوجندل! صبر کرو، ہم بدعہدی نہیں کرسکتے، اللہ تعالیٰ عنقریب تمھارے لیے کوئی راستہ نکالیگا"[1]

نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے کہ عبداللہ بن ابی الحمسا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ معاملہ کیا اور آپ کو بٹھا کر چلے گئے کہ آکر حساب کردیتا ہوں، اتفاق سے ان کو خیال نہ رہا، تین دن کے بعد آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ تشریف رکھتے تھے، ان کو دیکھکر فرمایا میں تین دن سے یہاں تمھارے انتظار میں بیٹھا ہوں۔[2]

غزوۂ بدر میں کافروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد ایک ثلث سے بھی کم تھی، ایسے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدرتی خواہش یہ ہونی چاہیے تھی کہ جسقدر آدمی بڑھ سکیں بہتر ہے لیکن آپ اسوقت بھی ہمہ تن وفا تھے، حذیفہ بن الیمانؓ اور ابوحسیلؓ دو صحابی مکہ سے آرہے تھے، راہ میں کفار نے انکو روکا کہ محمد کے پاس جارہے ہو، انھوں نے انکار کیا، آخر اس شرط پر ان کو رہائی ملی کہ وہ جنگ میں آپ کا ساتھ نہ دیں گے، یہ دونوں صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو صورت حال عرض کی، فرمایا تم دونوں واپس جاؤ، ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے، ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے۔[3]

زہد و قناعت

مصنفین یورپ کا عام خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں تھے پیغمبر تھے، مدینہ پہنچکر پیغمبر سے بادشاہ بن گئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ تمام عرب کے زیرنگیں ہوجانے پر بھی فاقہ کش رہے، صحیح بخاری باب الجہاد میں روایت ہے کہ وفات کے وقت آپ کی زرہ ایک یہودی کے یہاں

[1] صحیح بخاری کتاب الشروط آخری فقرے ابن ہشام میں ہیں [2] ابوداؤد کتاب الادب [3] صحیح مسلم باب الوفا بالعہد جلد ۲ صفحہ ۸۹

تین صاع جو پر گرو تھی، جن کپڑوں میں آپ نے وفات پائی، ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے، یہ وہ زمانہ ہے جب تمام عرب حدود شام سے لیکر عدن تک فتح ہو چکا ہے اور مدینہ کی سرزمین میں زر و سیم کا سیلاب آچکا ہے،

اس میں شبہہ نہیں کہ آپ کی مہمات فرائض میں رہبانیت کا قلع قمع کرنا بھی تھا، جسکی نسبت خدا نے نصاریٰ کو ملامت کی تھی کہ رهبانية ابتدعوها اس بنا پر آپ نے کبھی کبھی اچھے کھانے اور اچھے کپڑے بھی استعمال کیے ہیں، لیکن اصلی میلان طبع زخارف دنیوی سے اجتناب تھا، فرمایا کرتے، فرزند آدم کو ان چند چیزوں کے سوا اور کسی چیز کا حق نہیں، رہنے کے لیے گھر، ستر پوشی کے لیے ایک کپڑا اور شکم سیری کے لیے روکھی سوکھی روٹی اور پانی[1]، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، ولم یطو لہ ثوب قط کبھی آپ کا کوئی کپڑا تہ کرکے نہیں رکھا گیا، یعنی صرف ایک جوڑا کپڑا ہوتا تھا، دوسرا نہیں ہوتا تھا جو تہ کرکے رکھا جا سکتا،

ایک دن حضرت عبداللہ بن عمرؓ گھر کی دیوار کی مرمت کر رہے تھے، اتفاقاً آپ کسی طرف سے آ گئے، پوچھا کیا شغل ہے، عبداللہ بن عمرؓ نے عرض کی دیوار کی مرمت کر رہا ہوں، ارشاد ہوا کہ اتنی مہلت کہاں[2]

گھر میں اکثر فاقہ رہتا تھا اور راتوں کو اکثر آپ اور سارا گھر بھوکا سو رہتا تھا،

كان رسول الله يبيت الليالي المتتابعة	آپ اور آپ کے اہل و عیال متصل کئی کئی رات بھوکے
طاويا هو واهله لا يجدون عشاء[3]	رہ جاتے تھے کیونکہ رات کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا

پیہم دو دو مہینے تک گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، حضرت عائشہؓ نے ایک موقع پر جب یہ واقعہ

[1] جامع ترمذی ابواب الزہد [2] ابن ماجہ کتاب اللباس [3] جامع ترمذی معیشۃ النبی

بیان کیا تو عروہ بن الزبیر نے پوچھا کہ آخر گذارا کس چیز پر تھا؟ بولیں کہ پانی اور کھجور، البتہ ہمسائے کبھی کبھی بکری کا دودھ بھیج دیتے تھے تو پی لیتے تھے[1]، آپ نے تمام عمر کبھی چپاتی کی صورت نہیں دیکھی[2]، جسکو عرب میں حواری اور نقی کہتے ہیں، کبھی نظر سے نہیں گذری، سہل بن سعد جو اس واقعہ کے راوی ہیں ان لوگوں نے پوچھا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چھلنیاں نہ تھیں، بولے نہیں، لوگوں نے کہا آخر پھر آخر کس چیز سے آٹا چھانتے تھے، بولے منہ سے پھونک کر بھوسی اڑا دیتے تھے جو رہ جاتا اسی کو گوندھ کر پکا لیتے[3]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ تمام عمر یعنی مدینہ کے قیام سے وفات تک آپ نے کبھی دو وقت سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی[4]،

فدک اور خیبر وغیرہ کے ذکر میں محدثین اور ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آپ انکی آمدنی سے سال بھر کا خرچ لے لیا کرتے تھے، یہ واقعہ بظاہر روایات مذکورۂ بالا کے مخالف معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت دونوں صحیح ہیں، بے شبہہ آپ بقدر نفقہ آمدنی میں سے لے لیتے، باقی فقراء اور اہل حاجت کو دیدیتے تھے لیکن آپ اپنے لیے جو رکھ لیتے تھے، وہ بھی اہل حاجت کے نذر ہو جاتا تھا، احادیث میں آپکی فاقہ کشی اور تنگدستی کے واقعات نہایت کثرت سے موجود ہیں، چند روایتیں اس موقع پر ہم درج کرتے ہیں،

ایک دفعہ ایک شخص خدمت اقدس میں حاضر ہوا کہ سخت بھوکا ہوں، آپ نے ازواج مطہرات میں کسی کے ہاں کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو بھیجدو، جواب آیا کہ گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں، آپ نے دوسرے گھر کہلا بھیجا، وہاں سے بھی یہی جواب آیا مختصر یہ کہ آٹھ نو گھروں میں سے کہیں پانی کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہ تھی[5]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دن خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ نے شکم کو [illegible]

---

۱ صحیح بخاری کتاب الرقاق ۲ ایضاً ۳ شمائل ۴ ایضاً ۵ صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۹۸ مطبوعہ مصر، صحیح بخاری ص ۵۳۵

سے کسکر باندھا ہے، سبب پوچھا تو حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ بھوک کی وجہ سے، [۱]

حضرت ابوطلحہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ مسجد میں زمین پر لیٹے ہوئے ہیں اور بھوک کی وجہ سے بار بار کروٹیں بدلتے ہیں، [۲]

ایک دفعہ صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فاقہ کشی کی شکایت کی اور پیٹ کھولکر دکھایا کہ پتھر بندھے تھے، آپ نے شکم کھولا تو ایک کے بجائے دو دو پتھر تھے، [۳]

اکثر بھوک کی وجہ سے آواز اس قدر کمزور ہو جاتی تھی کہ صحابہ آپ کی حالت سمجھ جاتے تھے، ایک دن ابوطلحہؓ گھر میں آئے اور بیوی سے کہا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ میں نے ابھی رسول اللہ کو دیکھا انکی آواز کمزور ہو گئی ہے، [۴]

ایک دن بھوک میں ٹھیک دوپہر کے وقت گھر سے نکلے، راہ میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ملے، یہ دونوں صاحب بھی بھوک سے بیتاب تھے، آپ سب کو لیکر حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر آئے ان کا معمول تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دودھ مہیا رکھتے تھے، آج آپ کے آنے میں دیر ہوئی تو انہوں نے بچوں کو کھلادیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر پہنچے تو وہ نخلستان میں چلے گئے تھے، انکی بیوی کو خبر ہوئی تو باہر نکل آئیں اور عرض کی حضور کا آنا مبارک، آپ نے پوچھا ابوایوب کہاں ہیں، نخلستان پاس ہی تھا، وہ آواز سنکر دوڑے آئے اور مرحبا کہکر عرض کی، یہ حضور کے آنے کا وقت نہیں، آپ نے حالت بیان کی، وہ نخلستان میں جاکر کھجوروں کا ایک خوشہ توڑ لائے اور کہا میں گوشت طیار کراتا ہوں، ایک بکری ذبح کی آدھی کا سالن، آدھے کے کباب تیار کرائے، کھانا سامنے لاکر رکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روٹی پر تھوڑا سا گوشت رکھکر فرمایا کہ فاطمہؓ کو بھجوادو کئی دن سے اس کو کھانا نصیب نہیں ہوا ہے، پھر خود صحابہ کے ساتھ مل کر

۱؎ صحیح مسلم ص ۱۹۳ ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً ۴؎ ایضاً ص ۱۹۱

Marfat.com

کھانا نوش فرمایا، متعدد قسم کے کھانے دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور فرمایا کہ خدا نے جو کہا ہے کہ قیامت میں نعیم سے سوال ہوگا وہ یہی چیزیں ہیں[1]۔"

اکثر ایسا ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح کو ازواجِ مطہرات کے پاس تشریف لاتے اور پوچھتے کہ آج کچھ کھانے کو ہے؟ عرض کرتیں نہیں، آپ فرماتے کہ اچھا میں نے روزہ رکھ لیا[2]،

عفو وحلم ارباب سیر نے تصریح کی ہے اور تمام واقعات شاہد ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا بجز اس صورت کے کہ اس نے احکام الٰہی کی تفضیح کی ہو[3]

(جنگ احد کی شکست سے زیادہ رؤسائے طائف کے تحقیر آمیز برتاؤ کی یاد خاطر اقدس پر گراں[4] تھی، تاہم دس برس کے بعد غزوۂ طائف میں جب وہ ایک منجنیق سے مسلمانوں پر پتھر برسا رہے تھے تو دوسری طرف ایک سراپائے حلم وعفو انسان (خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) یہ دعا مانگ رہا تھا کہ خدایا! انھیں سمجھ عطا کر اور ان کو آستانۂ اسلام پر جھکا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، ۹ھ میں جب ان کے وفد[5] مدینہ کا رخ کیا تو آپ نے صحن مسجد میں ان کو مہمان اتارا اور عزت اور حرمت کے ساتھ ان سے پیش آئے[6]

قریش نے آپ کو گالیاں دیں، مارنے کی دھمکی دی، راستوں میں کانٹے بچھائے، [illegible] ڈالیں، گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا، آپ کی شان میں گستاخیاں کیں، نعوذ باللہ کبھی جادوگر کبھی پاگل

---

[1] ترغیب وترہیب ج ۲ ص ۱۷، (یہ واقعہ صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۵۰ میں بھی جزئی اختلافات کے ساتھ مذکور ہے) [2] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۴۹ [3] صحیح بخاری ج ۴ ص ۴۰ کتاب الادب [4] صحیح بخاری بدء الخلق [5] ابو داؤد ذکر طائف و مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۲۱۸

Marfat.com

کبھی شاعر کہا، لیکن آپ نے کبھی ان باتوں پر برہمی ظاہر نہیں فرمائی، عزیب سے غریب آدمی بھی جب کسی مجمع میں جھٹلایا جاتا ہے تو وہ غصہ سے کانپ اٹھتا ہے، ایک عرب جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ذی المجاز کے بازار میں اسلام کی دعوت دیتے ہوئے دیکھا تھا، بیان کرتے ہیں کہ حضور فرما رہے تھے کہ "لوگو لا الٰہ الا اللہ کہو تو نجات پاؤ گے" پیچھے پیچھے ابوجہل تھا وہ آپ پر خاک اڑا کر کہہ رہا تھا، لوگو! اس شخص کی باتیں تمکو اپنے مذہب سے برگشتہ نہ کردیں، یہ یہ چاہتا ہے کہ تم اپنے دیوتاؤں لات وعزیٰ کو چھوڑ دو" راوی کہتا ہے کہ آپ اس حالت میں اس کی طرف مڑکر دیکھتے بھی نہ تھے۔ (مسند احمد جلد ۴ ص ۶۳)

سب سے بڑھ کر طیش اور غضب کا موقع افک کا واقعہ تھا، جبکہ منافقین نے حضرت عائشہؓ صدیقہ کو نعوذ باللہ تہمت لگائی تھی حضرت عائشہؓ آپ کی محبوب ترین ازواج اور حضرت ابوبکرؓ جیسے یار غار اور افضل الصحابہ کی صاحبزادی تھیں، شہر منافقوں سے بھرا پڑا تھا جنھوں نے دم بھر میں اس خبر کو اس طرح پھیلا دیا کہ سارا مدینہ گونج اٹھا، دشمنوں کی شماتت، ناموس کی بدنامی، محبوب کی تفضیح یہ باتیں انسانی صبر وتحمل کے پیمانہ میں نہیں سما سکتیں، تاہم رحمت عالم نے ان سب باتوں کے ساتھ کیا کیا؟ تہمت کا تمامتر بانی رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی تھا، اور آپ کو اس کا بخوبی علم تھا، بااینہمہ آپ نے صرف اسقدر کیا کہ مجمع عام میں منبر پر کھڑے ہوکر فرمایا "مسلمانو! جو شخص میرے ناموس کے متعلق مجھکو ستاتا ہے اس سے میری داد کون لے سکتا ہے" حضرت سعدؓ بن معاذ غصہ سے بیتاب ہوگئے اور اٹھکر کہا میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں، آپ نام بتائیں، تو اس کا سر اڑا دوں، سعدؓ بن عبادہ نے جو عبداللہ ابن ابی کے حلیف تھے مخالفت کی اور اس پر دونوں طرف کے حامی کھڑے ہوگئے، قریب تھا کہ تلواریں کھنچ جائیں، آپ نے دونوں کو ٹھنڈا کیا، واقعہ کی تکذیب خود خدا نے کردی اور تہمت لگانے والوں کو

Marfat.com

شرعی سزا دی گئی، تاہم عبد اللہ بن ابی اس بنا پر چھوڑ دیا گیا کہ اسکو تہمت لگانے کا اقرار نہ تھا اور ثبوت کے لیے شرعی شہادت موجود نہ تھی تہمت لگانے والوں میں جنکو سزا دی گئی، ایک صاحب مسطح بن اثاثہ تھے، انکی معاش کے کفیل حضرت ابوبکرؓ تھے، تہمت لگانے کے جرم میں حضرت ابوبکرؓ نے انکا روزینہ بند کر دیا، اس پر یہ آیت اتری

وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ	تم میں سے جو لوگ صاحب فضیلت اور ذی مقدور ہیں
أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ	انکو یہ قسم نہیں کھانا چاہیے کہ قرابتداروں اور مسکینوں اور
فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ	مجاہدوں سے سلوک نہ کرینگے، تمکو عفو اور درگذر سے کام لینا چاہیے
أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (نور)	کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ خدا تمکو بخشدے اور خدا غفور رحیم ہے

اور حضرت ابوبکرؓ نے انکا روزینہ بدستور جاری کر دیا،

تہمت لگانے والوں میں (جیسا کہ صحیح ترمذی کتاب التفسیر سورۂ نور میں تصریح ہے) حضرت حسانؓ بھی تھے حضرت عائشہؓ کو ان سے جو رنج تھا وہ عفو کی حد سے متجاوز تھا لیکن یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ جب عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہؓ کے سامنے حضرت حسانؓ کو برا کہنا شروع کیا تو حضرت عائشہؓ نے روکدیا کہ یہ (حسانؓ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کفار کو جواب دیتے تھے[۱]

مدینہ کے منافق یہودیوں میں سے لبید بن اعصم نے آپ پر سحر کیا، تاہم آپنے کچھ تعرض نہ فرمایا (حضرت عائشہؓ نے مزید تحقیق کی تحریک کی تو فرمایا میں لوگوں میں شورش نہیں پیدا کرانا چاہتا)[۲]

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے، لین دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ قرض لیا، میعاد ادا میں ابھی کچھ دن باقی تھے، تقاضے کو آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[۱] صحیح بخاری قصۂ افک [۲] صحیح بخاری ص ۸۵۹

چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت سست کہہ کر کہا، عبد المطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو! حضرت عمرؓ غصہ سے بیتاب ہوگئے، اسکی طرف مخاطب ہوکر کہا "او دشمن خدا تو رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے"! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا "عمر! تم سے اور کچھ امید تھی، اسکو سمجھانا چاہیے تھا کہ نرمی سے تقاضا کرے، اور مجھ سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کردوں"۔ یہ فرما کر حضرت عمرؓ کو ارشاد فرمایا کہ قرضہ ادا کر کے بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دیدو،[1]

ایک دفعہ آپ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا تھا اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا، پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا، اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے، حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا، اس گستاخ نے کہا "میں سمجھا مطلب یہ ہے کہ میرا مال یوں ہی اڑالیں اور دام نہ دیں"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناگوار جملے سن کر صرف اسقدر فرمایا کہ "وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنیوالا ہوں"[2]

ایک دفعہ کہیں تشریف لیجا رہے تھے، ایک عورت قبر کے پاس بیٹھی رو رہی تھی، آپ رک گئے، اور اس سے مخاطب ہوکر فرمایا "صبر کرو"۔ وہ آپ کو پہچانتی نہ تھی (گستاخی کیسا تھ) بولی، ہٹو تم کیا جان سکتے ہو کہ مجھ پر کیا کیفیت ہے، آپ چلے آئے، لوگوں نے عورت سے کہا تو نے نہیں پہچانا، وہ رسول اللہؐ تھے، دوڑی ہوئی آئی اور کہا میں حضور کو پہچانتی نہ تھی، ارشاد فرمایا، صبر وہی معتبر ہے جو عین مصیبت کے وقت کیا جائے،[3]

ایک دفعہ حضرت سعد بن عبادہؓ بیمار ہوئے، آپ عیادت کو سواری پر تشریف لے گئے، راہ میں ایک

---

[1] یہ روایت بیہقی، ابن حبان، طبرانی، اور ابونعیم نے روایت کی ہے، اور سیوطی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے، (شرح شفا از شہاب خفاجی) [2] جامع ترمذی کتاب البیوع [3] بخاری کتاب الجنائز،

Marfat.com

جلسہ تھا، آپ ٹھہر گئے، عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا، وہ بھی جلسہ میں موجود تھا، آپ کی سواری کی گرد اڑی تو اس نے چادر ناک پر رکھ لی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا دیکھو گرد نہ اڑاؤ، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریب پہنچے تو اس نے کہا "محمد اپنا گدھا ہٹاؤ، تمھارے گدھے کی بدبو نے میرا دماغ پریشان کر دیا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کیا، پھر سواری سے اترے اور اسلام کی دعوت دی، عبداللہ بن ابی نے کہا "ہمارے گھر آکر ہم کو نہ ستاؤ، جو شخص خود تمھارے پاس جائے اس کو تعلیم دو" عبداللہ بن رواحہؓ جو مشہور شاعر تھے انھوں نے کہا آپ ضرور تشریف لائیں، بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ قریب تھا کہ تلواریں نکل آئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں فریق کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا) جلسہ سے اٹھ کر آپ سعد ابنؓ عبادہ کے پاس آئے اور ان سے کہا، تم نے عبداللہ کی باتیں سنیں، سعد بنؓ عبادہ نے عرض کی کہ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں، یہ وہ شخص ہے کہ آپ کی تشریف آوری سے پہلے اہل مدینہ نے اس کیلیے ریاست کا تاج تیار کر لیا تھا[۱]

غزوۂ حنین میں آپ نے مال غنیمت تقسیم فرمایا تو ایک انصاری نے کہا "یہ تقسیم خدا کی رضامندی کے لیے نہیں ہے" آپ نے سنا تو فرمایا "خدا موسیٰ پر رحم کرے، ان کو لوگوں نے اس سے بھی زیادہ ستایا تھا"[۲]

ایک دفعہ ایک بدو خدمت اقدس میں آیا، آپ مسجد میں تشریف رکھتے تھے، اسکو پیشاب کی حاجت معلوم ہوئی، آداب مسجد سے واقف نہ تھا، وہیں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا، لوگ ہر طرف سے دوڑ پڑے کہ اس کو سزا دیں، آپ نے فرمایا "جانے دو، اور پانی کا ایک ڈول لاکر بہا دو، خدا نے تم لوگوں کو دشواری کے لیے نہیں، بلکہ آسانی کے لیے بھیجا ہے"[۳]

حضرت انسؓ جو خادم خاص تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھکو کسی کام کیلئے

---

[۱] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۹۲۴ [۲] صحیح بخاری غزوۂ حنین صفحہ ۶۲۱ [۳] صحیح بخاری صفحہ ۳۵

Marfat.com

بھیجنا چاہا، میں نے کہا نہ جاؤں گا، آپ چپ رہ گئے، میں یہ کہکر باہر چلا گیا، دفعۃً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے سے آکر میری گردن پکڑلی، میں نے مڑکر دیکھا تو آپ ہنس رہے ہیں، پھر پیار سے فرمایا "انیس! جس کام کیلیے کہا تھا اب تو جاؤ" میں نے عرض کی اچھا جاتا ہوں، حضرت انسؓ نے اسی واقعہ کے ساتھ بیان کیا کہ میں نے سات برس آپ کی ملازمت کی کبھی یہ نہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا، یا یہ کیوں نہیں کیا،[1]

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ کی عادت تھی کہ ہم لوگوں کے ساتھ مسجد میں بیٹھ جاتے اور باتیں کرتے، جب اٹھ کر گھر میں جاتے تو ہم لوگ بھی چلے جاتے، ایک دن حسب معمول مسجد سے نکلے، ایک بدو آیا، اور اس نے آپ کی چادر اس زور سے پکڑ کر کھینچی کہ آپ کی گردن سرخ ہوگئی، آپ نے مڑکر اس کی طرف دیکھا، بولا کہ میرے اونٹوں کو غلے سے لاد دے، تیرے پاس جو مال ہے وہ نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے، آپ نے فرمایا پہلے میری گردن کا بدلہ دو تب غلہ دیا جائیگا، وہ بار بار کہتا تھا کہ خدا کی قسم میں ہرگز بدلہ نہ دوں گا، آپ نے اسکے اونٹوں پر جو اور کھجوریں لدوا دیں اور کچھ تعرض نہ فرمایا،[2]

(قریش نعوذ باللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے تھے، برا بھلا کہتے تھے، ضد سے آپکو محمد (تعریف کیا گیا) نہیں کہتے تھے، بلکہ مذمم (مذمت کیا گیا) کہتے تھے، لیکن آپ اس کے جواب میں اپنے دوستوں کو خطاب کرکے صرف اسی قدر فرمایا کرتے کہ تمھیں تعجب نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ قریش کی گالیوں کو مجھ سے کیونکر پھیرتا ہے، وہ مذمم کو گالیاں دیتے ہیں اور مذمم پر لعنت بھیجتے ہیں اور میں محمد ہوں"[3]

جس زمانہ میں آپ فتح مکہ کیلیے تیاریاں کر رہے تھے، اس بات کی خاص احتیاط فرما رہے تھے، کہ قریش کو ہمارے ارادوں کی خبر نہ ہو، حاطب بن بلتعہؓ ایک صحابی تھے، انھوں نے چاہا کہ قریش کو

---

[1] صحیح مسلم وابوداؤد کتاب الادب [2] ابوداؤد کتاب الادب یہی واقعہ حضرت انسؓ سے بخاری ومسلم میں مروی ہے بتغیر یسیر، [3] مشکوٰۃ باب اسماء النبیؐ

اسکی اطلاع کردیں، چنانچہ ایک خط لکھکر انھوں نے چپکے سے ایک عورت کی معرفت مکہ روانہ کیا، آپ کو اسکی خبر ہوگئی، حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ اسی وقت بھیجے گئے، جو قاصد کو مع خط کے گرفتار کر لائے، حاطب کو بلاکر دریافت کیا تو انھوں نے صاف صاف اپنے قصور کا اعتراف کیا، اور معذرت چاہی، یہ موقع تھا کہ ہر سیاست داں مجرم کی سزا کا فتویٰ دیتا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے انکو معاف فرمایا کہ وہ شرکائے بدر میں سے تھے، عورت جو اس جرم میں شریک تھی اس سے بھی کسی قسم کا تعرض نہیں فرمایا[1]، حالانکہ یہ خط اگر دشمنوں تک پہنچ جاتا تو مسلمانوں کو سخت خطرات کا سامنا ہو جاتا،

فرات بن حیان ایک شخص تھا، ابوسفیان کی طرف سے مسلمانوں کی جاسوسی پر مامور تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار کہا کرتا تھا، ایک دفعہ وہ پکڑا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم دیا، لوگ اسکو پکڑ کر لیچلے جب انصار کے ایک محلہ میں پہنچا تو بولا کہ میں مسلمان ہوں، ایک انصاری نے آکر اطلاع دی کہ وہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، آپنے فرمایا کہ تم میں کچھ لوگ ایسے ہیں جنکے ایمان کا حال ہم ان ہی پر چھوڑتے ہیں، انہیں سے ایک فرات بن حیان ہے[2]، مورخین نے لکھا ہے کہ وہ بعد کو صدق دل سے مسلمان ہوگئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو یمامہ میں ایک زمین عنایت فرمائی جس کی آمدنی ۴۰۰۰ تھی[3])

دشمنوں سے عفو و درگذر اور حسن سلوک

(انسان کے ذخیرۂ اخلاق میں سب سے زیادہ کمیاب، نادر الوجود چیز دشمنوں پر رحم اور ان سے عفو و درگذر ہے لیکن حامل وحی و نبوت کی ذات اقدس میں یہ جنس فراواں تھی، دشمن سے انتقام لینا انسان کا قانونی فرض ہے لیکن اخلاق کے دائرۂ شریعت میں آکر یہ فرض عزیمت مکروہ تحریمی

[1] صحیح بخاری فتح مکہ [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب الجاسوس الذمی، یہ حدیث سفیان ثوری کے واسطہ سے دو طریقوں سے مروی ہے، ایک میں ابو ہمام الدلال ہیں اور یہی ابوداؤد کا طریق ہے، یہ طریق ضعیف ہے، دوسرا طریق بشر بن سری البصری کے ذریعہ سے ہے، جو صحیح ہے، امام احمد نے بھی مسند میں یہ روایت نقل کی ہے [3] اصابہ ترجمۂ فرات مذکور

Marfat.com

بچاتی ہو، تمام روایتیں اس بات پر متفق ہیں کہ آپ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا،

دشمنوں سے انتقام کا سب سے بڑا موقع فتحِ حرم کا دن تھا، جبکہ وہ کینہ خواہ سامنے آئے، جو آنحضرتؐ کے خون کے پیاسے تھے، اور جن کے دستِ ستم سے آپ نے طرح طرح کی اذیتیں اٹھائی تھیں لیکن ان سب کو یہ کہکر چھوڑ دیا۔

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء — تم پر کوئی ملامت نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو،

وحشیؓ جو اسلام کے قوت بازو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز ترین چچا حضرت حمزہؓ کا قاتل تھا، مکہ میں رہتا تھا جب مکہ میں اسلام کی قوت نے ظہور کیا، وہ بھاگ کر طائف آیا، طائف نے بھی آخر سر اطاعت خم کیا، اور وحشی کے لیے یہ بھی امن نہ رہا، لیکن اس نے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفراء سے کبھی سختی کے ساتھ پیش نہیں آتے، ناچار خود رحمت عالم کے دامن میں پناہ لی، اور اسلام قبول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف استفسار فرمایا کہ "میرے سامنے نہ آیا کرنا کہ تم کو دیکھکر مجھے چچا کی یاد آتی ہے"[1]

ہندہ ابوسفیان کی بیوی جس نے حضرت حمزہؓ کا سینہ چاک کیا اور دل و جگر کے ٹکڑے کیے، فتح مکہ کے دن نقاب پوش آئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہچان نہ سکیں، اور بیعت میں بیعت اسلام کرکے سند امان حاصل کرلے پھر اس موقع پر بھی گستاخی سے باز نہ آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہندہ کو پہچان لیا لیکن اس واقعہ کا ذکر تک نہ فرمایا، ہندہ اس کرشمہ اعجاز سے متاثر ہوکر بے اختیار بول اٹھی یا رسول اللہ! آپ کے خیمہ سے مبغوض تر خیمہ کوئی میری نگاہ میں نہ تھا لیکن آج آپ کے خیمہ سے کوئی زیادہ محبوب خیمہ میری نگاہ میں دوسرا نہیں"[2]

عکرمہ دشمنِ اسلام ابوجہل کے فرزند تھے، اور اسلام سے پہلے باپ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] صحیح بخاری قتل حمزہ [2] صحیح بخاری ذکر ہندہ

سخت ترین دشمن تھے، فتح مکہ کے وقت مکہ سے بھاگ کر یمن چلے گئے انکی بیوی مسلمان ہو چکی تھیں وہ یمن گئیں اور عکرمہ کو تسکین دی اور ان کو مسلمان کیا اور خدمت اقدس میں لیکر حاضر ہوئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو دیکھا تو فرط مسرت سے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے ان کی طرف بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی،[1] اور زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے،

مرحبا بالراکب المھاجر[2] اے ہجرت کرنے والے سوار تمہارا آنا مبارک ہو،

صفوان بن امیہ، قریش کے رؤسائے کفر میں سے اور اسلام کے شدید ترین دشمن تھے، ان ہی نے عمیر بن وہب کو انعام کے وعدہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل پر مامور کیا تھا جب مکہ فتح ہوا تو اسلام کے ڈر سے جدہ بھاگ گئے اور قصد کیا کہ سمندر کے راستہ سے یمن چلے جائیں، عمیر بن وہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! صفوان بن امیہ اپنے قبیلہ کے رئیس ہیں، وہ ڈر سے بھاگ گئے ہیں کہ اپنے کو سمندر میں ڈالدیں، ارشاد ہوا کہ اسکو امان ہے عرض کی یا رسول اللہ! امان کی کوئی نشانی مرحمت فرمایئے جسکو دیکھکر انکو میرا اعتبار آئے، آپ نے عمامہ مبارک انکو عنایت فرمایا جسکو لیکر وہ صفوان کے پاس پہنچے صفوان نے کہا مجھے وہاں جانے میں اپنی جان کا ڈر ہے عمیر نے جواب دیا "صفوان! ابھی تمھیں محمدؐ کے حلم و عفو کا حال معلوم نہیں" یہ سنکر وہ عمیر کیساتھ دربار نبوی میں حاضر ہوئے اور سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ عمیر کہتے ہیں کہ تم نے مجھے امان دیا ہے، فرمایا سچ ہے، صفوان نے کہا "تو مجھے دو مہینے کی مہلت دو" ارشاد ہوا کہ "دو نہیں تم کو چار مہینے کی مہلت دیجاتی ہے" اس کے بعد وہ اپنی خوشی سے مسلمان ہو گئے، یہ واقعہ بہ تفصیل ابن ہشام میں مذکور ہے۔

---

[1] موطا امام مالک کتاب النکاح [2] مشکوٰۃ کتاب الادب بحوالہ ترمذی،

Marfat.com

ہبار بن الاسود وہ شخص تھا جس کے ہاتھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی زینب کو سخت تکلیف پہنچی تھی حضرت زینب حاملہ تھیں اور مکہ سے مدینہ ہجرت کر رہی تھیں، کفار نے مزاحمت کی، ہبار بن الاسود نے جان بوجھ کر ان کو اونٹ سے گرا دیا جس سے ان کو سخت چوٹ آئی اور حمل ساقط ہوگیا، اسکے علاوہ اور بھی بعض جرائم کا وہ مرتکب ہوا تھا، اور اسی بنا پر فتح مکہ کے وقت ہبار اشتہاریان قتل میں داخل تھا، چاہا کہ بھاگ کر ایران چلا جائے کہ داعی ہدایت نے خود آستانہ نبوت کی طرف جھکا دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ میں بھاگ کر ایران چلا جانا چاہتا تھا لیکن پھر مجھے حضورؐ کے احسانات اور حلم و عفو یاد آئے، میری نسبت آپ کو جو خبریں پہنچی تھیں وہ صحیح تھیں، مجھے اپنی جہالت اور قصور کا اعتراف ہے، اب اسلام سے مشرف ہونے آیا ہوں، دفعۃً باب رحمت وا تھا، اور دوست و دشمن کی تمیز یکسر مفقود تھی،[1]

ابوسفیان اسلام سے پہلے جیسے کچھ تھے، غزواتِ نبویؐ کا ایک ایک حرف اس کا شاہد ہے بدر سے لیکر فتح مکہ تک جتنی لڑائیاں اسلام کو لڑنی پڑیں اُن میں سے اکثر میں ان کا ہاتھ تھا، لیکن فتح مکہ کے موقع پر جب وہ گرفتار کر کے لائے گئے اور حضرت عباسؓ ان کو لیکر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ ان کے ساتھ محبت سے پیش آئے، حضرت عمرؓ نے گذشتہ جرائم کی پاداش میں ان کے قتل کا ارادہ کیا لیکن آپ نے منع فرمایا، اور نہ صرف یہ بلکہ ان کے گھر کو امن و امان کا حرم بنا دیا، فرمایا کہ "جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس کا قصور معاف ہوگا"[2] کیا دنیا کے کسی فاتح نے اپنے دشمن کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہے؟

---

[1] ابن اسحٰق و اصابہ ذکر ہبار [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم فتح مکہ مع فتح الباری،

عرب کا ایک ایک قبیلہ اطاعت کیشانہ اسلام کے پرچم کے نیچے جمع ہو رہا تھا، اگر کسی قبیلہ نے آخر تک سرتابی کی تو وہ بنو حنیفہ کا قبیلہ تھا جس میں مسیلمہ نے ادعائے نبوت کیا تھا، ثمامہ ابن اثال اس قبیلہ کے رؤسا میں تھا، اتفاق سے وہ مسلمانوں کے ہاتھ لگ گیا، گرفتار کر کے مدینہ لے آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اسکو مسجد کے ستون میں باندھ دیا جائے، اس کے بعد آپ مسجد میں تشریف لائے اور اس سے دریافت کیا کہ کیا کہتے ہو، اس نے کہا "اے محمد! اگر تم مجھے قتل کروگے تو ایک خونی کو کروگے، اور اگر احسان کروگے تو ایک شکرگذار پر احسان ہوگا۔ اور اگر زر فدیہ چاہتے ہو تو تم مانگو میں دونگا" یہ جواب سنکر آپ خاموش رہے، دوسرے دن پھر یہی تقریر ہوئی، تیسرے دن بھی جب اس نے یہی جواب دیا تو آپ نے حکم دیا کہ ثمامہ کی رسی کھول دو اور آزاد کر دو، ثمامہ پر اس خلافِ توقع لطف و عنایت کا یہ اثر ہوا کہ قریب ایک درخت کی آڑ میں جا کر غسل کیا اور مسجد میں واپس آکر کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوگیا اور عرض کی یا رسول اللہ! دنیا میں کوئی شخص میری نظر میں آپ سے زیادہ مبغوض نہ تھا اور اب آپ سے زیادہ دنیا میں مجھے کوئی محبوب نہیں، کوئی مذہب آپ کے مذہب سے زیادہ میری آنکھوں میں برا نہ تھا، اب وہی سب سے زیادہ پیارا ہے، کوئی شہر آپ کے شہر سے زیادہ ناپسند نہ تھا، اور اب وہی پسندیدہ ہے"

قریش کی ستمگری و جفاگری کی داستان دہرانے کی ضرورت نہیں، یاد ہوگا کہ شعب ابی طالب میں تین برس تک ان ظالموں نے آپ کو اور آپ کے خاندان کو اس طرح محصور کر رکھا تھا کہ غلہ کا ایک دانہ اندر پہنچ نہیں سکتا تھا، بچے بھوک سے روتے اور تڑپتے تھے اور یہ بے درد انکی آوازیں سنکر ہنستے اور خوش ہوتے تھے، لیکن معلوم ہے کہ رحمت عالم نے اس کے معاوضہ میں قریش کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ مکہ میں غلہ یمامہ سے آتا تھا، یمامہ کے رئیس یہی ثمامہ بن اثال تھے مسلمان ہوکر جب یہ

Marfat.com

مکہ گئے تو قریش نے تبدیل مذہب پر ان کو طعنہ دیا، انھوں نے غصہ سے کہا کہ "خدا کی قسم اب رسول اللہ کی اجازت کے بغیر گیہوں کا ایک دانہ نہیں ملے گا" اس بندش سے مکہ میں اناج کا کال پڑ گیا، آخر گھبرا کر قریش نے اس آستانہ کی طرف رجوع کیا جس سے کوئی سائل کبھی محروم نہیں گیا، حضورؐ کو رحم آیا اور کہلا بھیجا کہ بندش اٹھا لو، چنانچہ پھر حسب دستور غلہ جانے لگا۔[1]

کفار اور مشرکین کے ساتھ برتاؤ

کفار کے ساتھ آپ کے حسن خلق کے بہت سے واقعات مذکور ہیں لیکن مورخین یورپ مدعی ہیں کہ یہ اس وقت تک کے واقعات ہیں جب تک اسلام ضعیف تھا، اور مجاملت اور لطف و آشتی کے سوا چارہ نہ تھا، اس لیے ہم اس عنوان کے نیچے صرف وہ واقعات نقل کرینگے جو اس زمانہ کے ہیں جبکہ مخالفین کی قوتیں پامال ہو چکی تھیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا اقتدار حاصل ہو چکا تھا

(ابو بصرہ غفاری کا بیان ہے کہ جب وہ کافر تھے، مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر مہمان رہے رات کو گھر کی تمام بکریوں کا دودھ پی گئے، لیکن آپ نے کچھ نہ فرمایا، رات بھر تمام اہلبیت نبویؐ بھوکا رہا،[2]

اسی طرح ایک اور واقعہ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں، شب کو ایک کافر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مہمان ہوا، آپ نے ایک بکری کا دودھ اس کے سامنے پیش کیا، وہ پی گیا، پھر دوسری بکری دوہی گئی وہ دودھ بھی بے تامل پی گیا، پھر تیسری، پھر چوتھی، یہاں تک کہ سات بکریاں دوہی گئیں اور وہ سب دودھ پیتا چلا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی تنغص ظاہر نہ فرمایا، شاید اسی حسن اخلاق کا اثر تھا کہ وہ صبح کو مسلمان تھا اور صرف ایک بکری کے دودھ پر قانع ہو گیا۔[3]

---

[1] ثمامہ کا پورا واقعہ صحیح بخاری ص ۶۲۷ (باب وفد بنی حنیفہ) میں ہے، آخری ٹکڑا ابن ہشام میں مذکور ہے،

[2] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۳۹۷ [3] جامع ترمذی باب ان المومن یاکل فی معاء واحد،

Marfat.com

حضرت اسماءؓ بیان کرتی ہیں کہ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں ان کی ماں جو مشرکہ تھیں، اعانت خواہ[۱] مدینہ حضرت اسماءؓ کے پاس آئیں، ان کو خیال ہوا کہ اہل شرک کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر دریافت کیا، آپ نے فرمایا "ان کے ساتھ نیکی کرو"۔ حضرت ابوہریرہؓ کی ماں کافرہ تھیں اور بیٹے کے ساتھ مدینہ میں رہتی تھیں، جہالت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتی تھیں، ابوہریرہؓ نے خدمت اقدس میں عرض کی، آپ نے بجائے غیظ و غضب کے دعا کیلیے ہاتھ اٹھائے۔[۲]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا تمام کاروبار حضرت بلالؓ کے سپرد تھا، روپیہ پیسہ جو کچھ آتا تھا ان کے پاس رہتا، ناداری کی حالت میں وہ بازار سے سودا سلف قرض لاتے اور جب کہیں سے کوئی رقم آجاتی تو اس سے ادا کر دیا کرتے، ایک دفعہ بازار جارہے تھے، ایک مشرک نے دیکھا ان سے کہا تم قرض لیتے ہو تو مجھ سے لیا کرو، انھوں نے قبول کیا، ایک دن اذان دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو وہ مشرک چند سوداگروں کے ساتھ آیا اور ان سے کہا "او حبشی!" انھوں نے اس بدتہذیبی کے جواب میں "لبیک" کہا، بولا "کچھ خبر ہے؟ وعدہ کے صرف چار دن رہ گئی ہیں تم نے اس مدت میں قرضہ ادا نہ کیا تو تم سے بکریاں چرواکے چھوڑوں گا"۔ یہ عشاء پڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور سارا حال بیان کرکے کہا کہ خزانہ میں کچھ نہیں ہے، کل وہ مشرک آکر مجکو فضیحت کریگا، اسلیے مجکو اجازت ہو کہ میں کہیں نکل جاؤں، پھر جب قرضہ ادا کرنے کا سامان ہو جائیگا تو واپس آجاؤنگا، غرض رات کو جاکر سو رہے اور سامان سفر یعنی تھیلا، جوتی، ڈھال سر کے نیچے رکھ لی، صبح اٹھکر سفر کا سامان کر رہے تھے کہ ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یاد فرمایا ہے، یہ گئے تو دیکھا کہ

---

[۱] صحیح بخاری باب صلۃ الوالد المشرک [۲] صحیح بخاری

چار اونٹ غلہ سے لدے ہوئے دروازہ پر کھڑے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مبارک ہو یہ اونٹ رئیس فدک نے بھیجے ہیں، انھوں نے بازار میں جاکر سب چیزیں فروخت کیں، اور مشرک کا قرضہ ادا کر کے مسجد نبوی میں آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ سارا قرضہ ادا ہو گیا،[۱]

یہ واقعہ فدک کی فتح کے بعد کا ہے، جو ہجرت کا ساتواں سال ہے، حضرت بلالؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب خاص اور گھر کے منتظم تھے، ایک مشرک انکو حبشی کہکر پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ "تجھ سے بکریاں چرواکے چھوڑوں گا" حضرت بلالؓ اس کی تنگ گیری کے ڈر سے بھاگ جانے کا ارادہ کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ باتیں سنتے ہیں لیکن مشرک کی نسبت ایک لفظ نہیں فرماتے، نہ بلالؓ کی کی حمایت اور دلدہی کی تدبیر کرتے، اتفاق سے غلہ آجاتا ہے اور مشرک کا قرضہ ادا کیا جاتا ہے اور اسکی بد زبانی اور سخت گیری سے درگذر کیجاتی ہے، یہ حلم، یہ عفو، یہ تحمل رحمت عالم کے سوا کس سے ہو سکتا ہے؟

سب سے مشکل معاملہ **منافقین** کا تھا، یہ کفار کا ایک گروہ تھا، جس کا رئیس عبداللہ بن ابی تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں مدینہ میں تشریف لائے، اس سے کچھ پہلے تمام شہر نے اس پر اتفاق کر لیا تھا کہ وہ مدینہ کا فرمانروا بنا دیا جائے، جنگ بدر کے بعد اس نے اسلام کا اعلان کیا لیکن دل سے کافر تھا، اس کے پیرو بھی اسی قسم کا منافقانہ اسلام لائے اور منافقین کی ایک مستقل جماعت قائم ہو گئی، یہ لوگ درپردہ اسلام کے خلاف ہر قسم کی تدبیریں کرتے تھے، **قریش** اور دیگر مخالف قبائل سے ساز رکھتے، ان کو مسلمانوں کے مخفی رازوں کی خبر دیتے رہتے، باایں ہمہ بظاہر اسلام کے مراسم ادا کرتے، جمعہ جماعت میں شریک ہوتے اور لڑائیوں میں ساتھ جاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انکے حالات ایک ایک

[۱] ابوداؤد جلد ۲ باب قبول ہدایا المشرکین

کے نام ونشان سے واقف تھے لیکن چونکہ شریعت اور قانون کے احکام، دلوں کے اسرار سے نہیں، بلکہ ظاہری اعمال سے متعلق ہیں، اس لیے آپ ان پر کفر کے احکام جاری نہیں فرماتے تھے، یہاں تک تو شریعت اور قانون کا معاملہ تھا، لیکن فیاض دلی اور عفو وحلم کے اقتضا سے آپ ان سے ہمیشہ حسن اخلاق کا بھی برتاؤ کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک غزوہ میں ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مارا، انصاری نے کہا "یا للانصار (یعنی انصار کی دہائی)" مہاجر نے بھی مہاجرین کی دہائی دی، قریب تھا کہ دونوں میں تلوار چل جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ کیا جاہلیت کی باتیں ہیں" دونوں رک گئے، دونو . . . .
عبداللہ بن ابی نے سنا تو کہا "مدینہ چل کر ذلیل مسلمانوں کو نکال دونگا" ساتھیوں سے کہا آسان بات یہ کہ تم لوگ مہاجرین کی خبرگیری سے ہاتھ اٹھالو، یہ خود تباہ ہو جائینگے چنانچہ قرآن مجید میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِنْدَ	یہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ پیغمبر کے ساتھیوں پر خرچ
رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنْفَضُّوا (منافقون)	نہ کرو تاکہ وہ منتشر ہو جائیں،
يَقُولُونَ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ	کہتے ہیں کہ جب ہم مدینہ کو واپس جائیں گے تو معزز
الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ (منافقون)	لوگ کمینوں کو مدینہ سے نکال دیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کو بلا بھیجا کہ تم نے یہ الفاظ کہے تھے، وہ بالکل صاف انکار کر گیا حضرت عمرؓ موجود تھے، بولے یا رسول اللہ اجازت دیجئے کہ اس منافق کی گردن مار دوں، آپ نے فرمایا لوگ چرچا کریں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔[1]

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورہ منافقون۔

جنگ بدر میں عبد اللہ بن ابی عین لڑائی کے پیش آنے کے وقت تین سو آدمیوں کے ساتھ واپس چلا آیا جس سے مسلمانوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا، تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے درگذر فرمایا (اور وہ جب مرا تو اس احسان کے معاوضہ میں کہ حضرت عباسؓ کو اس نے اپنا کرتہ دیا تھا، مسلمانوں کی ناراضی کے باوجود آپ نے اپنا قمیص مبارک اس کو پہنا کر دفن کیا[1])

یہود و نصاریٰ کے ساتھ برتاؤ

خلق عمیم میں کافر و مسلم، دوست دشمن، عزیز و بیگانہ کی تمیز نہ تھی، ابر رحمت دشت و چمن پر یکساں برستا تھا (یہود کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس شدت کی عداوت تھی، اس کی شہادت غزوۂ خیبر تک کے ایک ایک واقعہ سے ملتی ہے، لیکن آپ کا طرز عمل مدت تک یہ رہا کہ جن امور کی نسبت مستقل حکم نازل نہ ہوتا، آپ ان میں ان ہی کی تقلید فرماتے[2])

ایک دفعہ ایک یہودی نے برسر بازار کہا "قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ کو تمام انبیاء پر فضیلت دی" ایک صحابی کھڑے سن رہے تھے، ان سے رہا نہ گیا، انھوں نے پوچھا کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی؟ اس نے کہا "ہاں" انھوں نے غصہ میں ایک تھپڑ اس کے مار دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل اور اخلاق پر دشمنوں کو بھی اس درجہ اعتبار تھا کہ وہ یہودی سیدھا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور واقعہ عرض کیا، آپ نے ان صحابی پر برہمی ظاہر فرمائی،[3]

(ایک یہودی کا لڑکا بیمار ہوا تو آپ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے اور اسکو اسلام کی دعوت دی، اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، گویا باپ کی رضامندی دریافت کی، اس نے کہا کہ آپ جو فرماتے ہیں اس کو بجا لا" چنانچہ اس نے کلمہ پڑھا[4]

[1] بخاری میں یہ واقعہ متعدد روایتوں اور متعدد طریقوں سے منقول ہے [2] و [3] صحیح بخاری [4] صحیح بخاری کتاب الجنائز،

ایک دفعہ سرِ راہ ایک یہودی کا جنازہ گذرا تو آپ کھڑے ہو گئے،[1]

ایک دفعہ چند یہودی آپ کی خدمت میں آئے، اور شرارت سے سلام علیکم کے بجائے السام علیکم (تم پر موت) کہا حضرت عائشہؓ نے غصہ میں آکر ان کو بھی سخت جواب دیا لیکن آپ نے روکا اور فرمایا

"عائشہ بدزبان نہ بنو، نرمی کرو، اللہ تعالیٰ ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے"[2]

یہودیوں کے ساتھ داد و ستد کرتے تھے، ان کے سخت و ناجائز تقاضوں اور درشت کلمات کو برداشت کرتے تھے، یہودیوں اور مسلمانوں میں اگر معاملات میں اختلاف پیش آتا تو مسلمانوں کی بلاوجہ جنبہ داری نہ فرماتے، چنانچہ اس قسم کی متعدد مثالیں دوسرے عنوانات میں مذکور ہیں، ایک دفعہ ایک یہودی نے آکر شکایت کی کہ "محمد! دیکھو ایک مسلمان نے مجھکو تھپڑ مارا ہے" آپ نے اس مسلمان کو اسی وقت بلوا کر زجر فرمایا،

نصاریٰ کا وفد جب نجران سے مدینہ حاضر ہوا تو آپ نے اسکی مہمانداری کی مسجد نبوی میں ان کو جگہ دی بلکہ ان کو اپنے طریق پر مسجد میں نماز پڑھنے کی بھی اجازت دیدی اور جب عام مسلمانوں نے ان کو اس کام سے روکنا چاہا تو آپ نے منع فرمایا،

یہود و نصاریٰ کے ساتھ کھانے پینے، نکاح و معاشرت کی اجازت دی، اور ان کیلیے مخصوص امتیازی احکام شریعت اسلامیہ میں جاری فرمائے)

غریبوں کے ساتھ محبت و شفقت | مسلمانوں میں امیر بھی تھے اور غریب بھی، دولتمند بھی اور فاقہ کش بھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ سب کے ساتھ یکساں تھا، بلکہ غریبوں کے ساتھ آپ اس طرح پیش آتے تھے کہ دنیاوی دولت کی محرومی ان کے دلوں کو صدمہ نہیں پہنچاتی تھی، ایک دفعہ اقاعضا بشر سیتیا

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز [2] صحیح مسلم کتاب الادب ج ۲ ص ۲۳۹ مصر [3] زاد المعاد

آپ کا ایک فعل اس کے خلاف ہوا تو بارگاہ احدیت سے اس پر باز پرس ہوئی، مکہ کا واقعہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چند اکابر قریش بیٹھے تھے، اور آپ انکو اسلام کی دعوت دے رہے تھے کہ اتفاق سے عبد اللہ ابن ام مکتوم جو آنکھوں سے معذور اور غریب تھے، ادھر آنکلے اور وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ بیٹھکر آپ سے باتیں کرنے لگے، رؤسائے قریش چونکہ سخت متکبر اور فخار تھے، ان کو یہ برابری ناگوار گذری، آپنے ابن مکتوم کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور اس امید پر ان ہی سے باتیں کرتے رہے کہ شاید اشقیا اسلام کی سعادت کو قبول کرلیں اور ان کے دل حق کی لذت سے آشنا ہوں، لیکن خدا کو یہ امتیاز پسند نہ آیا اور یہ آیت اتری[1]

عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَاءَہُ الْاَعْمٰی وَمَا یُدْرِیْکَ	پیغمبر نے ترش روئی کی اور منہ پھیر لیا کہ اسکے پاس اندھا
لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی، اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی، اَمَّا	آیا (اے پیغمبر) تجھے کیا خبر کہ تیری باتوں سے وہ پاک ہوجاتا
مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی وَمَا عَلَیْکَ	یا نصیحت حاصل کرتا تو نصیحت اسکو نفع پہنچاتی لیکن جو
اَلَّا یَزَّکّٰی وَاَمَّا مَنْ جَاءَکَ یَسْعٰی وَھُوَ یَخْشٰی فَاَنْتَ	بے پروائی برتتا ہے اسکی طرف متوجہ ہوتا ہے اور تیرا کیا نقصان ہے
عَنْہُ تَلَھّٰی، کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ فَمَنْ	اگر وہ پاک صاف نہ بنے، اور تیرے پاس جو دوڑتا آتا ہے اور وہ خدا سے
شَاءَ ذَکَرَہٗ (عبس)	ڈرتا بھی ہے تو تو اس سے بے اعتنائی کرتا ہے، نہیں
	ہرگز نہیں، یہ نصیحت عام ہے جو چاہے اسکو قبول کرے

یہی غربا او مفلس اسلام کے سب سے پہلے جان نثار بنے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو لیکر حرم میں نماز پڑھنے جاتے تھے تو رؤسائے قریش انکی ظاہری بدحیثیتی کو دیکھکر استہزا کہتے تھے،

اَھٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنْ بَیْنِنَا	یہی لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم لوگوں کو چھوڑ کر احسان کیا

[1] ترمذی تفسیر سورۂ عبس.

لیکن آپ ان کے اس استہزاء کو خوشی سے برداشت کرتے تھے،

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے مزاج میں کسی قدر تعلی تھی اور وہ اپنے آپ کو غریبوں سے بالاتر سمجھتے تھے، آپ نے ان کی طرف خطاب کر کے فرمایا "تم کو جو نصرت اور روزی میسر آتی ہے وہ ان ہی غریبوں کی بدولت آتی ہے[1]"

اسامہؓ بن زید سے فرمایا "میں نے در جنت پر کھڑے ہو کر دیکھا کہ زیادہ تر غریب مفلس ہی لوگ اس میں داخل ہیں[2]"

عبداللہ بن عمرو بن العاص روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں مسجد نبوی میں بیٹھا تھا، اور غریب مہاجر لوگ حلقہ باندھے ایک طرف بیٹھے تھے، اس اثنا میں آپ تشریف لائے اور ان ہی کے ساتھ مل کر بیٹھ گئے، یہ دیکھ کر میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا، اور ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا، آپ نے فرمایا "غریب مہاجرین کو بشارت ہو کہ وہ دولتمندوں سے چالیس برس پہلے جنت میں داخل ہوں گے" عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ "میں نے دیکھا کہ یہ سن کر ان کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے، اور مجھے حسرت ہوئی کہ کاش میں بھی ان ہی میں ہوتا[3]"

ایک دفعہ آپ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، اس اثنا میں ایک شخص سامنے سے گذرا، آپ نے اپنے پہلو کے ایک آدمی سے دریافت فرمایا کہ "اس کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے؟" اس نے جواب دیا کہ "یہ امراء کے طبقہ میں سے ایک صاحب ہیں، خدا کی قسم یہ اس لائق ہیں کہ اگر رشتہ چاہے تو کیا جائے اور اگر کسی کی سفارش کرے تو قبول کیجائے"۔ یہ سن کر آپ خاموش ہو گئے، کچھ دیر کے بعد ایک دوسرا صاحب

---

[1] مشکوٰۃ باب فضل الفقراء، بروایت صحیح مسلم [2] حوالہ مذکور بروایت بخاری و مسلم [3] حوالہ مذکور بروایت دارمی

اسی راہ سے گذرے۔ آپ نے پھر اس سے استفسار فرمایا کہ "اس کی نسبت کیا کہتے ہو؟" عرض کی یا رسول اللہ! یہ فقرائے مہاجرین میں سے ہے، اور اس لائق ہے کہ اگر رشتہ چاہے تو واپس کر دیا جائے اور سفارش کرے تو رد کر دی جائے، اگر کچھ کہنا چاہے تو نہ سنا جائے" ارشاد ہوا کہ "تمام روئے زمین میں اگر اس امیر جیسے آدمی ہوں تو اس سے یہ ایک غریب بہتر ہے"[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر دعا میں فرمایا کرتے تھے "خداوندا مجھے مسکین زندہ رکھ مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے ساتھ میرا حشر کر" حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیوں؟ فرمایا "اس لیے کہ یہ دولتمندوں سے پہلے جنت میں جائیں گے" پھر فرمایا "اے عائشہ کسی مسکین کو اپنے دروازے سے نامراد نہ پھیرو گو چھوہارے کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو، اے عائشہ غریبوں سے محبت رکھو اور ان کو اپنے سے نزدیک کرو تو خدا بھی تم کو اپنے سے نزدیک کرے گا"[2]

ایک دفعہ چند غریب مسلمانوں نے آکر خدمت اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! امراہم سے درجۂ اخروی میں بھی بڑھتے جاتے ہیں، نماز، روزہ جس طرح ہم کرتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں لیکن صدقات وخیرات سے جو نیکیاں ان کو ملتی ہیں ان سے ہم محروم ہیں، آپ نے فرمایا "کیا میں تم کو وہ بات نہ بتاؤں جس سے تم اگلوں کے برابر ہو جاؤ اور پچھلوں سے بڑھ جاؤ اور پھر کوئی تمہاری برابری نہ کر سکے"۔ عرض کی ہاں یا رسول اللہ! بتائیے" ارشاد ہوا ہر نماز کے بعد ۳۳-۳۳ دفعہ سبحان اللہ اور الحمد للہ اللہ اکبر پڑھ لیا کرو، کچھ دن کے بعد یہ وفد پھر حاضر خدمت ہوا، اور عرض کی یا رسول اللہ ہمارے دولتمند بھائیوں نے بھی یہ وظیفہ سن لیا اور پڑھنا شروع کر دیا، فرمایا ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ

[1] حوالہ مذکور بروایت صحیح بخاری و صحیح مسلم [2] مشکوٰۃ باب فضل الفقراء بروایت ترمذی و بیہقی و ابن ماجہ۔

یعنی یہ خدا کا دین ہے جس کو چاہے دے،[1]

مسلمانوں سے جو زکوٰۃ وصول ہوتی تھی اس کی نسبت عام حکم تھا کہ

توخذ من امرائھم وترد علی فقرائھم ہر قبیلہ کے یا ہر شہر کے امرا سے لیکر وہیں کے غربا میں تقسیم کردیجائے

صحابہ اسکی شدت سے پابندی کرتے تھے اور ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ نہیں بھیجتے تھے،[2]

مساوات کے بیان میں یہ واقعہ بتفصیل مذکور ہو کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ نے کسی بات پر حضرت سلمانؓ وبلالؓ کو جنکا شمار فقرائے مہاجرین میں ہے ڈانٹا تھا، آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا کہ "تم نے ان لوگوں کو آزردہ تو نہیں کیا" یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ ان لوگوں کے پاس آئے اور معافی مانگی اور ان لوگوں نے معاف کیا،

عوالی میں ایک عورت رہتی تھی، وہ بیمار پڑی، اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی، خیال تھا کہ وہ آج کسی وقت مرجائے گی، آپ نے لوگوں سے کہا کہ وہ مرجائے تو میں جنازہ کی نماز خود پڑھاؤں تو اس کے بعد دفن کیجائے، اتفاق سے اس نے کچھ رات گئے انتقال کیا، اس کا جنازہ جب تیار ہوکر لایا گیا تو آپ آرام فرما چکے تھے، صحابہ اس وقت آپ کو تکلیف دینی مناسب نہ سمجھے، اور رات ہی کو دفن کردیا، صبح کو آپ نے دریافت فرمایا تو لوگوں نے واقعہ عرض کیا، آپ یہ سن کر کھڑے ہوگئے اور صحابہ کو ساتھ لے کر دوبارہ اس کی قبر پر جاکر نماز جنازہ ادا کی،[3]

حضرت جریرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن پہلے پہر ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک پورا قبیلہ مسافرانہ حاضر خدمت ہوا، ان کی ظاہری حالت اس درجہ خراب تھی کہ کسی کے

---

[1] صحیح بخاری ومسلم باب استحباب الذکر بعد الصلوٰۃ [2] ابوداؤد، زکوٰۃ [3] یہ واقعہ صحیح بخاری وغیرہ میں بھی ہو لیکن سنن نسائی کتاب الجنائز باب الصلوٰۃ فی اللیل سے لیا گیا ہے۔

بدن پر کوئی کپڑا ثابت نہ تھا، برہنہ تن، برہنہ پا، کھالیں بدن سے بندھی ہوئی، تلواریں گلوں میں پڑی ہوئی ان کی یہ حالت دیکھ کر آپ بیحد متاثر ہوئے، چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا، اضطراب میں آپ اندر گئے باہر آئے، پھر حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا، نماز کے بعد آپ نے خطبہ دیا، اور تمام مسلمانوں کو ان کی امداد و اعانت کے لیے آمادہ کیا[۱]

دشمنان جان سے عفو و درگزر

جانی دشمنوں اور قاتلانہ حملہ آوروں سے عفو و درگزر کا واقعہ پیغمبروں کے صحیفۂ اخلاق کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے جس شب کو آپ نے ہجرت فرمائی ہے، کفار قریش کے نزدیک یہ طے شدہ تھا کہ صبح کو محمد کا سر قلم کر دیا جائے، اسلیے دشمنوں کا ایک دستہ رات بھر خانۂ نبویؐ کا محاصرہ کیے کھڑا رہا، اگرچہ اسوقت دشمنوں سے انتقام لینے کی آپ میں ظاہری قوت نہ تھی لیکن ایک وقت آیا جب ان میں سے ایک ایک کی گردن اسلام کی تلوار کے نیچے تھی، اور اسکی جان صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم وکرم پر موقوف تھی، لیکن ہر شخص [illegible] ہے کہ ان میں سے کوئی شخص اس جرم میں کبھی مقتول نہیں ہوا

ہجرت کے دن قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کی قیمت مقرر کی تھی، اور اعلان کیا تھا کہ جو محمد کا سر لائیگا یا زندہ گرفتار کریگا اس کو سو اونٹ انعام میں دیے جائیں گے، سراقہ بن جعشم پہلے شخص تھے جو اس نیت سے اپنے صبا رفتار گھوڑے پر سوار، ہاتھ میں نیزہ لیے ہوئے آپ کے قریب پہنچے، آخر دو تین دفعہ کرشمۂ اعجاز دیکھ کر اپنی نیت بد سے توبہ کی، اور خواہش کی کہ مجھکو سند امان لکھ دیجائے چنانچہ سند امان لکھکر ان کو دیدی گئی[۲]، اس کے آٹھ برس کے بعد فتح مکہ کے موقع پر حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے، اور اس جرم کے متعلق ایک حرف سوال بھی درمیان میں نہیں آیا،[۳]

۱؎ صحیح مسلم صدقات ۲؎ صحیح بخاری باب الہجرہ ۳؎ سراقہ بن مالک بن جعشم مدلجی کا حال، استیعاب، اصابہ وغیرہ میں دیکھو،

Marfat.com

عمیر بن وہب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت دشمن تھا، مقتولین بدر کے انتقام کیلئے جب سارا قریش بیتاب تھا، تو صفوان بن امیہ نے اس کو بیش قرار انعام کے وعدہ پر مدینہ بھیجا تھا کہ چپکے سے جاکر نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تمام کر دے، عمیر اپنی تلوار زہر میں بجھا کر مدینہ آیا لیکن وہاں پہنچتے کیساتھ اس کے تیور دیکھ کر لوگوں نے پہچان لیا، حضرت عمرؓ نے اس کے ساتھ سختی کرنی چاہی لیکن آپ نے منع فرمایا اور اپنے قریب بٹھا کر اس سے باتیں کیں اور اصلی راز ظاہر کر دیا، یہ سنکر وہ سناٹے میں آگیا لیکن آپ نے اس سے کوئی تعرض نہیں فرمایا، یہ دیکھ کر وہ اسلام لایا، اور مکہ میں جاکر دعوت اسلام پھیلائی، یہ واقعہ ۳ھ کا ہے۔[۱]

ایک دفعہ آپ ایک غزوہ سے واپس آرہے تھے، راہ میں ایک میدان آیا، دھوپ تیز تھی، لوگوں نے درختوں کے نیچے بستر لگا دیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک درخت کے نیچے آرام فرمایا، تلوار درخت کی شاخ سے لٹکا دی، کفار موقع کے منتظر رہتے تھے، لوگوں کو غافل دیکھ کر ناگاہ ایک طرف سے ایک بدو نے آکر بے خبری میں تلوار اتار لی، دفعۃً آپ بیدار ہوئے تو دیکھا کہ ایک شخص سرہانے کھڑا ہے اور ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں ہے، آپ کو بیدار دیکھ کر بولا "کیوں محمد! اب بتاؤ تم کو اس وقت مجھ سے کون بچا سکتا ہے" آپ نے فرمایا "اللہ" یہ پراثر آواز سنکر اس نے تلوار نیام میں کر لی، اتنے میں صحابہؓ آگئے، آپ نے ان سے واقعہ دہرایا، اور بدو سے کسی قسم کا تعرض نہیں فرمایا،[۲]

ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کے قتل کا ارادہ کیا، صحابہ اس کو گرفتار کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائے، وہ آپ کو دیکھ کر ڈر گیا، آپ نے اس کو مخاطب کر کے فرمایا، ڈرو نہیں، اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے بھی تو نہیں کر سکتے تھے،[۳]

---

[۱] تاریخ طبری بروایت عروہ بن زبیر [۲] صحیح بخاری کتاب الجہاد ص ۴۰۸ [۳] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۴۷۱،

صلح حدیبیہ کے زمانہ میں ایک دفعہ اسی آدمیوں کا ایک دستہ منہ اندھیرے جبل تنعیم سے اتر کر آیا اور چھپکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا چاہا، اتفاق سے وہ لوگ گرفتار ہوگئے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو چھوڑ دیا اور کچھ تعرض نہیں کیا، قرآن مجید کی یہ آیت اسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے،[1]

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ (فتح) اسی خدا نے انکے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک لیے،

خیبر میں ایک یہودیہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے میں زہر دیا، آپ نے کھانا کھایا تو زہر کا اثر محسوس کیا، آپ نے یہودیوں کو بلا کر دریافت کیا تو انھوں نے اقرار کیا، لیکن آپ نے کسی سے کچھ تعرض نہیں فرمایا، لیکن اسی زہر کے اثر سے جب ایک صحابی نے انتقال کیا تو آپ نے صرف اس یہودیہ کو قصاص کی سزا دی، (حالانکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر کا اثر مرتے دم تک محسوس ہوتا رہتا تھا)[2]

دشمنوں کے حق میں دعائے خیر

دشمنوں کے حق میں بد دعا کرنا انسان کی فطری عادت ہے لیکن پیغمبروں کا مرتبہ عام انسانی سطح سے بدرجہا بلند ہوتا ہے جو لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں وہ ان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں اور جو ان کے تشنہ خون ہوتے ہیں وہ ان کو پیار کرتے ہیں، ہجرت سے قبل مکہ میں مسلمانوں پر اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پیہم مظالم ہو رہے تھے، اس داستان کے دہرانے کیلیے بھی سنگدلی درکار ہے اسی زمانہ میں خباب بن ارت ایک صحابی نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! دشمنوں کے حق میں بد دعا فرمایئے یہ سنکر چہرہ مبارک سرخ ہوگیا،[3] ایک دفعہ چند صاحبوں نے مل کر اسی قسم کی بات کہی تو فرمایا کہ "میں دنیا کے لیے لعنت کرنے نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں"[4]

وہ قریش جنھوں نے تین برس تک آپ کو محصور رکھا اور جو آپکے پاس غلہ کے ایک دانہ کے

۱؎ جامع ترمذی تفسیر فتح ۲؎ صحیح بخاری وفاۃ النبی ۳؎ صحیح بخاری مبعث النبی ۴؎ مشکوۃ اخلاق النبی بحوالہ صحیح مسلم

Marfat.com

پہنچنے کے روادار نہ تھے، ان کی شرارتوں کی پاداش میں دعائے نبوی کی استجابت نے ابر رحمت کا سایہ ان کے سر سے اٹھا لیا، اور مکہ میں اس قدر قحط پڑا کہ لوگ ہڈی اور مردار کھانے لگے، ابوسفیان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ "محمد! تمھاری قوم ہلاک ہو رہی ہے، خدا سے دعا کرو کہ یہ مصیبت دور ہو" آپ نے بلا عذر فوراً دعا کیلیے ہاتھ اٹھائے اور خدا نے اس مصیبت سے انکو نجات دی،[1]

جنگ احد میں دشمنوں نے آپ پر پتھر پھینکے، تیر برسائے، تلواریں چلائیں، دندان مبارک کو شہید کیا، جبین اقدس کو خون آلودہ کیا، لیکن ان حملوں کا وار آپ نے جس سپر پر روکا، وہ صرف یہ دعا تھی،

اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون　　　خدایا! ان کو معاف کر، نادان ہیں،

وہ طائف جس نے دعوت اسلام کا جواب استہزاء اور تمسخر سے دیا تھا، وہ طائف جس نے داعی اسلام کو اپنی پناہ میں لینے سے انکار کر دیا تھا، وہ طائف جس نے پائے مبارک کو لہو لہان کیا تھا، ان کی نسبت فرشتۂ غیب پوچھتا ہے کہ حکم ہو تو ان پر پہاڑ الٹ دیا جائے، جواب ملتا ہے کہ شاید انکی نسل سے کوئی خدا کا پرستار پیدا ہو،[2] دس بارہ برس کے بعد یہی طائف اسلام کی دعوت کا جواب تیر و تفنگ (منجنیق) سے دیتا ہے، جاں نثاروں کی لاشوں پر لاشیں گر رہی ہیں، صحابہ عرض کرتے ہیں کہ "یا رسول اللہ! انکے حق میں بد دعا کیجئے" آپ دعا کیلیے ہاتھ اٹھاتے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ حضور ان کے حق میں بد دعا فرمائیں گے، لیکن زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلتے ہیں "خداوندا! ثقیف (اہل طائف) کو اسلام نصیب کر اور دوستانہ ان کو مدینہ لا" وہ تیر جو میدان جنگ میں نشانہ پر نہیں لگے تھے، وہ مدینہ کی مسجد میں زبان مبارک سے نکل کر ٹھیک اپنے ہدف پر پہنچے یعنی وہ مدینہ آکر خاص مسجد نبوی میں ٹھہرے، جہاں وہ مہمان

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ دخان ج ۲　[2] صحیح بخاری

Marfat.com

ٹھہرائے گئے تھے مسلمان ہوگئے[1]،

دوس کا قبیلہ یمن میں رہتا تھا، طفیل رضؓ بن عمرو دوسی اس قبیلہ کے رئیس تھے، وہ قدیم الاسلام تھے، مدت تک وہ اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، لیکن وہ اپنے کفر پر اڑا رہا، ناچار وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، اور قبیلے کی حالت عرض کرکے گذارش کی کہ ان کے حق میں بددعا فرمایئے، لوگوں نے یہ سنا تو کہا کہ اب دوس کی بربادی میں کوئی شک نہیں رہا، لیکن رحمتِ عالمؐ نے جن الفاظ میں دعا فرمائی وہ یہ تھے[2]؛

اللھم اھد دوسا وائت بھم — خداوندا دوس کو ہدایت کر اور ان کو لا

حضرت ابوہریرہؓ کی ماں مشرکہ تھیں، اپنی ماں کو وہ جس قدر اسلام کی تبلیغ کرتے تھے، وہ انکار کرتی تھیں، ایک دن انھوں نے اسلام کی دعوت دی، تو انکی ماں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی حضرت ابوہریرہؓ کو اسقدر صدمہ ہوا کہ وہ رونے لگے، اور اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور واقعہ عرض کیا، آپ نے دعا کی "الٰہی ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت نصیب کر" وہ خوش خوش گھر واپس آئے تو دیکھا کہ کواڑ بند ہیں اور ماں نہا رہی ہیں، غسل سے فارغ ہوکر کواڑ کھولے اور کلمہ پڑھا[3]،

عبداللہ بن ابی بن سلول وہ شخص تھا جو عمر بھر منافق رہا اور کوئی موقع اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف خفیہ سازشوں اور علانیہ استخفاف و اہانت کا ہاتھ سے جانے نہ دیا، کفار قریش کے ساتھ اسکی خفیہ خط و کتابت تھی، غزوۂ احد میں عین موقع پر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مسلمانوں کی فوج سے الگ ہوگیا، واقعۂ افک میں حضرت عائشہؓ پر الزام لگانے والوں میں وہ سب سے آگے تھا،

---

[1] ابن سعد غزوۂ طائف [2] صحیح مسلم مناقب دوس [3] صحیح مسلم فضائل ابی ہریرہؓ

باایں ہمہ اسکی فردِ جرم کو رحمتِ عالم کا حلم و عفو ہمیشہ دھوتا رہا، وہ مرا تو آپ نے اسکی مغفرت کی نماز پڑھی، اس پر حضرت عمرؓ نے کہا "یا رسول اللہ آپ اس کے جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں، حالانکہ اس نے یہ کہا اور یہ کہا، یہ سنکر آپ متبسم ہوئے اور فرمایا "ہٹو اے عمر" جب زیادہ اصرار کیا تو فرمایا "اگر مجھے اختیار دیا جاتا کہ اگر ستر دفعہ میں نماز پڑھوں تو اس کی بخشش ہو سکتی ہے، تو میں اس سے بھی زیادہ پڑھتا"[1]

بچوں پر شفقت بچوں پر نہایت شفقت فرماتے تھے معمول تھا کہ سفر سے تشریف لاتے تو راہ میں جو بچے ملتے ان میں سے کسی کسی کو اپنے ساتھ سواری پر آگے پیچھے بٹھاتے (راستہ میں بچے مل جاتے تو انکو خود سلام کرتے)[2]

ایک دن خالد بن سعیدؓ خدمت اقدس میں آئے، ان کی چھوٹی لڑکی بھی ساتھ تھی، اور سرخ رنگ کا کرتہ بدن میں تھا، آپ نے فرمایا سنہ سنہ، حبشی زبان میں حسنہ کو سنہ کہتے ہیں، چونکہ انکی پیدائش حبش میں ہوئی تھی، اس لیے آپ نے اس مناسبت سے حبشی تلفظ میں حسنہ کے بجائے سنہ کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شانے پر مہر نبوت ابھری ہوئی تھی، بچوں کی عادت ہوتی ہے غیر معمولی چیز نظر آئے تو اس سے کھیلنے لگتے ہیں، وہ بھی مہر نبوت سے کھیلنے لگیں، خالدؓ نے ڈانٹا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا کہ کھیلنے دو۔[3]

ایک دفعہ آپ کے پاس کہیں سے کپڑے آئے جنمیں ایک سیاہ چادر بھی تھی، جسمیں دونوں طرف آنچل تھے، آپ نے حاضرین سے کہا یہ چادر کس کو دوں، لوگ چپ رہے، آپ نے فرمایا "ام خالد کو لاؤ"[4] وہ آئیں تو آپ نے ان کو پہنایا اور دو دفعہ فرمایا "پہننا اور پرانی کرنا" چادر میں جو بوٹے تھے، آپ انکو دکھا دکھا کے فرماتے تھے "ام خالد دیکھنا یہ سنا ہے، یہ سنا ہے"[5] اوپر گذر چکا ہے کہ ام خالد حبش میں پیدا ہوئی تھیں، اور کم سن

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز [2] ابو داؤد کتاب الادب [3] بخاری ج ۲ ص ۸۸۴ [4] اصابہ میں ہے کہ وہ چھوٹی تھیں کہ لوگ انکو گود میں اٹھا کر لائے (اصابہ ترجمہ ام خالد) [5] بخاری کتاب اللباس، سنا حبشی میں حسن کو کہتے ہیں۔

Marfat.com

مہینے تک شاہ میں رہی تھیں، اس لیے ان سے حبشی زبان میں خطاب کیا،

ایک صحابی کا بیان ہے کہ بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا اور ڈھیلوں سے مار کر کھجوریں گراتا، لوگ مجھکو خدمت اقدس میں لے گئے، آپنے پوچھا ڈھیلے کیوں مارتے ہو، میں نے کہا، کھجوریں کھانے کے لیے، ارشاد فرمایا کہ کھجوریں جو زمین پر ٹپکتی ہیں، ان کو اٹھا کر کھالیا کرو، ڈھیلے نہ مارو، یہ کہکر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔[1]

ماں بچے کی محبت کے واقعات آپ پر سخت اثر ہوتا تھا، ایک دفعہ ایک نہایت غریب عورت حضرت عائشہؓ کے پاس آئی، دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی ساتھ تھیں، اس وقت حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ نہ تھا، ایک کھجور زمین پر پڑی ہوئی تھی وہی اٹھا کر دیدی، عورت نے کھجور کے دو ٹکڑے کیے، اور دونوں میں برابر تقسیم کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر سے تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے واقعہ سنایا، ارشاد فرمایا "خدا جسکو اولاد کے محبت میں ڈالے اور وہ انکا حق بجالائے وہ دوزخ سے محفوظ ہوگا"۔[2]

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میں نماز شروع کرتا ہوں اور ارادہ ہوتا ہے کہ دیر میں ختم کروں گا، دفعۃً صف سے کسی بچہ کے رونے کی آواز آتی ہے اور مختصر کر دیتا ہوں، کہ اس کی ماں کو تکلیف ہوتی ہوگی،[3]

(یہ محبت اور شفقت مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی، بلکہ مشرکین کے بچوں پر بھی اسی طرح لطف فرماتے تھے، ایک دفعہ ایک غزوہ میں چند بچے جھپٹ میں آکر مارے گئے، آپکو خبر ہوئی تو نہایت آزردہ ہوئے، ایک صاحب نے کہا یا رسول اللہ وہ مشرکین کے بچے تھے، آپ نے فرمایا "مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں"،

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد [2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۸۷ [3] بخاری کتاب الصلوٰۃ۔

Marfat.com

خبردار بچوں کو قتل نہ کرو، خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو، ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے"[1]

معمول تھا کہ جب فصل کا نیا میوہ کوئی خدمت اقدس میں پیش کرتا تو حاضرین میں جو سب سے زیادہ کم عمر بچہ ہوتا، اس کو عنایت فرماتے۔[2] بچوں کو چومتے اور ان کو پیار کرتے تھے، ایک دفعہ آپ اسی طرح بچوں کو پیار کر رہے تھے کہ ایک بدوی آیا، اس نے کہا "تم لوگ بچوں کو پیار کرتے ہو، میرے دس بچے ہیں، مگر اب تک میں نے کسی کو پیار نہیں کیا،" آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اگر تمہارے دل سے محبت کو چھین لے تو میں کیا کروں"[3]

جابر بن سمرہ صحابی تھے، وہ اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہو کر آپ اپنے گھر کی طرف چلے، میں بھی ساتھ ہو لیا کہ ادھر سے چند اور لڑکے نکل آئے، آپ نے سب کو پیار کیا، اور مجھے بھی پیار کیا۔[4]

ہجرت کے موقع پر جب مدینہ میں آپ کا داخلہ ہو رہا تھا، انصار کی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں خوشی سے دروازوں سے نکل نکل کر گیت گا رہی تھیں، جب آپ کا ادھر گذر ہوا، فرمایا "اے لڑکیو! تم مجھے پیار کرتی ہو" سب نے کہا "ہاں یا رسول اللہ!" فرمایا "میں بھی تمہیں پیار کرتا ہوں"[5]

حضرت عائشہؓ کمسنی میں بیاہ کر آئی تھیں، محلہ کی لڑکیوں کے ساتھ وہ کھیلا کرتی تھیں۔ آپ جب گھر میں تشریف لاتے تو لڑکیاں آپ کا لحاظ کر کے ادھر ادھر چھپ جاتیں۔ آپ انکو تسکین دیتے اور کھیلنے کو کہتے[6]

غلاموں پر شفقت	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غلاموں پر خصوصیت کے ساتھ شفقت فرماتے تھے، فرمایا کرتے کہ یہ تمہا

[1] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۴۳۵ [2] معجم صغیر طبرانی باب المیم محمد [3] صحیح بخاری و مسلم کتاب الادب [4] صحیح مسلم باب طیب رائحۃ النبی صلعم [5] سیرۃ جلد اول، ہجرت [6] ابوداؤد کتاب الادب باب اللعب

بھائی ہیں جو خود کھاتے ہو وہ ان کو کھلاؤ، اور جو خود پہنتے ہو وہ ان کو پہناؤ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت میں جو غلام آتے، ان کو آپ ہمیشہ آزاد فرما دیتے تھے لیکن وہ حضورؐ کے احسان و کرم کی زنجیر سے آزاد نہیں ہو سکتے تھے، ماں، باپ، قبیلہ، رشتہ کو چھوڑ کر عمر بھر آپ کی غلامی کو شرف جانتے تھے، زید بن حارثہؓ غلام تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا، انکے باپ ان کو لینے آئے لیکن وہ آستانۂ رحمت پر باپ کے ظلِ عاطفت کو ترجیح نہ دے سکے اور انہی جانے سے قطعاً انکار کر دیا، زیدؓ کے بیٹے اسامہ سے آپ اسقدر محبت کرتے تھے کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر اسامہ بیٹی ہوتی تو میں اسکو زیور پہناتا، خود اپنے دست مبارک سے انکی ناک صاف کرتے تھے،

غلاموں کو لفظ "غلام" کا سنکر اپنی نظر میں اپنی ایک ذلت محسوس ہوتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انکی یہ تکلیف بھی گوارا نہ تھی، فرمایا کوئی "میرا غلام" "میری لونڈی" نہ کہے، "میرا بچہ"، "میری بچی" کہے، اور غلام بھی اپنے آقا کو خداوند نہ کہیں، خداوند خدا ہے، آقا کہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غلاموں پر شفقت اتنی ملحوظ تھی کہ مرض الموت میں سب سے آخری یہ وصیت فرمائی کہ "غلاموں کے معاملہ میں خدا سے ڈرا کرنا"،

حضرت ابوذرؓ بہت قدیم الاسلام صحابی تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انکی راست گوئی کی مدح فرماتے تھے، ایک دفعہ انھوں نے ایک عجمی آزاد غلام کو برا بھلا کہا، غلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر شکایت کی، آپ نے ابوذر کو زجر فرمایا کہ "تم میں ابتک جہالت باقی ہے یہ غلام تمھارے بھائی ہیں، خدا نے تمکو ان پر فضیلت عطا کی ہے اگر وہ تمھارے مزاج کے موافق نہ ہوں تو انکو فروخت کر ڈالو، خدا کی مخلوق کو ستایا نہ کرو، جو خود کھاؤ وہ انکو کھلاؤ، جو خود پہنو وہ انکو پہناؤ، انکو اتنا کام نہ دو جو وہ نہ کر سکیں اور اتنا کام دو تو خود بھی انکی اعانت کرو"[1]

ایک دفعہ ابومسعود انصاریؓ اپنے غلام کو مار رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی، ابو مسعود! تمکو جسقدر

---

[1] بخاری باب المعاصی من امر الجاہلیۃ وابوداؤد کتاب الادب

Marfat.com

اس غلام پر اختیار ہے، خدا کو اس سے زیادہ تم پر اختیار ہے، ابو مسعودؓ نے مڑ کر دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے، عرض کی یا رسول اللہ میں نے لوجہ اللہ اس غلام کو آزاد کیا، فرمایا "اگر تم ایسا نہ کرتے تو آتش دوزخ تم کو چھو لیتی"۔

ایک شخص خدمت نبویؐ میں حاضر ہوا، عرض کی "یا رسول اللہ! میں غلاموں کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں"؟ آپ خاموش رہے، اس نے پھر عرض کی، آپ نے پھر خاموشی اختیار کی، اس نے تیسری بار عرض کی، آپ نے فرمایا "ہر روز ستر بار معاف کیا کرو"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک خاندان میں سات آدمی تھے، اور سات آدمیوں کے بیچ میں ایک ہی لونڈی تھی، ایک دفعہ ان میں سے ایک نے اس لونڈی کو تھپڑ مارا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اس کو آزاد کر دو، لوگوں نے کہا "یا رسول اللہ! ہم سات آدمیوں کے بیچ میں یہی ایک خادمہ ہے" آپ نے فرمایا "اچھا اسوقت تک خدمت گذاری کرے جب تک تم اس سے بے نیاز نہ ہو جاؤ، جب حاجت دور ہو تو وہ آزاد ہے"[1]۔

ایک صاحب کے پاس دو غلام تھے، جن کے وہ بہت شاکی تھے، وہ ان کو مارتے تھے، برا بھلا کہتے تھے، لیکن وہ دونوں باز نہ آتے تھے، انھوں نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اور اس کا علاج پوچھا، آپ نے فرمایا "تمھاری سزا اگر ان کے قصور کے برابر ہو گی تو خیر، ورنہ سزا کی جو مقدار زاید ہو گی، اس کے برابر تمھیں بھی خدا سزا دیگا"۔ یہ سن کر وہ بیقرار ہو گئے اور گریہ وزاری شروع کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ شخص قرآن نہیں پڑھتا، ونضع الموازین القسط الخ" یہ سنکر انھوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! بہتر یہ ہے کہ میں ان کو اپنے سے جدا کر دوں، آپ گواہ رہیں کہ اب وہ آزاد ہیں"[2]۔

---

[1] یہ تمام واقعات ابوداؤد کتاب الادب باب حق المملوک میں مذکور ہیں [2] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۸۰۔

Marfat.com

غلاموں کا لوگ بیاہ کر دیتے تھے، اور پھر جب چاہتے تھے، جبراً ان میں تفریق کر دیتے تھے، چنانچہ ایک شخص نے اپنی لونڈی سے اپنے غلام کا عقد کر دیا، اور پھر دونوں میں علٰحدگی کرنی چاہی، غلام نے خدمت نبویؐ میں آکر شکایت کی، آپ نے منبر پر خطبہ دیا کہ "لوگ کیوں غلاموں کا نکاح کر کے پھر تفریق کرانا چاہتے ہیں، نکاح و طلاق کا حق صرف شوہر کو ہے[1]"

اسی رحم و شفقت کا اثر تھا کہ اکثر کافروں کے غلام بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور آپ انھیں آزاد فرما دیتے تھے[2]، مال غنیمت جب تقسیم ہوتا تو آپ اس میں سے غلاموں کو بھی حصہ دیتے تھے[3]، جو غلام نئے آزاد ہوتے تھے، چونکہ ان کے پاس کوئی مالی سرمایہ نہیں ہوتا تھا، اسلیے جو آمدنی وصول ہوتی تھی، اس میں سب سے پہلے آپ ان ہی کو عنایت فرماتے تھے)

مستورات کے ساتھ برتاؤ دنیا میں یہ صنف ضعیف (عورتیں) چونکہ ہمیشہ ذلیل رہی ہے، اس لیے کسی نامور شخص کے حالات میں یہ پہلو کبھی پیش نظر نہیں رہا کہ اس مظلوم گروہ کے ساتھ اس کا طریق معاشرت کیا تھا، اسلام دنیا کا سب سے پہلا مذہب ہے جس نے عورتوں کی حق رسی کی اور عزت و منزلت کے دربار میں ان کو مردوں کے برابر جگہ دی، اس لیے شارع اسلام کے واقعاتِ زندگی میں ہم کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مستورات کے ساتھ ان کا طرز عمل کیا تھا،

صحیح بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلا (ازواج مطہرات سے چند روزہ علٰحدگی) کی جو روایت مذکور ہے، اس میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "مکہ میں ہم لوگ عورتوں کو بالکل ناقابلِ التفات سمجھتے تھے، مدینہ میں نسبۃً عورتوں کی قدر تھی لیکن نہ اسقدر جسکی وہ مستحق تھیں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سنن ابن ماجہ کتاب الطلاق [2] ابوداؤد کتاب الجہاد و مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۳۴۸ [3] ابوداؤد باب قسمۃ الفیٔ

Marfat.com

نے جس طرح اپنے ارشاد و احکام سے ان کے حقوق قائم کیے، آپ کے برتاؤ نے اور زیادہ اس کو قوی اور نمایاں کر دیا، ازواجِ مطہرات کے واقعات مستقلاً مذکور ہیں، یہاں ہم عام واقعات لکھتے ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں چونکہ ہر وقت مردوں کا ہجوم رہتا تھا عورتوں کو وعظ و پند سننے اور مسائل دریافت کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا، مستورات نے آکر درخواست کی کہ مردوں سے ہم عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، اس لیے ہمارے لیے ایک خاص دن مقرر کر دیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست قبول فرمائی[1]، اور ان کے دربار کا ایک خاص دن مقرر ہو گیا،

جن لوگوں نے آغاز اسلام میں حبش کو ہجرت کی تھی، ان میں اسماء بنت عمیسؓ بھی تھیں، خیبر کی فتح کے زمانہ میں مہاجرین حبش مدینہ میں آئے تو وہ بھی آئیں، ایک دن وہ حضرت حفصہؓ سے ملنے گئیں، اتفاق یہ کہ اس وقت حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، ان کو دیکھکر پوچھا کہ یہ کون ہیں، حضرت حفصہؓ نے نام بتایا، حضرت عمرؓ نے کہا "ہاں وہ حبش والی وہ سمندر والی"، اسماءؓ بنت عمیس نے کہا، ہاں وہی، حضرت عمرؓ نے کہا "ہم نے تم لوگوں سے پہلے ہجرت کی، اور اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمارا زیادہ حق ہے"، اسماءؓ کو سخت غصہ آیا، بولیں "ہرگز نہیں، تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے، وہ بھوکوں کو کھلاتے تھے، ہمارا یہ حال تھا کہ گھر سے دور، بیگانے حبشیوں میں رہتے تھے، لوگ ہم کو ستاتے تھے اور ہر وقت جان کا ڈر لگا رہتا تھا"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگئے، اسماءؓ نے کہا "یا رسول اللہ! عمرؓ نے یہ کہا" آپ نے فرمایا تم نے کیا جواب دیا، انھوں نے ماجرا سنایا، آپ نے فرمایا عمرؓ کا حق مجھ پر تم سے زیادہ نہیں، عمرؓ اور ان کے

---

[1] صحیح بخاری کتاب العلم باب یجعل للنساء یوماً علی حدۃ

ساتھیوں نے صرف ایک ہجرت کی، اور تم لوگوں نے دو ہجرتیں کیں۔"

اس واقعہ کا چرچا پھیلا تو مہاجرین حبش جوق جوق اسماءؓ کے پاس آتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ان سے بار بار دہروا کر سنتے، حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ مہاجرین حبش کے لیے دنیا میں کوئی چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ سے زیادہ مسرت انگیز نہ تھی،[1]

حضرت انس بن مالکؓ جو خادم خاص تھے، ان کی خالہ کا نام ام حرام تھا (جو رضاعت کے رشتہ سے آپ کی بھی خالہ تھیں) معمول تھا جب آپ قبا تشریف لیجاتے تو ان کے پاس ضرور جاتے، وہ اکثر کھانا لا کر پیش کرتیں اور آپ نوش فرماتے آپ سو جاتے تو بالوں میں سے جوئیں نکالتیں،[2]

حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ سے آپ کو نہایت محبت تھی، آپ اکثر ان کے گھر تشریف لیجاتے، وہ بچھونا بچھا دیتیں، آپ آرام فرماتے، جب سو کر اٹھتے تو وہ آپ کا پسینہ ایک شیشی میں جمع کرلیتیں، مرتے وقت وصیت کی کہ کفن میں حنوط ملایا جائے تو عرق مبارک کے ساتھ ملایا جائے۔[3]

ایک دفعہ حضرت انسؓ کی دادی ملیکہ نے آپ کی دعوت کی، کھانا خود تیار کیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا نوش فرما کر فرمایا "آؤ میں تم کو نماز پڑھاؤں"، گھر میں صرف ایک چٹائی تھی اور وہ بھی پرانی ہو کر سیاہ ہو گئی تھی، حضرت انسؓ نے پہلے اس کو پانی سے دھویا، اور پھر نماز کے لیے بچھایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امامت کی، حضرت انسؓ اور ان کی دادی اور یتیم (غلام) صف باندھ کر کھڑے ہوئے، آپ نے دو رکعت نماز ادا کی اور واپس آئے،[4]

حضرت ابو بکرؓ کی صاحبزادی (اسماءؓ) جو حضرت عائشہؓ کی علاتی بہن تھیں، حضرت زبیرؓ سے بیاہی

---

[1] صحیح بخاری غزوہ خیبر [2] بخاری کتاب الجہاد صفحہ ۳۹۱ [3] بخاری کتاب الاستیذان [4] بخاری باب الصلوٰۃ علی الحصیر

تھیں، مدینہ میں آئیں تو اس وقت حضرت زبیرؓ کی یہ حالت تھی کہ ایک گھوڑے کے سوا اور کچھ نہ تھا حضرت اسماءؓ خود ہی گھوڑے کیلیے جنگل سے گھانس لاتیں اور کھانا پکاتیں، حضرت زبیرؓ کو جو زمین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی تھی اور جو مدینہ سے دو میل پر تھی، وہاں سے کھجور کی گٹھلیاں سر پر لاد کر لاتیں، ایک دن وہ گٹھلیاں لیے ہوئے آرہی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا، آپ اسوقت اونٹ پر سوار تھے، اونٹ کو بٹھادیا کہ وہ سوار ہولیں حضرت اسماءؓ شرمائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر کہ وہ حجاب کرتی ہیں، کچھ نہیں فرمایا اور ان کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک خادم بھیجا جو گھوڑے کی خدمت کرتا تھا، مجکو اسقدر غنیمت معلوم ہوا گویا میں غلامی سے آزاد ہو گیا[1]

ایک بار قرابت کی بہت سی بیبیاں بیٹھی ہوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی تھیں حضرت عمرؓ آئے تو سب اٹھکر چلدیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے، حضرت عمرؓ نے کہا خدا آپکو خنداں رکھے، کیوں ہنسے، فرمایا مجھے ان عورتوں پر تعجب ہوا کہ وہ تمھاری آواز سنتے ہی سب آڑ میں چھپ گئیں، حضرت عمرؓ نے انکی طرف مخاطب ہوکر کہا اے اپنی جان کی دشمنو! مجھ سے ڈرتی ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتیں، سب نے کہا "تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سخت مزاج ہو"[2]

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کے گھر میں آپ منہ ڈھانک کر سوئے ہوئے تھے، عید کا دن تھا، چھوکریاں گا بجا رہی تھیں، حضرت ابوبکرؓ آئے تو ان کو ڈانٹا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ان کو گانے دو، ان کی عید کا دن ہے"[3]

عورتیں عموماً نہایت دلیری کے ساتھ آپ سے بے محابا مسائل دریافت کرتی تھیں، اور صحابہ

---

[1] بخاری ص ٧٨٠، کتاب النکاح [2] صحیح بخاری مناقب عمر بن خطاب [3] مسلم کتاب العیدین

Marfat.com

کو ان کی اس جرأت پر حیرت ہوئی تھی لیکن آپ کسی قسم کی ناگواری نہیں ظاہر فرماتے تھے)

چونکہ عورتیں عموماً نازک طبع اور ضعیف القلب ہوتی ہیں، ان کی خاطرداری کا نہایت خیال رکھتے تھے۔

انجشہ نام ایک حبشی غلام حدی خوان تھے، یعنی اونٹ کے آگے حدی پڑھتے جاتے تھے۔ ایک دفعہ سفر میں ازواج مطہرات ساتھ تھیں۔ انجشہ حدی پڑھتے جاتے تھے، اونٹ زیادہ تیز چلنے لگے تو آپ نے فرمایا "انجشہ! دیکھنا شیشے (عورتیں) ٹوٹنے نہ پائیں"۔

حیوانات پر رحم حیوانات پر نہایت رحم فرماتے تھے، ان بے زبانوں پر جو ظلم مدت سے عرب میں چلے آتے تھے، موقوف کرادیے، اونٹ کے گلے میں قلادہ لٹکانے کا عام دستور تھا، اس کو روک دیا[1] (زندہ جانور کے بدن سے گوشت کا لوتھڑا کاٹ لیتے تھے اور اس کو پکا کر کھاتے تھے، اسکو منع کردیا جانور کی دم اور ایال کاٹنے سے بھی منع کیا اور فرمایا کہ "دم ان کا مورچھل ہے، اور ایال ان کا لحاف ہے۔ جانوروں کو دیر تک ساز میں باندھ کر کھڑا رکھنے کی بھی ممانعت کی اور فرمایا کہ "جانوروں کی پیٹھوں کو اپنی نشستگاہ اور کرسی نہ بناؤ"، اسی طرح جانوروں کو باہم لڑانا بھی ناجائز بتایا، ایک بے رحمی کا دستور یہ تھا کہ کسی جانور کو باندھ کر کا نشانہ بناتے تھے اور مشق تیراندازی کرتے تھے، اس سنگدلی کی بھی قطعی ممانعت کردی)

ایک دفعہ ایک گدہا راہ میں نظر پڑا جس کا چہرہ داغا گیا تھا۔ فرمایا کہ جس نے اس کا چہرہ داغا ہے اس پر خدا کی لعنت ہے"۔ علامت یا بعض دیگر ضرورتوں کی وجہ سے اونٹوں اور بکریوں کو داغنا پڑتا تھا، ایسی حالت میں آپ ان اعضا کو داغتے جو زیادہ نازک نہیں ہوتے تھے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ بکری کے

---

[1] صحیح مسلم باب اللباس والزینۃ

Marfat.com

ریوڑ میں گیا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بکریوں کے کان داغ رہے ہیں۔[1]

(ایک بار آپ کسی سفر میں جا رہے تھے، لوگوں نے مقام پر منزل کیا، وہاں ایک پرندہ نے انڈا دیا تھا، ایک شخص نے وہ انڈا اٹھا لیا، چڑیا بیقرار ہو کر پر مار رہی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ "اس کا انڈا چھین کر کس نے اس کو اذیت پہنچائی"۔ ان صاحب نے کہا "یا رسول اللہ! مجھ سے یہ حرکت ہوئی ہے"۔ آپ نے فرمایا "وہیں رکھ دو"۔[2]

ایک صحابی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، ان کے ہاتھوں میں چادر سے چھپے ہوئے کسی پرند کے بچے تھے، آپ نے دریافت فرمایا تو عرض کی کہ ایک جھاڑی سے آواز آ رہی تھی، جا کر دیکھا تو یہ بچے تھے، میں نے ان کو نکال لیا، پرندہ نے یعنی ان بچوں کی ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر منڈلانے لگی، آپ نے فرمایا "جاؤ اور بچوں کو وہیں پھر رکھ آؤ"۔[3]

ایک بار راستہ میں ایک اونٹ نظر سے گذرا جس کے پیٹ[4] اور پیٹھ شدتِ گرسنگی سے ایک ہو گئے تھے، فرمایا کہ "ان بے زبانوں کے متعلق خدا سے ڈرو"۔ ایک دفعہ ایک انصاری کے باغ میں آپ تشریف لے گئے، ایک گرسنہ اونٹ نظر پڑا، آپ کو دیکھ کر بلبلایا، آپ نے شفقت سے اس پر ہاتھ پھیرا، پھر لوگوں سے اس کے مالک کا نام پوچھا[5] معلوم ہوا کہ ایک انصاری کا ہے۔ ان سے آپ نے فرمایا کہ "اس جانور کے معاملہ میں تم خدا سے نہیں ڈرتے"۔)

رحمت و محبت عام | (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک تمام دنیا کے لیے رحمت بن کر آئی تھی، حضرت

---

[1] یہ حدیثیں ترمذی، ابوداؤد وغیرہ میں مذکور ہیں [2] ادب المفرد امام بخاری باب رحمۃ البہائم [3] مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد، باب رحمۃ اللہ [4] ابوداؤد کتاب الجہاد [5] ایضاً

Marfat.com

مسیح نے کہا تھا کہ "میں امن کا شاہزادہ ہوں" لیکن شہزادۂ امن کی اخلاقی حکومت کا ایک کارنامہ بھی اس کے ثبوت میں محفوظ نہیں لیکن امن کے شاہنشاہ کو خداوند ذوالجلال ہی نے خطاب کیا،

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ — محمد! ہم نے تجھکو تمام دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے

تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلم وعفو، مسامحت و درگذر کے سینکڑوں واقعات پڑھ چکے، نظر آیا ہوگا کہ اس خزانۂ رحمت میں دوست و دشمن، کافر و مسلم، بوڑھے بچے، عورت مرد، آقا و غلام انسان و حیوان ہر ایک صنف ہستی برابر کی حصہ دار تھی،

ایک صاحب نے آپ سے کسی پر بد دعا کرنے کی درخواست کی تو غضبناک ہو کر فرمایا "میں دنیا میں لعنت کے لیے نہیں آیا ہوں[۱]، رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں" آپ نے دنیا کو پیغام دیا،[۲]

لاتباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللہ اخوانا — ایک دوسرے سے بغض و حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے منھ پھیرو، اور اے خدا کے بندو سب آپس میں بھائی بھائی بنجاؤ،

ایک اور حدیث میں حکم فرمایا

احب للناس ما تحب لنفسک تکن مسلما[۳] — لوگوں کیلیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلم بنو گے

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا

لا یؤمن احدکم حتی یحب للناس ما یحب لنفسہ وحتی یحب المرء لا یحبہ الا للہ عزوجل — تم میں کوئی اسوقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جبتک وہ سب لوگوں کیلیے وہی محبوب رکھے جو اپنے لیے رکھتا ہے جبتک وہ دوسرے کو بے غرض صرف خدا کے لیے پیار نہ کرے

(مسند احمد جلد ۳ ص ۲۷۲)

---

[۱] زرقانی ج ۶ ص ۲۸۹ جلد ۴ [۲] صحیح بخاری باب الہجرۃ ص ۸۹۰ [۳] جامع ترمذی ابواب الزہد بسند غریب

ایک شخص نے مسجد نبوی میں آکر دعا کی "خدایا! مجھ کو اور محمد کو مغفرت عطا کر" آپ نے فرمایا "خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا"[1] ایک اور روایت میں ہے کہ ایک اعرابی مسجد نبوی[2] میں آیا اور آپ کے پیچھے نماز پڑھی، نماز پڑھ کر اپنے اونٹ پر سوار ہوا، اور بولا "خداوندا! مجھ پر اور محمد پر رحمت بھیج اور ہماری رحمت میں کسی اور کو شریک نہ کر" آپ نے صحابہ کی طرف خطاب کرکے فرمایا، بتاؤ یہ زیادہ راہ بھولا ہوا ہے یا اس کا اونٹ، یعنی آپ نے اس قسم کی دعا کو ناپسند فرمایا)

رقیق القلبی | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت رحمدل اور رقیق القلب تھے، (مالک بن حویرث ایک وفد کے رکن بنکر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تھے، ان کو بیس دن تک مجلس نبوی میں شرکت کا موقع ملا تھا، وہ فرماتے تھے،

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحیما رقیقاً[3] — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحیم المزاج اور رقیق القلب تھے،

حضرت زینب کا بچہ مر رہا تھا انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا بھیجا اور قسم دلائی کہ ضرور تشریف لائیے، مجبوراً آپ تشریف لے گئے، حضرت سعد بن عبادہ، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت بھی ساتھ تھے، بچہ کو لوگ ہاتھ میں لیکر سامنے لائے، وہ دم توڑ رہا تھا، بے اختیار آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، حضرت سعد کو تعجب ہوا کہ یا رسول اللہ! یہ کیا، فرمایا "خدا ان ہی بندوں پر رحم کرتا ہے جو اوروں پر رحم کرتے ہیں"[4]

غزوۂ احد کے بعد جب آپ مدینہ تشریف لائے تو گھر گھر شہیدوں کا ماتم برپا تھا، مستورات اپنے اپنے شہیدوں پر نوحہ کر رہی تھیں، یہ دیکھ کر آپ کا دل بھر آیا اور فرمایا "حمزہ (عم رسول اللہ) کا کوئی نوحہ خواں نہیں"[5]

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب [2] ابوداؤد کتاب الادب، شاید یہ دونوں واقعے ایک ہوں [3] بخاری ص ۸۸۰ باب رحمۃ الناس

[4] صحیح بخاری ص ۸۴۴ باب المرضیٰ [5] سیرۃ حلبیہ جلد اول، احد

ایک بار ایک صحابی جاہلیت کا اپنے ایک قصہ بیان کر رہے تھے کہ میری ایک چھوٹی لڑکی تھی، عرب میں لڑکیوں کے مار ڈالنے کا کہیں کہیں دستور تھا، میں نے بھی اپنی لڑکی کو زندہ زمین میں گاڑ دیا، وہ ابا ابا کہکر پکار رہی تھی، اور میں اس پر مٹی کے ڈھیلے ڈال رہا تھا، اس بیدردی کو سنکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے، آپنے فرمایا کہ "اس قصہ کو پھر دہراؤ"۔ ان صحابیؓ نے اس دردناک ماجرے کو دوبارہ بیان کیا، آپ بے اختیار روئے، یہانتک کہ روتے روتے محاسن مبارک تر ہوگئے۔[۱]

حضرت عباسؓ بدر میں گرفتار ہوکر آئے، تو لوگوں نے ان کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر باندھ دیے تھے، اور وہ درد سے کراہتے تھے، ان کے کراہنے کی آواز گوش مبارک میں بار بار پہنچ رہی تھی، لیکن اس خیال سے ان کے ہاتھ نہیں کھولتے تھے کہ لوگ کہیں گے کہ یہ اپنے عزیز کے ساتھ غیر مساویانہ رحمدلی ہے، تاہم نیند نہیں آتی تھی، آپ بے چین ہوکر کروٹیں بدل رہے تھے، لوگوں نے بیقراری کا سبب سمجھکر گرہیں ڈھیلی کردیں، حضرت عباسؓ کی کرب اور بیچینی رفع ہوئی تو آپنے استراحت فرمایا۔

مصعب بن عمیر ایک صحابی تھے، جو اسلام سے پہلے بہت ناز و نعمت میں پلے تھے، انکے والدین بیش قیمت سے بیش قیمت لباس ان کو پہناتے تھے، خدا نے ان کو اسلام کی توفیق عطا فرمائی اور وہ مسلمان ہوگئے، یہ دیکھکر لڑکے نے اپنے آبائی مذہب کو ترک کردیا، والدین کی محبت دفعۃً عداوت سے بدلگئی، ایک دفعہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں اس حال میں آئے کہ وہ جسم جو حریر و قاقم میں ملبوس رہتا تھا، اس پر پیوند سے ایک کپڑا سالم نہ تھا، یہ پر اثر منظر دیکھکر آپ آبدیدہ ہوگئے۔[۲]

عیادت و تعزیت و غمخواری و عزا | بیماروں کی عیادت میں دوست دشمن، مومن و کافر کسی کی تخصیص نہ تھی،

---

[۱] مسند دارمی ص اول [۲] ترغیب و ترہیب ج ۳ ص ۴۷ بحوالہ ترمذی و مسند ابو یعلی

(سنن نسائی باب التکبیر علی الجنازہ میں ہے کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم احسن شئ عیادۃ المریض، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیمار کی عیادت کا بہت اچھی طرح خیال رکھا کرتے تھے۔ بخاری و ابوداؤد وغیرہ) میں روایت ہے کہ ایک یہودی غلام مرض الموت میں بیمار ہوا تو آپ عیادت کو تشریف لے گئے۔[1]

عبداللہؓ بن ثابت جب بیمار ہوئے اور آپ عیادت کو گئے تو ان پر غشی طاری تھی۔ آواز دی، وہ بے خبر ہوئے، فرمایا "افسوس ابوالربیع تم پر ہمارا زور اب نہیں چلتا" یہ سن کر عورتیں بے اختیار چیخ اٹھیں، اور رونے لگیں، لوگوں نے روکا، آپ نے ارشاد فرمایا، اس وقت رونے دو، مرنے کے بعد البتہ رونا نہیں چاہیے" عبداللہؓ بن ثابت کی لڑکی نے کہا، مجھکو ان کی شہادت کی امید تھی، کیونکہ جہاد کے سب سامان تیار کر لیے تھے، آپ نے فرمایا "ان کو نیت کا ثواب مل چکا"۔[2]

حضرت جابرؓ بیمار ہوئے تو اگرچہ ان کا گھر فاصلہ پر تھا، پیادہ پا ان کی عیادت کو جایا کرتے تھے۔[3] ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے تو آپ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لیکر پیدل انکی عیادت کو گئے، ان پر غشی طاری تھی، پانی منگوا کر وضو کیا اور بچے ہوئے پانی کو ان کے منہ پر چھڑکا، جابرؓ ہوش میں آگئے، اور عرض کی یا رسول اللہ! اپنا ترکہ کس کو دوں، اس پر آیت اتری یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِی اَوْلَادِکُمْ۔[4]

ایک صاحب بیمار ہوئے، آپ چند دفعہ ان کی عیادت کو گئے، جب انھوں نے انتقال کیا تو لوگوں نے اس خیال سے کہ اندھیری رات ہے، آپ کو تکلیف ہوگی خبر نہ کی اور دفن کر دیا صبح کو معلوم ہوا تو آپ نے شکایت کی، اور قبر پر جا کر نماز جنازہ پڑھی۔[5]

عبداللہ بن عمروؓ نے غزوۂ احد میں شہادت پائی تھی، اور کافروں نے ان کے ہاتھ پاؤں

---

[1] صحیح بخاری باب عیادۃ المشرک [2] ابوداؤد باب الجنائز [3] ایضاً [4] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۵۵ و تفسیر آیت مذکور [5] بخاری کتاب الجنائز۔

کاٹ ڈالے تھے، ان کی لاش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لاکر رکھی گئی اور اس پر چادر ڈال دی گئی، انکے صاحبزادے (جابر) آئے، اور جوش محبت میں چاہا کہ کپڑا اٹھا کر دیکھیں، حاضرین نے روکا، انھوں نے دوبارہ بات بڑھایا، لوگوں نے پھر روک دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دردیدری کے خیال سے حکم دیا کہ چادر اٹھا دیجائے، چادر کا اٹھانا تھا کہ عبداللہؓ کی بہن بے اختیار چلا اٹھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، رونے کی بات نہیں، فرشتے ان کو اپنے پروں کے سایہ میں لے گئے،[۱]

ایک دفعہ حضرت سعد بن عبادہؓ بیمار ہوئے، آپ عیادت کو تشریف لے گئے، ان کو دیکھ کر آپ پر رقت طاری ہوئی اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے، آپ کو روتا دیکھ کر سب رو پڑے،[۲]

ایک حبشی مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا،[۳] مرگیا، تو لوگوں نے آپ کو خبر نہ کی، ایک دن آپ نے اسکا حال دریافت فرمایا، لوگوں نے کہا وہ انتقال کرگیا، ارشاد فرمایا کہ تم نے مجھکو خبر نہ کی، لوگوں نے اس کی تحقیر کی (یعنی وہ اس قابل نہ تھا کہ آپ کو اس کے مرنے کی خبر کیجاتی) آپ نے لوگوں سے اسکی قبر دریافت کی اور جاکر جنازہ کی نماز پڑھی،[۴]

جنازہ جاتا تو آپ کھڑے ہوجاتے، بخاری میں روایت ہے کہ آپنے فرمایا کہ جنازہ جاتا ہو تو یا اسکے ساتھ جاؤ، ورنہ کم ازکم کھڑے ہوجاؤ اور اس وقت تک کھڑے رہو کہ سامنے سے نکل جائے،[۵]

اگرچہ آپ نہایت رقیق القلب اور متاثر الطبع تھے، خصوصاً اعزہ کی وفات کا آپ کو سخت صدمہ ہوتا تھا، تاہم نوحہ اور ماتم کو نہایت ناپسند فرماتے تھے، حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی تھے) سے آپکو

---

[۱] بخاری جنائز ص ۲، [۲] بخاری جنائز ص ۴، [۳] (بخاری باب الصلوٰۃ علی القبر میں ابوہریرہؓ کی روایت کے راوی نے شک کیا ہے کہ یہ مرد تھا یا عورت لیکن دوسری روایتوں میں اس کا عورت ہونا بتحقیق ذکر ہے، ام محجن اس کا نام تھا) [۴] بخاری ص ۸، کتاب الجنائز [۵] بخاری ص ۱۷۵ ج ۱ کتاب الجنائز،

نہایت محبت تھی، جب ان کی شہادت کی خبر آئی تو آپ مجلس ماتم میں بیٹھے، اسی حالت میں کسی نے آکر کہا کہ جعفر کی عورتیں رو رہی ہیں، آپ نے فرمایا کہ جاکر منع کردو، وہ گئے اور واپس آکر کہا کہ میں نے منع کیا لیکن وہ باز نہیں آتیں، آپ نے دوبارہ منع کرا بھیجا، پھر بھی وہ باز نہ آئیں، سہ بارہ منع کرنے پر بھی جب وہ نہ مانیں تو فرمایا کہ جاکر ان کے منھ میں خاک ڈال دو،[1]

لطف طبع کبھی کبھی ظرافت کی باتیں فرماتے، ایک دفعہ حضرت انسؓ کو پکارا تو فرمایا "او دو کان والے"[2] اس میں یہ نکتہ بھی تھا کہ حضرت انسؓ نہایت اطاعت شعار تھے اور ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر کان لگائے رکھتے تھے، حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کا نام ابوعمیر تھا، وہ کمسن تھے، اور ایک ممولا پال رکھا تھا، اتفاق سے وہ مرگیا، ابوعمیر کو بہت رنج ہوا، آپ نے انکو غمزدہ دیکھا تو فرمایا یا اباعمیر ما فعل النغیر[3] یعنی ابوعمیر! تمھارے ممولے نے یہ کیا کیا،

ایک شخص نے خدمت اقدس میں عرض کی کہ مجھ کو کوئی سواری عنایت ہو، ارشاد ہوا کہ "میں تم کو اونٹنی کا بچہ دوں گا" انھوں نے کہا "یارسول اللہ میں اونٹنی کا بچہ لیکر کیا کرونگا" آپ نے فرمایا کہ "کوئی اونٹ ایسا بھی ہوتا ہے جو اونٹنی کا بچہ نہ ہو"

ایک بڑھیا خدمت اقدس میں آئی کہ حضور میرے لیے دعا فرمائیں کہ مجھکو بہشت نصیب ہو، آپ نے فرمایا بڑھیاں بہشت میں نہ جائیں گی، اس کو بہت صدمہ ہوا، اور روتی ہوئی واپس چلی، آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ اس سے کہدو کہ بڑھیاں جنت میں جائیں گی لیکن جوان ہوکر جائیں گی[4]

ایک بدوی صحابی تھے جنکا نام زاہرؓ تھا، وہ دیہات کی چیزیں آپ کی خدمت میں ہدیۃً بھیجا کرتے

---

[1] بخاری کتاب الجنائز باب من جلس عند المصیبۃ [2] شمائل ترمذی [3] صحیح بخاری [4] شمائل ترمذی

تھے، ایک دفعہ وہ شہر میں آئے، گاؤں سے جو چیزیں لائے تھے، ان کو بازار میں فروخت کر رہے تھے، اتفاقاً آپ ادھر سے گذرے، زاہرؓ کے پیچھے جا کر ان کو گود میں دبا لیا، انھوں نے کہا کون ہے چھوڑ دو، مڑ کر دیکھا تو سرور عالم تھے، اپنی پیٹھ اور بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ سے لپٹا دی، آپ نے فرمایا کوئی اس غلام کو خریدتا ہے! بولے کہ یا رسول اللہ مجھ جیسے غلام کو جو شخص خریدے گا نقصان اٹھائیگا، آپ نے فرمایا لیکن خدا کے نزدیک تمھارے دام زیادہ ہیں[1]،

ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ میرے بھائی کے شکم میں گرانی ہے، فرمایا شہد پلاؤ، وہ دوبارہ آئے کہ شہد پلایا لیکن شکایت اب بھی باقی ہے، آپ نے پھر شہد پلانے کی شکایت کی، سہ بارہ آئے پھر وہی جواب ملا، چوتھی دفعہ آئے تو ارشاد فرمایا کہ "خدا سچا ہے" (قرآن مجید میں ہے کہ شہد میں شفا ہے) لیکن تمھارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، جا کر "شہد پلاؤ" اب کی پلایا تو شفا ہو گئی[2]، معدہ میں مادۂ فاسد کثرت سے موجود تھا، جب پورا تنقیہ ہو گیا تو گرانی جاتی رہی،

اولاد سے محبت	اولاد سے نہایت محبت تھی، معمول تھا کہ جب کبھی سفر فرماتے تو سب سے آخر حضرت فاطمہؓ کے

پاس جاتے اور سفر سے واپس آتے تو جو شخص سب سے پہلے باریاب خدمت ہوتا وہ بھی حضرت فاطمہؓ ہی ہوتیں، ایک دفعہ کسی غزوہ میں گئے، اس اثنا میں حضرت فاطمہؓ نے دونوں صاحبزادوں (حسنین علیہما السلام) کے لیے چاندی کے کنگن بنوائے، اور دروازے پر پردے لٹکائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے تو خلاف معمول حضرت فاطمہؓ کے گھر نہیں گئے، وہ سمجھ گئیں، فوراً پردوں کو چاک کر ڈالا اور صاحبزادوں کے ہاتھ سے کنگن اتار لیے، صاحبزادے روتے ہوئے خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، آپ نے کنگن لیکر بازار

[1] شمائل ترمذی [2] بخاری ص ۸۴۹ باب الدواء بالعسل،

میں بھجدیئے کہ ان کے بدلے ہاتھی دانت کے کنگن لا دو،

حضرت فاطمہؓ جب آپ کی خدمت میں تشریف لاتیں تو آپ کھڑے ہو جاتے، ان کی پیشانی چومتے اور اپنی نشستگاہ سے ہٹ کر اپنی جگہ بٹھاتے،

ابو قتادہؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ مسجد نبویؐ میں حاضر تھے، کہ دفعۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امامہؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی تھیں) کو کندھے پر چڑھائے ہوئے تشریف لائے اور اسی حالت میں نماز پڑھائی، جب رکوع میں جاتے تو انکو اتار دیتے، پھر کھڑے ہوتے تو چڑھا لیتے، اسی طرح پوری نماز ادا کی[1]۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو اپنے خاندان سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جسقدر آپ کرتے تھے، آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم عوالی میں پرورش پاتے تھے، جو مدینہ سے تین چار میل ہے، ان کے دیکھنے کے لیے مدینہ سے پیادہ پا جاتے، گھر میں دھواں ہوتا رہتا تھا، گھر میں جاتے بچہ کو انا کے ہاتھ سے لے لیتے اور منہ چومتے، پھر مدینہ کو واپس آتے،

ایک دفعہ اقرع بن حابس عرب کے ایک رئیس خدمت اقدس میں آئے، آپ حضرت امام حسینؓ کا منہ چوم رہے تھے، عرض کی کہ میرے دس بچے ہیں میں نے کبھی کسی کو بوسہ نہیں دیا، ارشاد فرمایا کہ "جو اوروں پر رحم نہیں کرتا، اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا" (یعنی خدا اس پر رحم نہیں کرتا)

حسنین علیہما السلام سے بے انتہا محبت تھی، فرماتے تھے کہ میرے گلدستے ہیں، حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جاتے تو فرماتے کہ میرے بچوں کو لانا، وہ صاحبزادوں کو لاتیں، آپ انکو سونگھتے اور سینہ سے لپٹاتے،

---

[1] نسائی ص ۱۲۰ باب ادخال الصبیان فی المساجد، صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث مذکور ہے[2] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۹۱

ایک دفعہ مسجد میں خطبہ فرما رہے تھے، اتفاق سے حسنین علیہما السلام سرخ کرتے پہنے ہوئے آئے، کمسنی کی وجہ سے ہر قدم پر لڑکھڑاتے جاتے تھے، آپ ضبط نہ کرسکے منبر سے اتر کر گود میں اٹھا لیا اور اپنے سامنے بٹھا لیا، پھر فرمایا، خدا نے سچ کہا ہے، اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ، فرمایا کرتے تھے حسین میرا ہے اور میں حسین کا ہوں، خدا اس سے محبت رکھے جو حسین سے محبت رکھتا ہے۔

ایک دفعہ امام حسنؓ یا امام حسینؓ دوشِ مبارک پر سوار تھے، کسی نے کہا کیا سواری ہاتھ آئی ہے، آپ نے فرمایا اور سوار بھی کیسا ہے۔[1]

ایک دفعہ امام حسنؓ یا امام حسینؓ (راوی کو تعین یاد نہیں رہا) آپ کے قدم پر قدم رکھ کر کھڑے تھے، آپ نے فرمایا اوپر چڑھ آؤ، انھوں نے آپ کے سینہ پر قدم رکھ دیے، آپ نے منھ چوم کر فرمایا، اے خدا! میں اس سے محبت رکھتا ہوں تو بھی رکھ۔[2]

ایک دفعہ آپ کہیں دعوت میں جا رہے تھے، امام حسین علیہ السلام راہ میں کھیل رہے تھے، آپ نے آگے بڑھ کر ہاتھ پھیلا دیے، وہ ہنستے ہوئے پاس آآکر نکل جاتے تھے، بالآخر آپ نے ان کو پکڑ لیا، ایک ہاتھ ان کی ٹھوڑی پر اور ایک سر پر رکھ کر سینہ سے لپٹا لیا، پھر فرمایا کہ حسین میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔[3]

اکثر امام حسین علیہ السلام کو گود میں لیتے اور ان کے منھ میں منھ ڈالتے اور فرماتے کہ خدایا میں اس کو چاہتا ہوں اور اس کو بھی چاہتا ہوں جو اس کو چاہے۔

آپ کے داماد (حضرت زینبؓ کے شوہر) جب بدر سے قید ہو کر آئے تو فدیہ کی رقم ادا نہ کرسکے تو گھر

---

[1] یہ تمام روایتیں شمائل ترمذی میں مذکور ہیں، اخیر حدیث کے ایک راوی کی نسبت ترمذی نے لکھا ہے کہ بعض اہل علم نے اس کو ضعیف الحافظ کہا ہے [2] ادب المفرد بخاری ص ۱۰ [3] ایضاً ص ۴۷

کہلا بھیجا، حضرت زینبؓ نے اپنے گلے کا ہار بھیجدیا، یہ وہ ہار تھا کہ حضرت زینبؓ کے جہیز میں حضرت خدیجہؓ نے ان کو دیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہار دیکھا تو بیتاب ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے، پھر صحابہ سے فرمایا کہ اگر تمھاری مرضی ہو تو یہ ہار زینبؓ کو بھیجدوں، سب نے بسر و چشم منظور کیا،

حضرت زینبؓ کی کمسن صاحبزادی کا نام اُمامہ تھا، ان سے آپ کو بہت محبت تھی، آپ نماز پڑھنے میں بھی ان کو ساتھ رکھتے، جب آپ نماز پڑھتے تو وہ دوش مبارک پر سوار ہو جاتیں، رکوع کے وقت آپ ان کو کاندھے سے اتار دیتے تھے، پھر کھڑے ہوتے تو وہ پھر سوار ہو جاتیں، روایتوں کے الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کو کاندھوں پر بٹھا لیتے اور اتار دیتے تھے، لیکن ابن القیم نے لکھا ہے کہ یہ عمل کثیر ہے، وہ خود سوار ہو جاتی ہونگی اور منع نہ فرماتے ہوں گے،

(آپ کی ایک نواسی حالت نزع میں تھیں، صاحبزادی نے بلا بھیجا، آپ تشریف لے گئے، تو لڑکی اسی حالت میں آغوش مبارک میں رکھ دی گئی، آپ نے اس کی حالت دیکھی تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، حضرت سعدؓ نے کہا یا رسول اللہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں، آپ نے فرمایا یہ رحم ہے جس کو خدا نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔[1]

حضرت ابراہیم کی وفات میں بھی آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا تھا، آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں، دل غمزدہ ہو رہا ہے لیکن منھ سے ہم وہی باتیں کہیں گے جس کو خدا پسند کرتا ہے[2] لیکن یہ محبت صرف اپنے ہی آل و اولاد کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ عموماً بچوں سے آپ کو انس تھا)

---

[1] بخاری کتاب المرضیٰ ص ۸۴۴ [2] بخاری کتاب الجنائز ص ۱۷۴

ازواج مطہراتؓ

حضرت خدیجہؓ

سلسلہ نسب یہ ہے خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبد العزیٰ بن قصی، قصی پر پہنچکر ان کا خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے مل جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے وہ طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں، ان کی والدہ فاطمہ بنت زائدہ تھیں، ان کے والد اپنے قبیلہ میں ممتاز تھے، مکہ میں آکر سکونت اختیار کی، بنو عبد الدار کے حلیف بنے، عامر بن لوی کے خاندان میں فاطمہ بنت زائدہ سے نکاح کیا، ان کے بطن سے حضرت خدیجہؓ پیدا ہوئیں، انکی پہلی شادی ابوہالہ بن زرارہ تمیمی سے ہوئی، ان سے دو لڑکے پیدا ہوئے، ایک کا نام ہندؓ تھا اور دوسرے کا حارث، ابوہالہ کے انتقال کے بعد عتیق بن عائذ مخزومی کے عقد نکاح میں آئیں، ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، اسکا نام بھی ہند تھا، اسی بنا پر حضرت خدیجہؓ ام ہند کے نام سے پکاری جاتی تھیں، ہند نے اول اسلام قبول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مفصل حلیہ ان ہی کی روایت سے منقول ہے، نہایت فصیح و بلیغ تھے، حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ جمل میں شریک تھے، اور شہید ہوئے[۳]

عتیق کے انتقال کے بعد حضرت خدیجہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد نکاح میں آئیں جسکے مفصل حالات گذر چکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چھ اولادیں ہوئیں، دو صاحبزادے کہ دونوں بچپن میں انتقال کر گئے، اور چار صاحبزادیاں، حضرت فاطمہ زہراؓ، حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ، ان سب کے حالات آگے آئینگے

[۱] طبقات ابن سعد ذکر خدیجہ، کتاب النساء [۲] طبقات ابن سعد [۳] اصابہ ذکر ہند

Marfat.com

حضرت خدیجہؓ کی ایک بہن ہالہ تھیں، وہ اسلام لائیں اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد تک زندہ رہیں،

حضرت خدیجہؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بے انتہا محبت تھی، جب وہ عقد نکاح میں آئیں تو انکی عمر چالیس برس کی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پچیس ۲۵ سال کے تھے، نکاح کے بعد پچیس ۲۵ برس تک زندہ رہیں، انکی زندگی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری شادی نہیں کی، حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپ کا معمول تھا کہ جب کبھی گھر میں کوئی جانور ذبح ہوتا تو آپ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر حضرت خدیجہؓ کی ہمنشین عورتوں کے پاس گوشت بھجواتے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ گو میں نے خدیجہؓ کو نہیں دیکھا لیکن مجکو جسقدر ان پر رشک آتا تھا کسی اور پر نہیں آتا تھا، جسکی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ انکا ذکر کیا کرتے تھے، ایک دفعہ میں نے اس پر آپ کو رنجیدہ کیا لیکن آپنے فرمایا کہ "خدا نے مجکو انکی محبت دی ہے"۔[1]

ایک دفعہ ان کے انتقال کے بعد ان کی بہن ہالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آئیں اور استیذان کے قاعدہ سے اندر آنے کی اجازت مانگی، انکی آواز حضرت خدیجہؓ سے ملتی تھی، آپکے کانوں میں آواز پڑی تو حضرت خدیجہؓ یاد آگئیں اور آپ جھجک اٹھے اور فرمایا کہ "ہالہ ہونگی"، حضرت عائشہؓ بھی موجود تھیں، ان کو نہایت رشک ہوا، بولیں کہ "آپ کیا ایک بڑھیا کی یاد کرتے ہیں جو مر چکیں، اور خدا نے ان سے اچھی بیویاں دیں، صحیح بخاری میں یہ روایت یہیں تک ہے، لیکن استیعاب میں ہے کہ جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ہرگز نہیں، جب لوگوں نے میری تکذیب کی تو انھوں نے تصدیق کی، جب لوگ کافر تھے تو وہ اسلام لائیں، جب میرا کوئی معین نہ تھا تو انھوں نے میری مدد کی"۔

[1] صحیح مسلم فضائل خدیجہؓ

Marfat.com

حضرت سودہؓ بنت زمعہ

ازواج مطہرات میں یہ فضیلت صرف حضرت سودہؓ کو حاصل ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد سب سے پہلے وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد نکاح میں آئیں، وہ ابتدائے نبوت میں شرف باسلام ہو چکی تھیں، اس بنا پر ان کو قدیم الاسلام ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، انکی شادی پہلے سکران بن عمروؓ سے ہوئی تھی حضرت سودہؓ ان ہی کے ساتھ اسلام لائیں، اور ان ہی کیساتھ حبشہ کی طرف ہجرت (ہجرت ثانیہ) کی، حبشہ سے مکہ کو واپس آئیں، سکران نے کچھ دن کے بعد وفات پائی، اور ایک لڑکا یادگار چھوڑا، جس کا نام عبد الرحمٰن تھا، انھوں نے جنگ جلولاء میں شہادت حاصل کی،

حضرت خدیجہؓ کے انتقال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت پریشان و غمگین تھے، یہ حالت دیکھکر خولہ بنت حکیم نے عرض کی کہ آپ کو ایک مونس و رفیق کی ضرورت ہے، آپ نے فرمایا ہاں گھربار بال بچوں کا انتظام سب خدیجہ کے متعلق تھا، آپکے ایماء سے وہ حضرت سودہؓ کے والد کے پاس گئیں اور جاہلیت کے طریقہ پر سلام کیا انعم صباحًا، پھر نکاح کا پیغام سنایا، انھوں نے کہا ہاں محمد شریف کفو ہیں، لیکن سودہ سے بھی تو دریافت کرو، غرض سب مراتب طے ہوگئے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لے گئے، اور سودہ کے والد نے نکاح پڑھایا، چار سو درہم مہر قرار پایا، نکاح کے بعد عبد اللہ بن زمعہ (حضرت سودہؓ کے بھائی) جو اسوقت کافر تھے آئے، اور انکو یہ حال معلوم ہوا تو سر پر خاک ڈال لی کہ کیا غضب ہو گیا، چنانچہ اسلام لانے کے بعد اپنی اس حماقت پر ہمیشہ ان کو افسوس آتا تھا،

---

[1] طبقات میں ہے کہ رمضان سنہ ۱۰ھ میں انکا نکاح ہوا، زرقانی نے سنہ ۸ھ بھی لکھا ہے، یہ اختلاف اس بنا پر ہے کہ خود حضرت خدیجہؓ کے وفات کے سنہ میں اختلاف ہے۔

Marfat.com

حضرت عائشہؓ اور سودہؓ کا خطبہ اور نکاح چونکہ قریب قریب ایک ہی زمانہ میں ہوا، اس لیے مورخین میں اختلاف ہے کہ کس کو تقدم حاصل ہے، ابن اسحاق کی روایت ہے کہ سودہ کو تقدم ہے عبداللہ بن محمد عقیل کا قول ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کے بعد نکاح میں آئیں،

شکل وشباہت حضرت سودہؓ بلند بالا اور فربہ اندام تھیں اور اس وجہ سے تیزی کیساتھ چل پھر نہیں سکتی تھیں، حجۃ الوداع میں جب مزدلفہ سے روانہ ہونے کا وقت آیا تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی بنا پر سب سے پہلے چلنے کی اجازت مانگی کہ انکو بھیڑ بھاڑ میں چلنے سے تکلیف ہوگی، آیت حجاب سے پہلے عرب کے قدیم طرز پر ازواج مطہرات قضائے حاجت کے لیے صحرا کو جایا کرتی تھیں حضرت عمرؓ کو یہ ناگوار ہوتا تھا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پردہ کی تحریک کرتے رہتے تھے لیکن ابھی استدعا قبول نہیں ہوئی تھی کہ حضرت سودہؓ رات کے وقت قضائے حاجت کے لیے نکلیں، چونکہ ان کا قد نمایاں تھا، حضرت عمرؓ نے کہا، سودہؓ تم کو ہم نے پہچان لیا اسی واقعہ کے بعد آیت حجاب نازل ہوئی،[1]

اخلاق وعادات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات میں سخاوت و فیاضی ایک نمایاں وصف

---

[1] بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۰۶ آیت حجاب کے شان نزول میں سخت اختلافات ہیں، ایک روایت تو یہی ہے، دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ کے یہاں نیک و بد ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، کاش آپ ان کو پردے کا حکم دیتے، ابن جریر نے اپنی تفسیر میں مجاہد سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کیساتھ کھانا کھا رہے تھے حضرت عائشہؓ بھی شریک طعام تھیں، ایک آدمی کا ہاتھ حضرت عائشہؓ کے ہاتھ سے چھو گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار گذرا، اس پر یہ آیت حجاب اتری، عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت زینبؓ کے دعوت ولیمہ میں آیت حجاب نازل ہوئی، چنانچہ صحاح میں یہ واقعہ بہ تفصیل موجود ہے، حافظ ابن حجر نے ان روایتوں میں تطبیق دی ہے کہ آیت حجاب کے نزول کے متعدد اسباب تھے جن میں آخری سبب حضرت زینبؓ کا واقعہ تھا اور وہی آیت کا شان نزول ہے کیونکہ خود آیت میں واقعہ کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں (فتح الباری ج ۱ ص ۲۱۹)

Marfat.com

تھا، اس بنا پر صحابہ میں جس کو آپ سے جسقدر تقرب حاصل تھا اسی قدر اس پر اس وصف خاص کا زیادہ اثر پڑتا تھا، ازواج مطہرات کو آپ کے اخلاق و عادات و فیض صحبت سے متمتع ہونے کا زیادہ موقع حاصل تھا، اس لیے یہ وصف ان میں عموماً نظر آتا ہے، حضرت سودہؓ اس وصف میں باستثنائے حضرت عائشہؓ سب سے ممتاز تھیں، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے انکی خدمت میں ایک تھیلی بھیجی، لانے والے سے پوچھا اس میں کیا ہے، بولا درہم، بولیں کھجور کی تھیلی میں درہم بھیجے جاتے ہیں، یہ کہکر اسی وقت سب کو تقسیم کر دیا،

اطاعت اور فرمانبرداری بھی ان کا خاص وصف ہے، اور اس وصف میں وہ تمام ازواج مطہرات سے ممتاز ہیں،

روایت حدیث | ان کے ذریعہ سے صرف پانچ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے بخاری میں صرف ایک ہے صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور یحییٰ بن عبدالرحمن بن اسعد بن زرارہ نے ان سے روایت کی ہے،

وفات | حضرت سودہؓ کے سنہ وفات میں اختلاف ہے، واقدی کے نزدیک انھوں نے امیر معاویہؓ کے زمانہ خلافت ۵۴ھ میں وفات پائی، حافظ ابن حجر ان کا سال وفات ۵۵ھ قرار دیتے ہیں، امام بخاری نے تاریخ میں بسند صحیح روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ کی خلافت میں انتقال کیا، ذہبی نے تاریخ کبیر میں اتنا یہ اضافہ کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری زمانہ میں وفات کی حضرت عمرؓ نے ۲۳ھ میں وفات پائی ہے، اس لیے انکا زمانہ خلافت ۲۲ھ ہوگا خمیس میں ہے کہ یہی روایت سب سے زیادہ صحیح ہے۔[1]

حضرت عائشہؓ

عائشہؓ نام تھا، اگرچہ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، تاہم اپنے بھانجے عبداللہ بن زبیرؓ کے

---

[1] زرقانی ج ۳ ص ۲۶۲ میں بہ تفصیل مذکور ہے، طبقات ابن سعد میں صرف پہلی روایت نقل کی ہے۔ حضرت عائشہؓ کے حالات اور خصوصاً ان کے علمی اجتہادات کیلئے الگ مستقل تصنیف درکار ہے، یہاں صرف ضروری سوانح زندگی لکھ دیئے گئے ہیں،

ماں کا نام زینب اور ام رومان کنیت تھی، بعثت کے چار برس

سلم کیساتھ نکاح ہوا، اس وقت شش سالہ تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

ب تھیں، حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد خولہ بنت حکیم نے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کی تحریک کی، آپ نے رضامندی ظاہر کی، خولہ نے ام رومان سے کہا، انھوں
نے حضرت ابوبکرؓ سے مذکور کیا، بولے کہ جبیر بن مطعم سے وعدہ کرچکا ہوں اور میں نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی،
لیکن مطعم نے خود اس بنا پر انکار کردیا کہ اگر حضرت عائشہؓ ان کے گھر میں گئیں تو گھر میں اسلام کا قدم
آجائیگا۔ بہرحال حضرت ابوبکرؓ نے خولہ کے ذریعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عقد کردیا، چار سو درہم مہر
قرار پایا، لیکن مسلم میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ازواج مطہرات کا مہر پانسو درہم ہوتا تھا۔
نکاح کے بعد مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام ۳ سال تک رہا، سنہ ۱۳ میں آپ نے ہجرت کی تو حضرت
ابوبکرؓ ساتھ تھے، اہل و عیال کو مکہ چھوڑ آئے تھے، جب مدینہ میں اطمینان ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے عبداللہ
ابن اریقط کو بھیجا کہ ام رومان، اسماء اور عائشہ کو لے آئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زید بن حارثہ اور
ابو رافع کو حضرت فاطمہؓ، ام کلثومؓ اور حضرت سودہؓ وغیرہ کے لانے کیلیے روانہ فرمایا، مدینہ میں آکر حضرت عائشہؓ
سخت بخار میں مبتلا ہوئیں، اشتداد مرض سے سر کے بال تک جھڑ گئے، صحت ہوئی تو ام رومان کو رسم عروسی
ادا کرنے کا خیال آیا، اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر ۹ سال کی تھی، سہیلیوں کیساتھ جھولا جھول رہی تھیں
کہ ام رومان نے حضرت عائشہؓ کو آواز دی، انکو اس واقعہ کی خبر نہ تھی، ماں کے پاس آئیں، انھوں نے
منہ دھویا، بال درست کیے، گھر میں لے گئیں، انصار کی عورتیں انتظار میں تھیں، یہ گھر میں داخل ہوئیں تو

سب نے مبارکبادی دی، چاشت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور رسم عروسی ادا ہوئی، شوال میں نکاح ہوا تھا اور شوال ہی میں یہ رسم بھی ادا کی گئی، زمانۂ قدیم میں اس مہینہ میں طاعون آیا تھا، اس بنا پر اہل عرب اس مہینہ کو اس تقریب کے لیے مکروہ خیال کرتے تھے، اس خیال کے مٹانے کیلیے غالباً یہ مہینہ انتخاب کیا گیا تھا

وفات | حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ ۹ برس تک زندگی بسر کی، ۹ سال کی عمر میں وہ آپ کے پاس آئیں اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا تو انکی عمر ۱۸ سال کی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت عائشہؓ قریباً ۴۸ سال تک زندہ رہیں، ۵۸ھ میں وفات پائی، اسوقت انکی عمر ۶۷ سال کی تھی، وصیت کے مطابق جنۃ البقیع میں رات کے وقت دفن ہوئیں، قاسم بن محمد، عبداللہ بن عبدالرحمن، عبداللہ بن ابی عتیق، عروہ بن زبیر اور عبداللہ بن زبیرؓ نے قبر میں اتارا، اسوقت حضرت ابوہریرہؓ مروان بن حکم کی طرف سے مدینہ کے حاکم تھے، اس لیے انھوں نے نماز جنازہ پڑھائی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہؓ سے بہت محبت تھی، اسی محبت سے آپ نے مرض الموت میں تمام ازواج مطہراتؓ سے اجازت لی اور اپنی زندگی کے آخری دن حضرت عائشہؓ کے حجرے میں بسر کیے، اس محبت اظہار جن طریقوں سے ہوتا تھا انکے متعلق احادیث وسیر میں نہایت کثرت سے واقعات درج ہیں،

علمی زندگی | حضرت عائشہؓ کی علمی زندگی بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں فتوی دیتی تھیں، اکابر صحابہ پر انھوں نے دقیق اعتراضات کیے ہیں، جنکو علامہ سیوطی نے ایک رسالہ میں جمع کر دیا ہے، ان سے ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں، جن میں ۱۷۴ حدیثوں پر شیخین نے اتفاق کیا ہے، بخاری نے منفرداً ان سے ۵۴ حدیثیں روایت کی ہیں، ۶۹ حدیثوں میں امام مسلم منفرد ہیں، بعض لوگوں کا قول ہے کہ احکام شرعیہ کا ایک چوتھائی ان سے منقول ہے، ترمذی میں ہے کہ صحابہ کے سامنے

Marfat.com

جب کوئی مشکل سوال پیش آجاتا تھا تو اسکو حضرت عائشہؓ ہی حل کرتی تھیں، انکے شاگردوں کا بیان ہے کہ ہم نے ان سے زیادہ خوش تقریر نہیں دیکھا، تفسیر، حدیث، اسرار شریعت، خطابت اور ادب و انساب میں انکو کمال تھا، شعراء کے بڑے بڑے قصیدے انکو زبانی یاد تھے، حاکم نے مستدرک میں اور ابن سعد نے طبقات میں تفصیل ان واقعات کو لکھا ہے اور مسند ابن حنبل وغیرہ میں بھی جستہ جستہ انکے فضل و کمال کے دلائل و شواہد ملتے ہیں

حضرت حفصہؓ

حضرت حفصہؓ حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھیں، ماں کا نام زینب بنت مظعون تھا، بعثت سے پانچ برس پہلے جس سال جب قریش خانۂ کعبہ کو تعمیر کر رہے تھے پیدا ہوئیں، انکی پہلی شادی خنیسؓ ابن حذافہ سے ہوئی اور ان ہی کے ساتھ مدینہ کو ہجرت کی، خنیس نے غزوۂ بدر میں زخم کھائے اور واپس آکر ان ہی زخموں کی وجہ سے شہادت پائی[1]، خنیس نے اپنی یادگار میں حضرت حفصہؓ کے بطن سے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، حضرت حفصہؓ کے بیوہ ہو جانے کے بعد حضرت عمرؓ کو ان کے نکاح کی فکر ہوئی، سوء اتفاق سے اسی زمانہ میں حضرت رقیہؓ کا انتقال ہو چکا تھا، اس بنا پر سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے ان کے نکاح کی خواہش حضرت عثمانؓ سے کی، انھوں نے کہا میں اس معاملہ میں غور کروں گا، حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ

---

[1] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۷۰ عام طور پر یہی مشہور ہے لیکن اصابہ میں ہے کہ غزوۂ احد میں شہید ہوئے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے رقیہ کے انتقال کے بعد حضرت عثمانؓ سے انکے نکاح کی خواہش کی تھی، اور یہ مسلم ہے کہ حضرت رقیہؓ کا انتقال غزوۂ بدر کے بعد ہوا ، اور اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ شریک غزوۂ بدر نہ ہوسکے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خنیس نے غزوۂ بدر کے بعد وفات پائی، دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عثمانؓ مغموم بیٹھے ہوئے تھے حضرت عمرؓ ادھر سے گذرے اور پوچھا کہ حفصہ سے نکاح کرتے ہو، اس کی عدت گذر گئی، اگر خنیس نے احد میں شہادت پائی ہوتی تو انکی عدت کا زمانہ ۴ھ ہوتا، حالانکہ ان کا نکاح ۳ھ میں ہوا (فتح الباری ج ۹ ص ۱۵۲)

[2] طبری ج ۳ ص ۱۷۷۱

سے ذکر کیا، انھوں نے خاموشی اختیار کی، حضرت عمرؓ کو انکی بے التفاتی سے رنج ہوا، اسکے بعد خود جناب رسالت پناہ نے حضرت حفصہؓ سے نکاح کی خواہش کی، نکاح ہوگیا تو حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ سے ملے، اور کہا کہ جب تم نے مجھ سے حفصہ کے نکاح کی درخواست کی اور میں خاموش رہا تو تم کو ناگوار گذرا لیکن میں نے اسی بنا پر کچھ جواب نہیں دیا کہ رسول اللہؐ نے ان کا ذکر کیا تھا، اور میں آپ کا راز فاش کرنا نہیں چاہتا تھا، اگر رسول اللہؐ نے ان سے نکاح نہ کر لیا ہوتا تو میں اس کے لیے آمادہ تھا،[1]

حضرت حفصہؓ آخر حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں، اسلیے مزاج میں ذرا تیزی تھی، صحیح بخاری میں واقعہ ایلاء کے متعلق خود حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ "ہم لوگ زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کو کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے، میں ایک دن کسی معاملہ میں غور کر رہا تھا، اتفاق سے میری بی بی نے مجھکو مشورہ دیا، میں نے کہا تم کو ان معاملات میں کیا دخل ہے، بولیں کہ تم میری بات پسند نہیں کرتے، حالانکہ تمھاری بیٹی رسول اللہ کو برابر جواب دیتی ہے، میں اٹھا اور حفصہ کے پاس آیا، میں نے کہا بیٹی! تم رسول اللہ کو جواب دیتی ہو، یہاں تک کہ آپ دن بھر رنجیدہ رہتے ہیں، بولیں ہاں ہم ایسا کرتے ہیں، میں نے کہا خبردار میں تمھیں عذاب الٰہی سے ڈراتا ہوں، تم اس کے گھمنڈ میں نہ آجانا جس کے حسن نے رسول اللہ کو فریفتہ کر لیا ہے" (یعنی عائشہ)[2]

ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت صفیہؓ رو رہی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور رونے کی وجہ پوچھی، انھوں نے کہا "مجھکو حضرت حفصہؓ نے کہا ہے کہ تم یہودی کی بیٹی ہو" آپ نے فرمایا "تم نبی کی بیٹی ہو، تمھارا چچا پیغمبر ہے، اور پیغمبر کے نکاح میں ہو، حفصہ تم پر کس بات میں فخر کر سکتی ہے"[3]

ایک بار حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ نے حضرت صفیہؓ سے کہا کہ "ہم رسول اللہ کے نزدیک تم سے زیادہ

[1] بخاری ج ۲ ص ۵۷۸، [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۷۳۰، [3] ترمذی ص ۷۰۸ کتاب المناقب

Marfat.com

معزز ہیں، ہم آپ کی بیوی بھی ہیں اور چچازاد بہن بھی"۔ حضرت صفیہؓ کو ناگوار گذرا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسکی شکایت کی، آپ نے فرمایا کہ "تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ تم مجھ سے زیادہ کیونکر معزز ہو سکتی ہو، میرے شوہر محمدؐ، میرے باپ ہارونؑ اور میرے چچا موسیٰؑ ہیں"۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی بیٹیاں تھیں، جو تقرب نبوی میں باہم دوش بدوش تھے۔ اس بنا پر حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ دیگر ازواج کے مقابلہ میں باہم ایک تھیں۔ لیکن کبھی کبھی خود بھی باہم رشک رقابت کا اظہار ہو جایا کرتا تھا، ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھیں، رسول اللہؐ راتوں کو حضرت عائشہؓ کے اونٹ پر چلتے تھے اور ان سے باتیں کرتے تھے، ایک دن حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ آج رات کو تم میرے اونٹ پر، اور میں تمھارے اونٹ پر سوار ہوں تاکہ مختلف مناظر دیکھنے میں آئیں، حضرت عائشہؓ راضی ہو گئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کے اونٹ کے پاس آئے جس پر حفصہؓ سوار تھیں، جب منزل پر پہنچے اور حضرت عائشہؓ نے آپ کو نہیں پایا تو اپنے پاؤں کو اذخر (ایک گھاس ہے جسمیں سانپ بچھو رہتے ہیں) کے درمیان لٹکا کر کہنے لگیں "خداوندا! کسی بچھو یا سانپ کو متعین کر جو مجھے ڈس جائے"[1]۔

وفات حضرت حفصہؓ نے ۴۵ھ میں جو امیر معاویہؓ کی خلافت کا زمانہ تھا، وفات پائی، وفات سے پیشتر اپنے بھائی عبداللہ بن عمرؓ سے اس وصیت کی تجدید کی جو حضرت عمرؓ نے انکو کی تھی، کچھ جائداد بھی وقف کی اور کچھ مال صدقہ میں دیا، مروان بن حکم نے جو اس وقت مدینہ کا گورنر تھا، نماز جنازہ پڑھائی، اور نبی حزم

---

[1] اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیے کہ ازواج مطہرات میں اس قسم کی روایتیں صرف حفصہؓ و حضرت عائشہؓ کے متعلق مذکور ہیں، اسلیے اسباب کی تلاش کرنی چاہیے، حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کیساتھ منافقین کو جو عداوت تھی وہ قابل لحاظ ہے۔

Marfat.com

کے گھر سے مغیرہ بن شعبہ کے گھر تک جنازہ کو کاندھا دیا، یہاں سے قبر تک حضرت ابوہریرہؓ جنازہ کو لے گئے، انکے بھائی عبداللہ، عاصم، سالم، عبداللہ، حمزہ، عبداللہ بن عمرؓ کے لڑکوں نے قبر میں اتارا۔

زینب ام المساکینؓ

زینب نام تھا، چونکہ فقراء و مساکین کو نہایت فیاضی کے ساتھ کھانا کھلاتی تھیں، اس لیے ام المساکین کی کنیت کیساتھ مشہور ہوگئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عبداللہ بن جحش کے نکاح میں تھیں، عبداللہ بن جحش نے جنگ احد ۳ھ میں شہادت پائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سال ان سے نکاح کر لیا، نکاح کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف دو تین مہینے رہنے پائی تھیں کہ انکا انتقال ہوگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حضرت خدیجہؓ کے بعد صرف یہی ایک بی بی تھیں جنھوں نے وفات پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نماز جنازہ پڑھائی، اور جنۃ البقیع میں دفن ہوئیں، وفات کے وقت انکی عمر ۳۰ سال کی تھی،

حضرت ام سلمہؓ

ہند نام، ام سلمہ کنیت تھی، باپ کا نام سہیل اور ماں کا عاتکہ تھا، پہلے عبداللہ بن عبدالاسد کے نکاح میں آئیں جو زیادہ تر ابوسلمہ کے نام سے مشہور ہیں، اور جو ان کے چچازاد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی تھے، اپنے شوہر ہی کے ساتھ اسلام لائیں اور ان ہی کے ساتھ سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی،

لہ حضرت حفصہؓ کی سنہ وفات میں اختلاف ہے، ایک روایت ہے کہ انھوں نے جمادی الاولی سنہ ۴۱ھ میں وفات پائی، اسوقت انکا سن ۵۹ سال کا تھا، لیکن اگر سنہ وفات ۴۵ھ قرار دیا جائے تو ان کی عمر ۶۳ سال کی ہوگی، ایک روایت ہے کہ انھوں نے حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ۲۷ھ میں انتقال کیا، یہ روایت اس بنا پر کہی گئی کہ وہب بن مالک سے روایت کی کہ جس سال افریقہ فتح ہوا حفصہ نے اسی سال وفات پائی اور افریقہ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں سنہ ۲۷ھ میں فتح ہوا لیکن یہ سخت غلطی ہے، افریقہ دو مرتبہ فتح ہوا ہے، اس دوسری فتح کا فخر حضرت معاویہ بن خدیج کو حاصل ہے اور یہ فتح سنہ ۵۰ھ میں ہوئی، وہب بن مالک نے حفصہ کا سال وفات اسی فتح کے سنہ کو قرار دیا ہے

Marfat.com

چنانچہ سلمہ ان کے بیٹے حبشہ ہی میں پیدا ہوئے، حبشہ سے مکہ میں آئیں اور یہاں سے مدینہ کو ہجرت کی، ہجرت میں انکو یہ فضیلت حاصل ہوئی کہ اہل سیر کے نزدیک وہ پہلی عورت ہیں جو ہجرت کر کے مدینہ میں آئیں

ان کے پہلے شوہر ابو سلمہؓ بڑے شہسوار تھے مشہور غزوات بدر و احد میں شریک ہوئے، غزوۂ احد میں چند زخم کھائے جن کے صدمہ سے جانبر نہ ہو سکے۔ اور جمادی الثانی سنہ ۴ھ میں وفات پائی، ان کے جنازہ کی نماز نہایت اہتمام سے پڑھی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ تکبیریں کہیں، لوگوں نے نماز کے بعد پوچھا یا رسول اللہ! آپ کو سہو تو نہیں ہوا، فرمایا یہ ہزار تکبیر کے مستحق تھے۔

ابو سلمہؓ کی وفات کے وقت ام سلمہؓ حاملہ تھیں، وضع حمل کے بعد جب عدت گذر گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کرنا چاہا تو انھوں نے چند عذر پیش کیے:

۱۔ میں سخت غیور عورت ہوں۔

۲۔ صاحب عیال ہوں۔

۳۔ میرا سن زیادہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب زحمتوں کو گوارا کیا۔

وفات اہل سیر متفق اللفظ ہیں کہ ازواج مطہراتؓ میں سب کے بعد حضرت ام سلمہؓ نے وفات پائی لیکن ان کے سنہ وفات میں نہایت اختلاف ہے، واقدی نے سنہ ۵۹ھ بتایا ہے، ابراہیم حربی کے نزدیک سنہ ۶۲ھ ہے، اور تقریب میں اسی کو صحیح کہا ہے، امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے کہ ۵۸ھ میں وفات پائی بعض روایتوں میں ہے کہ سنہ ۶۱ھ میں جب امام حسینؓ کی شہادت کی خبر آئی، اس وقت ان کا انتقال ہوا ہے، ابن عبد اللہ نے اس روایت کی تصحیح کی ہے۔

Marfat.com

اس اختلافِ روایت کی حالت میں سنہ وفات کی تعیین مشکل ہے، تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ واقعۂ حرہ تک زندہ تھیں، مسلم میں ہے کہ حارث بن عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عبداللہ بن صفوان ام سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس لشکر کا حال پوچھا جو زمین میں دھنس جائیگا، یہ سوال اس وقت کیا گیا تھا جب یزید نے مسلم بن عقبہ کو لشکر شام کے ساتھ مدینہ کی طرف بھیجا تھا، اور واقعہ حرہ پیش آیا تھا، واقعہ حرہ ۶۳ھ میں پیش آیا ہے، اسلیے اس سے پہلے ان کی وفات کی تمام روایتیں صحیح نہیں۔

ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ حضرت ام سلمہؓ کی وصیت کی بنا پر سعید بن زید نے نماز جنازہ پڑھائی، لیکن اس روایت کی صحت میں کلام ہے، سعید بن زید نے باختلاف روایت ۵۱ھ یا ۵۲ھ یا ۵۸ھ میں انتقال کیا ہے، اور یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ اس وقت ام سلمہؓ زندہ تھیں، واقدی نے لکھا ہے کہ ابوہریرہؓ نے انکا جنازہ پڑھایا، مگر انکی وفات کے وقت سعید بن زید زندہ ہوتے تو حضرت ابوہریرہؓ خلاف وصیت کیونکر نماز جنازہ پڑھ سکتے تھے، بہر حال ازواج مطہرات میں سب کے بعد حضرت ام سلمہؓ نے وفات پائی، اور وفات کے وقت ان کی عمر ۸۴ سال کی تھی،

فضل وکمال ازواج مطہرات میں حضرت عائشہؓ کے بعد فضل وکمال میں ان ہی کا درجہ ہے، ابن سعد نے طبقات میں اس کی تصریح کی ہے، روایت حدیث اور نقل احکام میں حضرت عائشہؓ کے سوا اور تمام بی بیوں پر ان کو فضیلت حاصل ہے، صلح حدیبیہ میں جب صحابہ کو مکہ سے باہر حلق اور قربانی میں تامل تھا، تو حضرت ام سلمہؓ ہی کی تدبیر سے یہ مشکل حل ہوئی اور ان کی یہ دانشمندی اور عقل وذہانت کی سب سے بہتر مثال ہے، یہ واقعہ صحیح بخاری میں بہ تفصیل موجود ہے۔

Marfat.com

حضرت زینب رضؓ

ازواجِ مطہرات میں جو بیبیاں حضرت عائشہؓ کی ہمسری کا دعویٰ رکھتی تھیں ان میں حضرت زینبؓ بھی تھیں، خود حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کانت تسامینی یعنی وہ میرا مقابلہ کرتی تھیں اور ان کو اس کا حق بھی تھا نسبی حیثیت سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں جمال میں بھی ممتاز تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان سے نہایت محبت تھی، زہد و ورع میں یہ حال تھا کہ جب حضرت عائشہؓ پر اتہام لگایا گیا اور اس اتہام میں خود حضرت زینبؓ کی بہن حمنہ شریک تھیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے حضرت عائشہؓ کی اخلاقی حالت دریافت کی تو انھوں نے صاف لفظوں میں کہدیا

ماعلمت الا خیراً — مجکو حضرت عائشہؓ کی بھلائی کے سوا کسی چیز کا علم نہیں۔

حضرت عائشہؓ کو ان کے اس صدق و اقرارِ حق کا خود اعتراف کرنا پڑا،

عبادت میں نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ مشغول رہتی تھیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو عقد میں لانا چاہا تو انھوں نے کہا کہ میں بغیر استخارہ کے کوئی رائے قائم نہیں کرتی،

ایک دفعہ آپ مہاجرین پر کچھ مال تقسیم کر رہے تھے، حضرت زینبؓ اس معاملہ میں کچھ بول اٹھیں، حضرت عمرؓ نے ڈانٹا، آپنے فرمایا ان سے درگذر کرو، یہ اواہ ہیں (یعنی خاشع و متضرع ہیں)

نہایت قانع اور فیاض طبع تھیں، خود اپنے دست و بازو سے معاش پیدا کرتی تھیں، اور اس کو خدا کی راہ میں لٹا دیتی تھیں، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ان کا سالانہ نفقہ بھیجا، انھوں نے اس پر ایک کپڑا ڈالدیا اور برزہ بنت رافع کو حکم دیا، میرے خاندانی رشتہ داروں اور یتیموں کو تقسیم کردو، برزہ نے کہا آخر ہمارا بھی کچھ حق ہے، انھوں نے کہا کہ کپڑے کے نیچے جو کچھ ہے وہ تمھارا ہے، دیکھا تو پچاسی درہم نکلے جب تمام

Marfat.com

مال تقسیم ہوچکا تو دعا کی کہ خدایا اس سال کے بعد میں عمرؓ کے عطیہ سے فائدہ نہ اٹھاؤں، یہ دعا مقبول ہوئی اور اسی سال ان کا انتقال ہوگیا،

وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات سے فرمایا تھا

اسرعکن لحاقابی اطولکن یدا — تم میں مجھ سے جلد وہ ملے گی جس کا ہاتھ لمبا ہوگا

یہ استعارۃً فیاضی کیطرف اشارہ تھا لیکن ازواج مطہرات اسکو حقیقت سمجھیں چنانچہ باہم اپنے ہاتھوں کو ناپا کرتی تھیں حضرت زینبؓ اپنی فیاضی کی بنا پر اس پیشینگوئی کا مصداق ثابت ہوئیں، اور ازواج مطہرات میں سب سے پہلے انتقال کیا، کفن کا خود سامان کرلیا تھا، اور وصیت کی تھی کہ حضرت عمرؓ بھی کفن دیں تو ان میں سے ایک صدقہ کردینا، چنانچہ یہ وصیت پوری کی گئی حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی، اس کے بعد ازواج مطہرات سے دریافت کیا کہ کون قبر میں داخل ہوگا، انھوں نے کہا وہ شخص جو ان کے گھر میں داخل ہوا کرتا تھا، (چنانچہ اسامہؓ، محمد بن عبداللہ بن جحش، عبداللہ بن ابی احمد بن جحش نے ان کو قبر میں اتارا)

سنہ ۲۰ھ میں انتقال کیا اور ۵۳ برس کی عمر پائی، واقدی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس وقت ان کا نکاح ہوا اس وقت ۳۵ سال کی تھیں،

حضرت جویریہؓ

حضرت جویریہؓ حارث بن ضرار کی بیٹی تھیں جو قبیلہ بنی مصطلق کا سردار تھا، مسافع بن صفوان سے شادی ہوئی تھی، جو غزوہ مریسیع میں قتل ہوا، اس لڑائی میں کثرت سے لونڈی غلام مسلمانوں کے ہاتھ آئے، ان ہی لونڈیوں میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں، جب مال غنیمت کی تقسیم ہوئی تو وہ ثابت بن

Marfat.com

قیس بن شماس انصاری کے حصہ میں آئیں،

اسلام میں اگر آقا راضی ہو تو لونڈی غلام کچھ رقم ادا کرکے آزاد ہو سکتے ہیں، اس طریقہ کو فقہاء کی اصطلاح میں کتابت کہتے ہیں، اسی اصول کے موافق حضرت جویریہؓ مکاتبہ بن گئیں، ان کو شرط کے موافق ۹ اوقیہ سونا ادا کرنا تھا لیکن یہ رقم ان کی استطاعت سے بہت زیادہ تھی، وہ رسول اللہ کے پاس آئیں اور کہا "یا رسول اللہ! میں مسلمان کلمہ گو عورت اور جویریہ حارث کی بیٹی ہوں جو اپنی قوم کا سردار ہے، مجھ پر جو مصیبتیں آئی ہیں، وہ آپ سے مخفی نہیں ہیں ثابت بن قیس کے حصہ میں آئی اور ۹ اوقیہ سونے پر ان سے عہد کتابت کیا، یہ رقم میرے امکان میں نہ تھی لیکن میں نے آپ کے بھروسہ پر اسکو منظور کرلیا اور اب آپ سے اس کا سوال کرنے کے لیے آئی ہوں" آپ نے فرمایا تو کیا تم کو اس سے بہتر چیز کی خواہش نہیں ہے؟ انھوں نے کہا وہ کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا میں یہ رقم ادا کر دیتا ہوں اور تم سے نکاح کر لیتا ہوں، وہ راضی ہو گئیں، آپ نے ثابت بن قیس کو بلایا، وہ بھی راضی ہو گئے، آپ نے رقم ادا کی اور ان کو آزاد کرکے نکاح کر لیا، یہ خبر چاہ پھیلا تو لوگوں نے قبیلہ بنی مصطلق کے تمام لونڈی غلاموں کو اس بنا پر آزاد کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے رشتۂ مصاہرت قائم کرلیا، آزاد شدہ غلاموں کی تعداد ایک روایت میں سات سو بتائی گئی ہے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ "جویریہ کی برکت سے سیکڑوں گھرانے آزاد کر دیے گئے" بعض روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود حضرت جویریہؓ نے یہ خواہش ظاہر کی تھی، اور آپ نے تمام قیدیوں کو ان پر ہبہ کر دیا تھا،

حضرت جویریہؓ نے ۵۰ھ میں وفات پائی اور جنۃ البقیع میں دفن ہوئیں، اس وقت انکا سن ۶۵ برس کا تھا،

حضرت ام حبیبہؓ

رملہ نام اور ام حبیبہ کنیت تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ۱۷ سال پہلے پیدا ہوئیں، اور عبید اللہ بن جحش سے

عقد ہو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو دونوں مشرف باسلام ہوئے اور حبشہ کی طرف ہجرت ثانیہ کی، ایک روایت ہے کہ انکی بیٹی حبیبہ جنکی کنیت کے ساتھ وہ مشہور ہیں، حبشہ ہی میں پیدا ہوئیں، حبشہ میں جاکر عبید اللہ بن جحش نے عیسائیت قبول کرلی لیکن ام حبیبہؓ اسلام پر قائم رہیں، اختلاف مذہب کی بنا پر عبید اللہ بن جحش نے ان سے علیحدگی اختیار کی، اور اب وہ وقت آگیا کہ انکو اسلام اور ہجرت کی فضیلت کے ساتھ ام المومنین بننے کا شرف بھی حاصل ہو، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن امیہ الضمری کو نجاشی کی خدمت میں بغرض نکاح بھیجا جب وہ نجاشی کے پاس پہنچے تو نجاشی نے ام حبیبہ کو اپنی لونڈی ابرہہ کے ذریعہ سے پیام دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجکو تمہارے نکاح کے لیے لکھا ہے، انھوں نے خالد بن سعید اموی کو وکیل مقرر کیا اور اس مژدہ کے صلہ میں ابرہہ کو چاندی کے دو کنگن اور انگوٹھیاں دیں، جب شام ہوئی تو نجاشی نے جعفرؓ بن ابی طالب اور وہاں کے مسلمانوں کو جمع کرکے خود نکاح پڑھایا[1]، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف سے چارسو دینار مہر ادا کیا[2]۔

تمام لوگوں کے سامنے خالد بن سعید کو یہ رقم دیگئی تو لوگوں نے بعد نکاح اٹھنا چاہا لیکن نجاشی نے کہا "دعوت ولیمہ تمام پیغمبروں کی سنت ہے، ابھی بیٹھنا چاہیے" چنانچہ کھانا آیا، لوگ دعوت کھاکے رخصت ہوئے، جب مہر کی رقم ام حبیبہؓ کو ملی تو انھوں نے پچاس دینار ابرہہ کو دیے لیکن اس نے اس رقم کو

---

[1] سال نکاح میں اختلاف ہے، مشہور یہ ہے کہ ۶ھ میں نکاح ہوا لیکن بعض روایتوں میں ۷ھ بھی بیان کیا گیا ہے، ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن الضمری کو بغرض نکاح بھیجا ہو، اور ۷ھ میں نکاح پڑھا گیا ہو، اس میں بھی اختلاف ہے کہ نکاح کہاں ہوا، اور کس نے پڑھایا، لیکن صحیح یہ ہے کہ حبشہ میں نکاح ہوا اور نجاشی نے نکاح پڑھایا [2] صحیح روایت یہی ہے، لیکن اور بھی مختلف تعداد بیان کی گئی ہے، بعض روایتوں میں نوسو دینار ہے، بعضوں کے نزدیک چار ہزار دینار ہے، ابوداؤد میں دینار کے بجائے چار ہزار درہم ہے، زہری کی روایت میں چالیس اوقیہ کی تعداد کا ذکر ہے، اس لیے اگر چاندی ہوگی تو اس کے سولہ سو درہم ہوتے ہیں،

Marfat.com

اس کنگن کے ساتھ جو پہلے دیے گئے تھے، یہ کہکر واپس کر دیا کہ بادشاہ نے مجکو منع کر دیا ہے، دوسرے روز ان کی خدمت میں عود، زعفران، عنبر وغیرہ لے کر آئی جن کو وہ اپنے ساتھ رسول اللہ کی خدمت میں لائیں، جب نکاح کے تمام رسومات ادا ہو گئے، تو نجاشی نے ان کو شرجیل بن حسنہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا،

ام حبیبہؓ نے ۴۴ھ میں وفات پائی[1]، اور مدینہ میں دفن ہوئیں،

حضرت میمونہؓ

میمونہ نام، باپ کا نام حارث، اور ماں کا نام ہند تھا، پہلے مسعود بن عمرو بن عمیر الثقفی کے نکاح میں تھیں، مسعود نے طلاق دیدی، تو ابورہم بن عبدالعزی نے نکاح کر لیا، ابورہم کے انتقال کے بعد رسول اللہؐ کے نکاح میں آئیں، نکاح کے متعلق مختلف روایتیں ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ہبہ کیا،

دوسری روایت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے اپنے غلام ابو رافع کو اوس ابن خولی کے ساتھ وکیل بنا کر بھیجا، اور انھوں نے ایجاب قبول کیا، لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ حضرت عباسؓ نے اس نکاح کی تحریک کی اور ان ہی نے نکاح پڑھایا۔

وفات | یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ مقام سرف میں انکا نکاح ہوا تھا اور سرف ہی میں انھوں نے انتقال بھی کیا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور قبر میں اتارا، صحاح میں ہے کہ

[1] بعضوں نے سالِ وفات ۴۲ھ لکھا ہے، ابن ابی خیثمہ کے نزدیک ان کا سال وفات ۵۹ھ ہے بعض لوگوں نے ۵۰ھ اور بعضوں نے ۵۵ھ بیان کیا ہے، ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ دمشق میں مدفون ہوئیں،

Marfat.com

جب انکا جنازہ اٹھایا گیا تو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے کہا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بی بی ہیں، جنازہ کو زیادہ حرکت نہ دو، با ادب آہستہ لے چلو۔

سال وفات کے متعلق اگرچہ اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ انھوں نے ۵۱ھ میں وفات پائی۔

حضرت صفیہؓ

صفیہ اصل نام نہ تھا، زرقانی نے لکھا ہے کہ عرب میں مال غنیمت کا جو بہترین حصہ امام یا بادشاہ کے لیے مخصوص ہوجاتا تھا، اس کو صفیہ کہتے تھے، چونکہ وہ جنگ خیبر میں اسی طریقہ کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئی تھیں، اس لیے صفیہ کے نام سے مشہور ہوگئیں، ورنہ اصلی نام زینب تھا۔ باپ کا نام حیی بن اخطب اور ماں کا نام ضرہ تھا، حضرت صفیہؓ کو باپ اور ماں دونوں کیجانب سے سیادت حاصل تھی، باپ قبیلہ بنو النضیر کا سردار اور ماں قریظہ کے رئیس کی بیٹی تھی، حضرت صفیہؓ کی شادی پہلے سلام بن مشکم القرصی سے ہوئی تھی، ابن مشکم نے طلاق دی تو کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں آئیں، کنانہ جنگ خیبر میں مقتول ہوا، حضرت صفیہؓ کے باپ اور بھائی بھی کام آئے، اور خود بھی گرفتار ہوئیں، جب خیبر کے تمام قیدی جمع کیے گئے تو دحیہ کلبیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک لونڈی کی درخواست کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتخاب کرنے کی اجازت دی، انھوں نے حضرت صفیہؓ کو منتخب کیا، لیکن ایک صحابی نے آپ کی خدمت میں آکر عرض کی کہ آپ نے رئیسہ بنو نضیر و قریظہ کو دحیہ کو دیدیا، وہ تو صرف آپ کے قابل ہے، آپ نے حکم دیا کہ دحیہ اس عورت کے ساتھ حاضر ہوں، وہ صفیہ کو لیکر آئے تو آپ نے ان کو دوسری لونڈی عنایت فرمائی، اور صفیہ کو آزاد کرکے نکاح کرلیا، خیبر سے روانہ ہوئے تو مقام صہبا میں رسم عروسی ادا کی، اور جو کچھ سامان لوگوں کے پاس تھا اسکو

Marfat.com

جمع کرکے دعوت ولیمہ فرمائی، وہاں سے روانہ ہوئے تو آپ نے ان کو خود اپنے اونٹ پر سوار کرلیا، اور اپنے عبا سے ان پر پردہ کیا، یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ وہ ازواج مطہرات میں داخل ہوگئیں۔

حضرت صفیہؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبت تھی، اور ہر موقع پر ان کی دلجوئی فرماتے تھے، ایک بار آپ سفر میں تھے، ازواج مطہرات بھی ساتھ تھیں، حضرت صفیہؓ کا اونٹ سوء اتفاق سے بیمار ہوگیا، حضرت زینبؓ کے پاس ضرورت سے زیادہ اونٹ تھے، آپ نے ان سے کہا کہ ایک اونٹ صفیہ کو دیدو، انھوں نے کہا کیا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دوں؟ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اسقدر ناراض ہوئے کہ دو مہینے تک ان کے پاس نہ گئے۔

ایک بار آپ حضرت صفیہؓ کے پاس تشریف لے گئے، دیکھا کہ رو رہی ہیں، آپ نے رونے کی وجہ پوچھی، انھوں نے کہا کہ عائشہؓ اور زینبؓ کہتی ہیں کہ "ہم ازواج میں افضل ہیں، ہم آپ کی زوجہ ہونے کے ساتھ آپ کی چچا زاد بہن بھی ہیں" آپ نے فرمایا تم نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ ہارون میرے باپ، موسیٰؑ میرے چچا اور محمدؐ میرے شوہر ہیں، اس لیے تم لوگ کیونکر مجھ سے افضل ہوسکتی ہو؟

حضرت صفیہؓ نے ۵۰ھ میں وفات پائی اور جنۃ البقیع میں دفن ہوئیں۔

Marfat.com

اولاد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کی تعداد میں سخت اختلاف ہے، متفق علیہ روایت یہ ہے کہ آپ کے چھ اولادیں تھیں، قاسم، ابراہیم، زینب، رقیہ، ام کلثوم، فاطمہ، ان تمام لڑکیوں نے اسلام کا زمانہ پایا اور ہجرت سے شرف اندوز ہوئیں، لیکن ابن اسحاق نے دو صاحبزادوں کا نام اور لیا ہے، طاہر طیب، اس بنا پر اولاد ذکور کی تعداد لڑکیوں کے برابر ہو جاتی ہے۔

اس بارہ میں تمام اقوال کے جمع کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ اولادیں تھیں جن میں آٹھ لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں، لڑکیوں کی تعداد میں کسی قسم کا اختلاف نہیں، البتہ صاحبزادوں کی تعداد میں سخت اختلاف ہے، مجموعی تعداد آٹھ تک پہنچی ہے، جن میں قاسم اور ابراہیم پر تمام راویوں کا اتفاق ہے، حضرت ابراہیم ماریہ قبطیہؓ سے اور بقیہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے تھیں۔[1]

حضرت قاسمؓ

آپ کی اولاد میں سب سے پہلے حضرت قاسمؓ پیدا ہوئے (اور غالباً نبوت سے گیارہ برس پہلے پیدا ہوئے ہوں گے) مجاہد کے نزدیک یہ صرف سات دن زندہ رہے، ابن سعد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سال تک زندہ رہے، ابن فارس نے لکھا ہے کہ سن تمیز کو پہنچ گئے تھے۔

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں جس طرح یہ سب سے پہلے پیدا ہوئے تھے، اسی طرح سب سے پہلے انتقال بھی کیا، عام روایت یہ ہے کہ قبل بعثت وفات پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ابوالقاسم ان ہی کے انتساب سے ہے، آپ اس کنیت کو بہت پسند فرماتے تھے صحابہ بھی جب آپ کو محبت سے نام لیتے ابوالقاسم ہی کہتے۔ ایک دن

[1] زرقانی ج ۳ ص ۲۲۱

Marfat.com

آپ بازار سے گذر رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے یا ابا القاسم کہکر آواز دی، آپ نے مڑکر دیکھا تو اس نے کہا، یا رسول اللہ میں اسی نام کے ایک شخص کو پکار رہا ہوں، رفع اشتباہ کیلئے پھر آپ نے منع فرمادیا کہ کوئی یہ کنیت نہ رکھے۔

حضرت زینبؓ

اہل سیر کا اتفاق ہے کہ لڑکیوں میں سب سے بڑی تھیں، زبیر بن بکار کا قول ہے کہ حضرت قاسمؓ کے بعد پیدا ہوئیں لیکن ابن کلبی کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی اولاد حضرت زینبؓ ہی ہیں، بعثت سے دس برس پہلے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۳۰ سال کی تھی، پیدا ہوئیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی تو اہل وعیال مکہ میں رہ گئے تھے، حضرت زینبؓ کی شادی ان کے خالہ زاد بھائی ابو العاص بن ربیع لقیط سے ہوئی، غزوہ بدر میں ابو العاص گرفتار ہو گئے، جب رہا کیے گئے تو ان سے وعدہ لیا گیا کہ مکہ جا کر حضرت زینبؓ کو بھیج دینگے ابو العاص نے مکہ جا کر اپنے بھائی کنانہ کیساتھ ان کو مدینہ کیطرف روانہ کیا، چونکہ کفار کے تعرض کا خوف تھا، کنانہ نے ہتھیار ساتھ لے لیے تھے، مقام ذی طوی میں پہنچے تو کفار قریش کے چند آدمیوں نے تعاقب کیا، ہبار بن اسود نے حضرت زینبؓ کو نیزہ سے زمین پر گرادیا، وہ حاملہ تھیں حمل ساقط ہو گیا، کنانہ نے ترکش سے تیر نکالے اور کہا کہ "اب اگر کوئی قریب آیا تو ان تیروں کا نشانہ ہوگا" لوگ ہٹ گئے، تو ابو سفیان سرداران قریش کے ساتھ آیا، اور کہا "تیر روک لو ہم کو کچھ گفتگو کرنی ہے" انھوں نے تیر ترکش میں ڈالدیے، ابو سفیان نے کہا "محمدؐ کے ہاتھ سے جو مصیبتیں پہنچی ہیں تم کو معلوم ہیں، اب اگر تم علانیہ ان کی لڑکی کو ہمارے قبضہ سے نکال کر لے گئے تو لوگ کہیں گے کہ ہماری کمزوری ہے، ہم کو زینب کے روکنے کی ضرورت نہیں جب شور وہنگامہ کم ہو جائے، اس وقت چوری چھپے لیجانا۔"

Marfat.com

کنانہ نے یہ رائے تسلیم کی اور چند روز کے بعد انکو رات کے وقت لیکر روانہ ہوئے، زید بن حارثہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی بھیجدیا تھا، وہ بطن یاجج میں تھے، کنانہ نے زینبؓ کو انکے حوالے کیا، وہ انکو لیکر روانہ ہوگئے،

حضرت زینبؓ مدینہ میں آئیں اور اپنے شوہر ابوالعاص کو حالت شرک میں چھوڑا، ابوالعاص دوبارہ ایک سریہ میں گرفتار ہوئے[1]، اسوقت بھی حضرت زینبؓ نے انکو پناہ دی، مکہ جاکر انھوں نے لوگوں کی امانتیں حوالے کیں، اور اسلام لائے، اسلام لانے کے بعد ہجرت کرکے مدینہ آئے حضرت زینبؓ نے انکو حالت شرک میں چھوڑا تھا، اسلیے دونوں میں باہم تفریق ہوگئی تھی، وہ مدینہ آئے تو حضرت زینبؓ دوبارہ انکے نکاح میں آئیں، ترمذی وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ کوئی جدید نکاح نہیں ہوا، لیکن دوسری روایت میں جدید نکاح کی تصریح ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کو اگرچہ اسناد کے لحاظ سے دوسری روایت پر ترجیح ہے لیکن فقہانے دوسری روایت پر عمل کیا ہے، اور حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ کی یہ تاویل کی ہے کہ نکاح جدید کے مہر اور شرائط وغیرہ میں کسی قسم کا تغیر نہ ہوا ہوگا، اس لیے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اسکو نکاح اول سے تعبیر کیا، ورنہ بعد تفریق نکاح ثانی ضروری ہے،

ابوالعاص نے حضرت زینبؓ کے ساتھ نہایت شریفانہ برتاؤ کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شریفانہ تعلقات کی تعریف کی، نکاح جدید کے بعد حضرت زینبؓ بہت کم زندہ رہیں، ۷ھ یا ۸ھ میں (باختلاف روایت) ابوالعاص اسلام لائے تھے، اور اسیلے ۸ھ میں حضرت زینبؓ نے انتقال کیا،

---

[1] اصابہ میں ہے کہ ابوالعاص قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ جمادی الاول ۶ھ میں روانہ ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہؓ کو ۱۷۰ سواروں کے ساتھ بھیجا، مقام عیص میں قافلہ ملا، کچھ لوگ گرفتار کیے گئے اور مال واسباب لوٹ میں آیا، ان ہی میں ابوالعاص تھے، ابوالعاص آئے تو حضرت زینبؓ نے ان کو پناہ دی اور ان کی سفارش سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مال بھی واپس کردیا،

ام ایمنؓ حضرت سودہؓ بنت زمعہ اور ام سلمہؓ نے غسل دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی،

ابو العاص اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر میں اتارا،

حضرت زینبؓ نے دو اولاد چھوڑی، امامہ اور علی، علی کی نسبت ایک روایت ہے کہ بچپن میں وفات پائی لیکن عام روایت یہ ہے کہ سن رشد کو پہنچے، ابن عساکر نے لکھا ہے کہ یرموک کے معرکہ میں شہادت پائی۔ امامہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبت تھی، آپ انکو اوقات نماز میں بھی جدا نہیں کرتے تھے صحاح میں ہے کہ آپ انکو کاندھے پر رکھ کر نماز پڑھتے تھے جب رکوع میں جاتے تو دوش مبارک سے اتار دیتے جب سجدے سے سر اٹھاتے تو پھر سوار کرا لیتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک مرتبہ کسی نے کچھ چیزیں ہدیے میں بھیجیں جنمیں ایک زریں ہار بھی تھا، امامہ ایک گوشہ میں کھیل رہی تھیں آپ نے فرمایا میں اسکو اپنے محبوب ترین اہل کو دوں گا، ازواج نے سمجھا کہ یہ شرف حضرت عائشہؓ کو حاصل ہو گا لیکن آپ نے امامہ کو بلا کر وہ ہار خود ان کے گلے میں ڈالدیا، ابو العاص نے حضرت زبیر بن عوامؓ کو امامہ کے نکاح کی وصیت کی تھی، حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہوا تو انھوں نے حضرت علیؓ سے انکا نکاح کر دیا حضرت علیؓ نے شہادت پائی تو مغیرہ کو وصیت کر گئے کہ امامہ سے نکاح کر لیں، مغیرہ نے نکاح کیا، اور ان سے ایک بچہ پیدا ہوا جسکا نام یحیٰی تھا لیکن بعض روایتوں میں ہے کہ امامہ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی، امامہ نے مغیرہ کے ہاں وفات پائی،

حضرت رقیہؓ

جرجانی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑکیوں میں سب سے چھوٹی تھیں لیکن مشہور روایت یہ ہے کہ حضرت زینبؓ کے بعد ۳۳ ؁ قبل نبوت میں پیدا ہوئیں، پہلے ابو لہب کے بیٹے عتبہ سے شادی ہوئی، ابن سعد نے لکھا ہے کہ یہ شادی قبل نبوت ہوئی تھی۔

Marfat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صاحبزادی ام کلثومؓ کی شادی بھی ابولہب کے دوسرے لڑکے عتیبہ سے ہوئی تھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپنے دعوت اسلام کا اظہار کیا، ابولہب نے بیٹوں کو جمع کر کے کہا اگر تم محمد کی بیٹیوں سے علیحدگی اختیار نہیں کرتے تو تمھارے ساتھ میرا سونا بیٹھنا حرام ہے۔ دونوں فرزندوں نے باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رقیہؓ کی شادی حضرت عثمانؓ سے کر دی۔

دولابی نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ انکا نکاح زمانۂ جاہلیت میں ہوا لیکن خود ایک روایت حضرت عثمانؓ سے مروی ہے، جسمیں زمانۂ اسلام کی تصریح ہے، نکاح کے بعد حضرت عثمانؓ نے حبش کی طرف ہجرت کی حضرت رقیہؓ بھی ساتھ گئیں، مدت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انکا کچھ حال معلوم نہ ہوا، ایک عورت نے آکر خبر دی کہ میں نے ان دونوں کو دیکھا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی اور فرمایا کہ ابراہیم اور لوط کے بعد عثمان پہلے شخص ہیں جنھوں نے بی بی کو لیکر ہجرت کی ہے۔

حبش میں حضرت رقیہؓ کے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام عبداللہ تھا لیکن صرف ۶ سال زندہ رہا حضرت عثمانؓ حبش سے مکہ کو واپس آئے اور وہاں سے مدینہ کی طرف ہجرت کی، حضرت رقیہؓ مدینہ میں آکر بیمار ہوئیں، یہ غزوۂ بدر کا زمانہ تھا حضرت عثمانؓ انکی تیمارداری کی وجہ سے شریک جہاد نہ ہو سکے عین اسی دن جس روز زید بن حارثہؓ نے مدینہ آکر فتح کا مژدہ سنایا، وفات پائی غزوۂ بدر کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جنازہ میں شریک نہ ہو سکے۔

حضرت ام کلثومؓ

کنیت ہی کے نام سے مشہور ہیں، ۳ھ میں جو غزوۂ بدر کا سال تھا، جب حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوا تو ربیع الاول میں حضرت عثمانؓ نے حضرت ام کلثومؓ کیساتھ نکاح کر لیا، بخاری میں ہے کہ جب

حضرت حفصہؓ بیوہ ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا، حضرت عثمانؓ نے تامل کیا لیکن دوسری روایتوں میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ہوئی تو آپ نے حضرت عمرؓ سے کہا میں تم کو عثمانؓ سے بہتر شخص کا پتہ دیتا ہوں، اور عثمانؓ کے لیے تم سے بہتر شخص ڈھونڈھتا ہوں تم اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کردو اور میں اپنی لڑکی کی شادی عثمانؓ سے کر دیتا ہوں" بہرحال نکاح ہوا، اور نکاح کے بعد حضرت ام کلثومؓ ۶ برس تک حضرت عثمانؓ کے ساتھ رہیں، شعبان ۹ھ میں انتقال کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت علیؓ، حضرت فضل بن عباسؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ نے قبر میں اتارا،

حضرت فاطمۃ الزہراؓ

فاطمہ نام، زہرا لقب، سن ولادت میں اختلاف ہے، ایک روایت ہے کہ ۱ بعثت میں پیدا ہوئیں، ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ ابراہیمؑ کے علاوہ آپ کی تمام اولاد قبل نبوت پیدا ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چالیس سال کی عمر میں ہوئی تھی، اس بنا پر بعضوں نے دونوں روایتوں میں تطبیق دی ہے کہ ابتدائے بعثت کے آغاز میں حضرت فاطمہؓ پیدا ہوئی ہوں گی اور چونکہ دونوں کی مدت میں بہت فاصلہ نہیں اسلیے یہ اختلاف روایت ہوگیا ہوگا، ابن جوزی نے لکھا ہے کہ بعثت سے پانچ برس پہلے جب خانہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی پیدا ہوئیں، بعض روایتوں میں ہے کہ نبوت سے تقریباً ایک سال بیشتر پیدا ہوئیں۔

حضرت فاطمہؓ (اگر ان کا سال ولادت ۱ بعثت صحیح تسلیم کر لیا جائے) جب پندرہ سال ساڑھے پانچ مہینے کی ہوئیں تو ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے ساتھ نکاح کر دیا، اس وقت حضرت علیؓ کا سن ۲۱ برس پانچ مہینے کا تھا[1]، حضرت فاطمہؓ سے عقد کی درخواست سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور

---

[1] حضرت علیؓ کے متعلق ایک روایت ہے کہ ۸ برس کی عمر میں اسلام لائے، اگلی تعیین اسی روایت کی بنا پر ہے، لیکن قول راجح یہ ہے کہ وہ دس سال کی عمر میں مشرف بہ اسلام ہوئے، اس روایت کی رو سے ان کا سن ۲۴ سال ڈیڑھ مہینہ کا تھا۔

Marfat.com

اور انکے بعد حضرت عمرؓ نے کی تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جواب نہیں دیا حضرت علیؓ نے خواہش کی تو آپ نے فرمایا تمھارے پاس مہر ادا کرنے کو کچھ ہے؟ بولے ایک گھوڑا اور زرہ کے سوا کچھ نہیں، آپ نے فرمایا گھوڑا تو لڑائی کیلئے ضروری ہے، زرہ فروخت کر ڈالو حضرت عثمانؓ نے ۴۸۰ درہم پر خریدی، اور حضرت علیؓ نے قیمت لاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈالدی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلالؓ کو حکم دیا کہ بازار سے خوشبو لائیں، عقد ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہیز میں ایک پلنگ اور ایک بستر دیا، اصابہ میں لکھا ہے کہ آپنے ایک چادر، دو چکیاں اور ایک مشک بھی دی، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہی دو چیزیں عمر بھر انکی رفیق رہیں،

نکاح کے بعد رسم عروسی کا وقت آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے کہا کہ ایک مکان لے لیں،

چنانچہ حارث بن النعمان کا مکان ملا، اور حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے ساتھ اس میں قیام کیا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے تعلقات میں خوشگواری پیدا کرنیکی کوشش فرماتے تھے، چنانچہ جب حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ میں کبھی کبھی خانگی معاملات کے متعلق رنجش ہو جاتی تھی، تو آنحضرتؐ دونوں میں صلح کرادیتے تھے، ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا، آپ گھر میں تشریف لے گئے اور صفائی کرادی، گھر سے مسرور نکلے، لوگوں نے پوچھا آپ گھر میں گئے تھے، تو اور حالت تھی، اب آپ اسقدر خوش کیوں ہیں، فرمایا میں نے ان دو شخصوں میں مصالحت کرادی جو مجکو محبوب تر ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے ان پر کچھ سختی کی، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لیکر چلیں، پیچھے پیچھے حضرت علیؓ بھی آئے، حضرت فاطمہؓ نے شکایت کی، آپنے فرمایا "بیٹی تم کو خود سمجھنا چاہیے کہ کون شوہر اپنی بی بی کے پاس خاموش چلا آتا ہے۔" حضرت علیؓ پر اس کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے حضرت فاطمہؓ سے کہا "اب میں تمھارے خلاف مزاج کوئی بات نہ کروں گا۔"

Marfat.com

(ایک دفعہ حضرت علیؓ نے ایک دوسرا نکاح کرنا چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے، آپ نے مسجد میں خطبہ دیا، اس میں اپنی ناراضی ظاہر کی، فرمایا "میری لڑکی میرا جگر گوشہ ہے جس سے اس کو دکھ پہنچے گا، مجھے بھی اذیت ہوگی"، چنانچہ حضرت علیؓ اس ارادہ سے باز آگئے، اور حضرت فاطمہؓ کی زندگی تک پھر کبھی دوسرا نکاح نہیں کیا۔[۱])

حضرت فاطمہؓ کے پانچ اولادیں ہوئیں حسنؓ حسینؓ محسنؓ، ام کلثومؓ، زینبؓ، محسنؓ نے بچپن ہی میں انتقال کیا حضرت زینبؓ، امام حسن، امام حسین علیہما السلام اور ام کلثوم اہم واقعات کے لحاظ سے تاریخ اسلام میں مشہور ہیں

حضرت فاطمہؓ نے رمضان ۱۱ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے ۶ ماہ بعد وفات پائی، اس وقت ان کا سن ۲۹ سال کا تھا سن کی تعیین میں سخت اختلاف ہے بعضوں نے ۲۴ سال بعضوں نے ۲۵ سال اور بعضوں نے ۳۰ سال بتایا ہے لیکن زرقانی نے لکھا ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے۔ اگر ۱ھ کو سال ولادت قرار دیا جائے تو اسوقت انکا سن نہیں ہوسکتا تھا، البتہ اگر ۲۴ سال کی عمر تسلیم کیجائے تو اس سن کو سال ولادت قرار دیا جاسکتا ہے لیکن اگر یہ روایت صحیح مان لیجائے کہ وہ ۵ برس قبل نبوت میں پیدا ہوئیں تو اسوقت انکا سن ۲۹ سال کا ہوسکتا ہے۔

حضرت ابراہیم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے آخری اولاد ہیں، ذی الحجہ ۸ھ میں مقام عالیہ جہاں ماریہ قبطیہؓ رہتی تھیں پیدا ہوئے، اس بنا پر لوگ عالیہ کو مشربۂ ابراہیم بھی کہنے لگے تھے، ابورافع کی بی بی سلمیٰ نے جو آنحضرت

[۱] صحیح بخاری ذکر اصہار النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۲ اس میں بھی اختلاف ہے بعضوں نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صرف تین دن زندہ رہیں، بعضوں نے چار مہینے بتایا ہے بعضوں کے نزدیک دو مہینے کے بعد انتقال ہوا کسی نے ایک مہینہ کسی نے تین مہینے بعد اور بعضوں نے مہینے ۵ دن بعد لکھا ہے لیکن صحاح میں حضرت عائشہؓ کے ذریعہ سے ۶ مہینے والی روایت مذکور ہے

Marfat.com

یا آپ کی پھوپھی صفیہ کی لونڈی تھیں، دایہ گیری کی خدمت انجام دی، ابو رافع نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انکی ولادت کا مژدہ سنایا تو آپ نے اس کے صلہ میں ایک غلام عطا فرمایا، ساتویں دن عقیقہ ہوا، آپ نے بال کے برابر چاندی خیرات کی، اور حضرت ابراہیم کے نام پر نام رکھا، دودھ پلانے کیلئے تمام انصار نے خواہش کی لیکن آپ نے ان کو ام بردہ خولہ بنت زید الانصاری کے حوالہ کیا اور اسکے معاوضہ میں کھجور کے چند درخت دیے، بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ نے یہ خدمت ام سیف کے متعلق کی، قاضی عیاض نے لکھا ہے کہ ام سیف اور ام بردہ ایک ہی ہیں، یہ تاویل کچھ مستبعد نہیں، لیکن ان کے شوہر کا نام براء بن اوس بتایا جاتا ہے، اور وہ ابو سیف کی کنیت کے ساتھ مشہور نہیں۔

ام سیف عوالی مدینہ میں رہتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرط محبت سے وہاں جاتے حضرت ابراہیمؓ کو گود میں لیتے اور چومتے، ام سیف کے شوہر لوہار تھے، اس لیے گھر دھوئیں سے بھرا رہتا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود نظافتِ طبع گوارا فرماتے۔

ابراہیم نے ام سیف ہی کے یہاں انتقال کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے ساتھ تشریف لائے، نزع کی حالت تھی گود میں اٹھا لیا، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا یا رسول اللہ آپ کی یہ حالت ہے، آپ نے فرمایا یہ رحمت ہے۔

عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے تو چاند میں گہن لگ جاتا ہے، اتفاق سے جس روز حضرت ابراہیم نے وفات پائی، سورج میں گہن لگ گیا تھا، عام طور پر مشہور ہو گیا کہ یہ ان کی موت کا اثر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو فرمایا "چاند اور سورج خدا کی نشانیاں ہیں، کسی کی موت سے ان میں گہن نہیں لگتا۔"

Marfat.com

چھوٹی سی چارپائی پر جنازہ اٹھایا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نماز جنازہ پڑھائی، عثمانؓ بن مظعون کی قبر کے متصل دفن ہوئے، قبر میں فضل بن عباسؓ اور اسامہؓ نے اتارا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے کنارے کھڑے تھے، قبر پر پانی چھڑکا گیا اور اس پر ایک امتیازی علامت قائم کی گئی،

ابوداؤد اور بیہقی کی روایت کے موافق دو مہینے دس دن کی عمر پائی، ذیحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے تھے، اس روایت کی بنا پر ۱۰ھ میں انتقال ہوا. واقدی کے نزدیک ماہ ربیع الاول ۱۰ھ میں وفات کی، اس لحاظ سے تقریباً پندرہ مہینے زندہ رہے بعض روایتوں میں ہے کہ ۱۶ مہینے آٹھ دن کی عمر پائی بعض لوگوں نے مدت حیات ایک برس دس ماہ چھ دن لکھی ہے، لیکن صحاح میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ابراہیم ۱۷ یا ۱۸ مہینے تک زندہ رہے۔

Marfat.com

ازواج مطہراتؓ کے ساتھ معاشرت

ازواج مطہرات کی تعداد ۹ تک پہنچی تھی، ان میں عام اصول فطرت کے موافق ہر مزاج اور ہر طبیعت کی عورتیں تھیں، باہم رشک اور منافست بھی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ہمیشہ فقر وفاقہ سے بسر کرتے تھے، انکو خورد ونوش کا انتظام بھی خاطر خواہ نہیں ہو سکتا تھا، اسلیے ان کو شکایت کا موقع ملتا تھا، ان تمام حالات کے ساتھ آپ کی جبین خلق پر کبھی شکن نہیں پڑتی تھی،

حضرت خدیجہؓ کے ساتھ آپ کو بے انتہا محبت تھی، جب وہ عقد نکاح میں آئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ریعان شباب اور ان کا بڑھاپا تھا، تاہم آپ نے ان کی وفات تک کوئی شادی نہیں کی، وفات کے بعد بھی جب کبھی ان کا ذکر آجاتا تو جوش محبت سے بے بیتاب ہو جاتے تھے (تفصیل اوپر گذر چکی ہے)

حضرت خدیجہؓ کے بعد حضرت عائشہؓ ازواج مطہرات میں سب سے محبوب تر تھیں لیکن محبت کے اسباب وہ نہ تھے جو عام انسانوں میں پائے جاتے ہیں حسن صورت میں حضرت صفیہؓ ان سے بڑھکر تھیں اور کمسن بھی تھیں، دیگر ظاہری محاسن میں بھی دیگر ازواج ان سے کم نہ تھیں لیکن حضرت عائشہؓ کی طبیعت کی فہانت، قوتِ اجتہاد، دقتِ نظر، وسعتِ معلومات ایسے اوصاف تھے، جو ان کی ترجیح کا اصلی سبب تھے،

ایک دفعہ چند ازواج مطہرات نے حضرت فاطمہ زہرؓا کو سفیر بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، جناب سیدہؓ خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، دستور کے موافق پہلے اذن طلب کیا، اجازت ملی تو سامنے آئیں

Marfat.com

اور عرض کی کہ ازواج مطہرات نے مجکو وکیل بنا کر بھیجا ہے کہ آپ ابوبکر کی بیٹی کو ہم پر کیوں ترجیح دیتے ہیں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جان پدر! کیا تم اس کو نہیں چاہتیں جس کو میں چاہتا ہوں" جناب سیدہ کے لیے اتنا کافی تھا. واپس جا کر ازواج مطہرات سے کہا میں اس معاملہ میں دخل نہ دونگی۔

اب اس خدمت (سفارت) کے لیے حضرت زینبؓ انتخاب کی گئیں کیونکہ ازواج میں سے حضرت زینبؓ کو خصوصیت کے ساتھ حضرت عائشہؓ کی ہمسری کا دعویٰ تھا، اس لیے وہی اس خدمت کے لیے زیادہ موزوں تھیں، انھوں نے یہ پیغام بڑی دلیری سے ادا کیا، اور بڑے زور کے ساتھ یہ ثابت کرنا چاہا کہ حضرت عائشہؓ اس رتبہ کی مستحق نہیں ہیں، حضرت عائشہؓ چپ سن رہی تھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کی طرف دیکھتی جاتی تھیں، حضرت زینبؓ جب تقریر کر چکیں تو وہ اٹھ کر کھڑی ہوئیں اور اس زور شور کے ساتھ تقریر کی کہ حضرت زینبؓ لاجواب ہو کر رہ گئیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیوں نہ ہو ابوبکر کی بیٹی ہے۔"[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شادی کرنے کے لیے عورت کا انتخاب چار اوصاف کی بنا پر ہوسکتا ہے، مال، نسب، حسن، دینداری، تم دیندار عورت تلاش کرو،[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر کام میں سب سے مقدم جو چیز پیش نظر ہوتی تھی، وہ دین ہوتا تھا، اس لیے ازواج میں بھی وہی زیادہ منظور نظر ہوتی تھیں جن سے دین کی خدمت زیادہ ادا ہوسکتی تھی، ازواج مطہرات کو باریابی کا زیادہ موقع ملتا تھا. وہ خلوت و جلوت کی شریک صحبت تھیں. اس لیے مذہبی احکام و مسائل کے علم [illegible]

[1] یہ واقعہ پوری تفصیل کیساتھ بخاری اور دیگر احادیث کی کتابوں میں ہے، الفاظ [illegible] اور ایک دوسرے کی کسر شان کی تھی، جیسا کہ عام طور پر سوکنوں میں باہم ہوا کرتا ہے [illegible] اپنی ترجیح کی وہ مسکت دلیلیں بیان کی ہونگی جنکا جواب سکوت کے سوا کچھ نہ ہوسکتا ہوگا۔ [2] کتب [illegible]

مل سکتا تھا لیکن ساتھ ہی اس کی ضرورت تھی کہ مسائل کے سمجھنے اور نکاتِ شریعت کی تہ تک پہنچنے کی قابلیت جس قدر زیادہ ہوتی اسی قدر زیادہ تمتع اٹھا سکتا تھا۔

حضرت عائشہؓ مجتہدانہ دل و دماغ رکھتی تھیں، اس لیے قربِ صحبت سے اسقدر فائدہ اٹھا سکیں کہ بڑے بڑے نازک اور دقیق مسائل میں وہ اکابرِ صحابہ سے مخالفت کرتی تھیں اور انصاف بالائے طاعت است اکثر مسئلوں میں انکی فہم و دقتِ نظر کا پلہ بھاری نظر آتا ہی، چنانچہ اس کی کسی قدر تفصیل حضرت عائشہؓ کے حالات میں گذر چکی ہے۔

معمول تھا کہ ہر روز آپ تمام ازواجِ مطہرات کے گھروں میں (جو پاس پاس تھے) تشریف لیجاتے، ایک ایک کے پاس تھوڑی تھوڑی دیر ٹھہرتے جب انکا گھر آجاتا جنکی باری ہوتی تو شب کو وہیں قیام فرماتے، یہ ابوداؤد کی روایت ہی، زرقانی میں حضرت ام سلمہؓ کے حال میں لکھا ہی کہ عصر کا وقت ہوتا تھا اور ابتدا حضرت ام سلمہؓ سے ہوتی تھی بعض روایتوں میں ہی کہ جنکی باری ہوتی تھی ان ہی کے گھر پر تمام ازواجِ مطہرات آجاتی تھیں، اور دیر تک صحبت رہتی تھی، کچھ رات گئے سب رخصت ہو جاتی تھیں، اس سے ظاہر ہوگا کہ گو ازواج میں کبھی کبھی منافست کا اظہار ہوتا تھا، لیکن دل صاف تھے۔ اور باہم مل کر لطفِ صحبت اٹھاتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرفِ صحبت نے جس طرح ان آئینوں کو جلا دی تھی، اسکا اندازہ افک کے واقعہ ہوسکتا ہی جسمیں جنابِ عائشہؓ کو منافقین نے متہم کیا تھا، اس سے بڑھکر حریفوں کے لیے انتقام کا کیا موقع مل سکتا تھا لیکن باوجود اس کے کہ غیر متعلق لوگ تہمت لگانے میں آلودہ ہوگئے تھے، تاہم ازواجِ مطہرات کا دامن صاف رہا، حضرت عائشہؓ کی بڑی حریف حضرت زینبؓ تھیں لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے استفسار فرمایا تو انھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھا کہ واللہ محض تہمت ہے۔

Marfat.com

حضرت عائشہؓ جب واقعۂ افک کا ذکر کرتی تھیں تو ہمیشہ حضرت زینبؓ کی پاک باطنی کی شکر گذاری ظاہر کرتی تھیں، چنانچہ بخاری کی متعدد روایتوں میں تفصیلاً مذکور ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح ازواجِ مطہرات کی خاطرداری فرماتے اور انکی نازک مزاجیاں برداشت کرتے تھے، اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہوگا،

ایک بار ازواجِ مطہرات سفر میں تھیں، ساربان اونٹ کو تیز ہانکنے لگے، آپ نے فرمایا:
"دیکھنا یہ آبگینے (شیشے) ہیں۔"

حضرت صفیہؓ کھانا بہت عمدہ پکاتی تھیں، ایک دن انھوں نے کھانا پکا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، آپ اس وقت حضرت عائشہؓ کے گھر میں تشریف رکھتے تھے، حضرت عائشہؓ نے خادم کے ہاتھ سے پیالہ چھینکر زمین پر دے مارا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالے کے ٹکڑے چن چن کر یکجا کیے اور انکو جوڑا، پھر دوسرا پیالہ منگوا کر واپس کیا۔[1]

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے برہم ہوکر بلند آواز سے باتیں کر رہی تھیں، اتفاقاً حضرت ابوبکرؓ آگئے، حضرت عائشہؓ کو پکڑ کر تھپڑ مارنا چاہا کہ تو رسول اللہ سے چلا کر بولتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیچ میں آگئے اور حضرت عائشہؓ کو بچا لیا، حضرت ابوبکرؓ غصہ میں بھرے ہوئے باہر چلے گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے کہا کیوں کس طرح تم کو بچا لیا، چند روز کے بعد حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو وہ حالت بدل چکی تھی، بولے کہ مجکو بھی صلح میں شریک کیجئے جیسا کہ اس موقع پر میں نے جنگ میں شرکت کی تھی، آپ نے فرمایا ہاں اور ہاں۔[2]

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ تو مجھ سے جب ناراض ہوتی ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں

---

[1] بخاری میں یہ روایت کتاب النکاح کے ذیل میں ہے لیکن ازواج کے نام نہیں، نسائی میں نام کی تصریح ہے (کتاب عشرۃ النساء باب الغیرۃ)
[2] ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی المزاح

بولیں کیونکر؟ ارشاد ہوا جب تو خوش رہتی ہے (اور کسی بات پر قسم کھانی ہوتی ہے تو یوں قسم کھاتی ہے۔ محمد کے خدا کی قسم" اور جب ناراض ہو جاتی ہے تو کہتی ہے" ابراہیم کے خدا کی قسم" حضرت عائشہؓ نے کہا "ہاں یا رسول اللہ میں صرف آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں۔"[1]

حضرت عائشہؓ شادی کے وقت بہت کمسن تھیں اور لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتفاقاً آجاتے تو لڑکیاں بھاگ جاتیں، آپ انکو بلا کر حضرت عائشہؓ کے پاس بھیجدیا کرتے۔[2]

حبشی ایک چھوٹا سا نیزہ رکھتے ہیں جسکو حراب کہتے ہیں، اور جس طرح ہمارے ملک میں پٹہ ہلاتے ہیں حبشی اس سے کھیلتے ہیں، ایک دفعہ عید کے دن حبشی یہ تماشا دکھا رہے تھے حضرت عائشہؓ نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے کھڑے ہو گئے حضرت عائشہؓ دوش مبارک پر رخسارے رکھ کر تماشا دیکھنے لگیں اور دیر تک دیکھتی رہیں، یہانتک کہ آپ نے فرمایا کیوں ابھی تک تم سیر نہیں ہوئیں، بولیں نہیں، آپ چپ رہے، یہانتک کہ خود تھک کر ہٹ گئیں۔

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ گڑیوں سے کھیل رہی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر سے تشریف لائے، گڑیوں میں ایک گھوڑا بھی تھا جس کے پر لگے تھے، آپ نے فرمایا کیا ہے، بولیں کہ حضرت سلیمانؑ کے گھوڑوں کے پر تھے، آپ نے تبسم فرمایا[3]، عوام میں مشہور ہے کہ پہلے گھوڑوں کے پر ہوتے تھے حضرت سلیمانؑ نے اس بنا پر کہ گھوڑوں کی سیر میں ان کی نماز قضا ہو گئی تھی، پر کٹوا دیئے، اس وقت سے پر جاتے رہے، لیکن نشان اب بھی باقی ہے حضرت عائشہؓ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

ایک دفعہ آپ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ "آؤ تیز قدمی میں مقابلہ کریں" حضرت عائشہؓ اس وقت تک

---

[1] صحیح مسلم [2] ایضاً [3] ابو داؤد کتاب الادب

Marfat.com

دبلی پتلی تھیں، آگے نکل گئیں، جب سن زیادہ ہوا، اور پُر اندام ہوگئیں تو پھر مسابقت کی نوبت آئی، اب کی وہ پیچھے رہ گئیں، آپ نے فرمایا، اس دن کا جواب ہے۔[1]

ازواج مطہرات اور اہل و عیال کی سادہ زندگی

انسان بذاتِ خود فاقہ کشی کرسکتا ہے، سخت سے سخت تکلیفیں اٹھا سکتا ہے، زخارفِ دنیوی کو کلیۃً چھوڑ سکتا ہے، لیکن وہ اپنے اعزہ و اقربا بالخصوص عزیز ترین اولاد کو اس قسم کی سادہ اور متقشفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جن لوگوں نے راہبانہ زندگی بسر کی ہے، انھوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ اہل و عیال کے جھگڑوں سے الگ رکھا ہے، دنیا کی مذہبی تاریخ میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس کلیہ کی ایک مستثنیٰ مثال ہے، آپ کے ۹ بیبیاں تھیں، جن میں بعض ناز و نعمت میں پلی تھیں، اکثر معزز گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں، اس لیے ان کا قدرتی میلان غذاہائے لطیف اور لباس ہائے فاخرہ کی طرف ہو سکتا تھا، متعدد صغیر السن بچے تھے جنکو کھانے پہننے کی ہر خوشگوار اور خوشنما چیز اپنی طرف مائل کرسکتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا کہ اوپر کے واقعات سے معلوم ہوا ہوگا، اعزہ، اولاد اور ازواجِ مطہرات کے ساتھ سخت محبت تھی، آپ نے رہبانیت کا بھی قلع قمع کر دیا تھا، اور فتوحات کی کثرت مدینہ میں مال و زر کے خزانے لٹا رہی تھی، لیکن باایں ہمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کی طرح انکو تکلفاتِ دنیوی کا خوگر نہیں بنایا، بلکہ ہر موقع پر ترک کی تلقین کی، اس بنا پر آپکے تمام خاندان کی زندگی آپکے اسوۂ حسنہ کا اعلیٰ ترین مظہر بن گئی۔

حضرت فاطمہؓ آپ کی محبوب ترین اولاد تھیں، لیکن انھوں نے آپکی محبت سے کوئی دنیوی فائدہ نہیں اٹھایا، انکی عام خانگی زندگی یہ تھی کہ اسقدر چکی پیستی تھیں کہ ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے، بار بار مشک میں پانی بھر بھر لانے سے سینے پر گٹھے پڑ گئے تھے، گھر میں جھاڑو دیتے دیتے کپڑے چکٹ ہو جاتے تھے، چولھے کے پاس بیٹھتے بیٹھتے کپڑے دھوئیں سے سیاہ ہو جاتے تھے،[2]

[1] ابوداؤد ص ۱۵۳ [2] ایضاً

لیکن باایں ہمہ جب انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار گھر کے کاروبار کے لیے ایک لونڈی مانگی اور ہاتھ کے چھالے دکھائے تو آپ نے صاف انکار کردیا کہ یہ فقرا، و یتامی کا حق ہے،

ایک دفعہ حضرت فاطمہؓ کے پاس آئے، دیکھا کہ انھوں نے ناداری سے اس قدر چھوٹا دوپٹہ اوڑھا ہے کہ سر ڈھانکتی ہیں تو پاؤں کھل جاتے ہیں، اور پاؤں چھپاتی ہیں تو سر برہنہ رہ جاتا ہے[1]،

صرف یہی نہیں کہ خود عام طریقۂ اظہار محبت کے خلاف ان کو آرائش یا زیب و زینت کی کوئی چیز نہیں دیتے تھے، بلکہ اس قسم کی جو چیزیں ان کو دوسرے ذرائع سے ملتی تھیں، ان کو بھی ناپسند فرماتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے ان کو سونے کا ایک ہار دیا، آپ کو معلوم ہوا تو فرمایا کیوں فاطمہ! کیا لوگوں سے یہ کہلوانا چاہتی ہو کہ رسول اللہ کی لڑکی آگ کا ہار پہنتی ہے، چنانچہ حضرت فاطمہؓ نے اس کو فوراً بیچکر اس کی قیمت سے ایک غلام خرید لیا[2]،

ایک دفعہ آپ کسی غزوہ سے تشریف لائے، حضرت فاطمہؓ نے بطور خیر مقدم کے گھر کے دروازہ پر پردہ لگایا، اور امام حسن و امام حسین علیہما السلام کو چاندی کے کنگن پہنائے، آپ حسب معمول حضرت فاطمہؓ کے یہاں آئے تو اس دنیوی ساز و سامان کو دیکھ کر واپس گئے، حضرت فاطمہ کو آپ کی ناپسندیدگی کا حال معلوم ہوا تو پردہ چاک کردیا اور بچوں کے ہاتھ سے کنگن نکال ڈالے، بچے آپ کی خدمت میں روتے ہوئے آئے، آپ نے فرمایا "یہ میرے اہلبیت ہیں، میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ ان زخارف دنیا سے آلودہ ہوں، اس کے بدلے فاطمہ کے لیے ایک عصب کا ہار اور ہاتھی دانت کے دو کنگن خرید لاؤ"[3]،

ازواج مطہرات کے ساتھ آپ کو جو محبت تھی، اس کا اظہار بھی دنیا دارانہ طریقہ سے نہیں

---

[1] ابوداؤد [2][3] نسائی کتاب الزینۃ

Marfat.com

ہوتا تھا، چنانچہ ازواجِ مطہرات نے جب اچھے کھانے اور اچھے لباس کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے ان سے ایلاء کرلیا،

تمام ازواج میں آپ کو حضرت عائشہؓ سب سے زیادہ محبوب تھیں لیکن یہ محبت رنگین لباسوں اور سنہرے زیوروں کی صورت میں کبھی نہیں ظاہر ہوئی، تمام بی بیوں کا جو لباس تھا وہی حضرت عائشہؓ کا تھا، چنانچہ وہ خود فرماتی ہیں:

ماکانت لاحدنا الا ثوب واحد — ہم تمام بی بیوں کے پاس صرف ایک ایک جوڑا کپڑا تھا۔ (بخاری جلد اول ص ۵۴)

اگر کبھی اس کے خلاف ان کے بدن پر دنیوی آرایش کے سروسامان نظر آتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو منع فرماتے، ایک مرتبہ انھوں نے سونے کے کنگن پہنے (مسکۃ) آپ نے فرمایا اگر ورس کے کنگن زعفران سے رنگ کر پہنتیں تو بہتر ہوتا۔"

(تمام اہل وعیال و خانوادۂ نبوت کو ممانعت تھی کہ وہ پر تکلف وریشمی لباس اور سونے کے زیور استعمال کریں، آپ ان سے فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم کو اس کی تمنا ہے کہ یہ چیزیں جنت میں ملیں تو دنیا میں ان کے پہننے سے پرہیز کرو۔"[1]

انتظامِ خانگی اگرچہ ازواجِ مطہرات کی تعداد ایک زمانہ میں ۹ تک پہنچ گئی تھی، اور اس وجہ سے خانہ داری کے بہت سے بکھیڑے تھے، تاہم آپ کو خود بہ نفسِ نفیس ان چیزوں سے سروکار نہ تھا، اپنی ذات کی نسبت تو التزام تھا کہ جو کچھ آتا اُسی دن صرف ہو جاتا، یہاں تک کہ اگر دے دلا کر کچھ باقی رہ جاتا تو آپ اُس وقت تک گھر میں نہ جاتے، جب تک وہ بھی کارِ خیر میں صرف نہ ہو جاتا لیکن ازواجِ مطہرات

Marfat.com

اور مہمانوں کے کھانے پینے، رہنے سہنے کا انتظام حضرت بلالؓ کے متعلق تھا، ابوداؤد میں عبداللہ ہوزنی سے روایت ہے کہ میں نے حضرت بلالؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خانگی انتظام کا کیا حال تھا؟ انھوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام کاروبار میرے سپرد تھا، اور آغاز سے اخیر زمانۂ نبوت تک میرے ہاتھ میں رہا، معمول تھا کہ جب کوئی نادار مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو مجھکو ارشاد ہوتا، میں جاکر کہیں سے قرض لاتا اور اس کے کھانے کپڑے کا انتظام کر دیتا،[1]

اہل وعیال کے مصارف کا انتظام

ازواج مطہرات کے لیے یہ انتظام تھا کہ بنو نضیر کے نخلستان میں ان کا حصہ مقرر کر دیا گیا تھا، وہ فروخت کر دیا جاتا جو سال بھر کے مصارف کے لیے کافی ہوتا،[2] خیبر فتح ہوا تو ازواج کے لیے فی کس ۸۰ وسق کھجور اور ۲۰ وسق جو سالانہ مقرر ہو گیا، وسق ۶۰ صاع کا ہوتا ہے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بعض ازواج نے جن میں حضرت عائشہؓ بھی تھیں پیداوار کے بدلے میں زمین لے لی،[3]

---

[1] جلد دوم باب فی الامام یقبل ہدایا المشرکین [2] بخاری ص ۸۰۶ [3] بخاری کتاب المزارعۃ جلد اول ص ۳۱۳

تم المجلد الثانی من السیرة النبویة علی صاحبها الصلوة والتحیة

Marfat.com